اخبار
مخبر عالم
مراد آباد
اور
تحریک آزادی
اسرار صابری

اخبار

مخبر عالم

مراد آباد

اور

تحریکِ آزادی

امداد صابری

نام کتاب ـــــــ اخبار مخبر عالم مراد آباد اور تحریک آزادی
نام مصنف ـــــــ امداد صابری
ناشر ـــــــ حیدر جمیل رضوی
مطبع ـــــــ شالیمار گرافکس، ۵۱ - سی، بارہویں کمرشل اسٹریٹ
فیز II ایکسٹینشن - ڈیفنس سوسائٹی - کراچی
فون نمبر ۵۸۹۶۲۹۴
سن طباعت ـــــــ ۱۹۹۹ء
قیمت ـــــــ ایک سو چالیس روپیہ

تعداد ـــــــ ایک ہزار

پاکستان میں ملنے کا پتہ
عبدالاحد، ڈبلیو ۵۵، بلاک ۶، پی، ای، سی، ایچ، ایس - کراچی نمبر ۲۹
رہائشی فون ۴۵۴۵۴۳۶

باسمہٖ سبحانہ

کتاب "اخبار مخبرِ عالم مراد آباد اور تحریکِ آزادی"

کتابت و طباعت کی اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳	۱۱	ادا نہ کرنا	ادا کرنا
۱۴	۸	تراحم	ترحم
۱۸	۴	ضرورتوں	ضرورت
"	۶	اپنے	اپنی
۳۲	۸	کام نہیں کرتی ہیں	کان کے اندر کام نہیں کرتی ہیں
۴۵	۱	اصراف	اسراف
۱۰۵	۱۴	بے ریشہ	بے ریش
۱۲۶	۱	رہی	وہی
۱۵۸	۴	خوش گزرں	خوش گزراں
۱۵۹	۵	مرات العروس	مراۃ العروس
۱۵۹	۷	قبارح	قبائح
۱۶۸	۱۴	جرمنی	جرمن
۱۶۸	۱۸	اطالی	اطالوی
۱۷۰	۱۴	نعمانی	نعمان
۱۷۰	۱۰	بیت العلوم	دارالعلوم
۱۸۱	۶	مصاحب	مصاحبین
۱۹۰	شجرۂ نسب	قاضی القاضات	قاضی القضاۃ
۱۹۱	۳	ختم خانہ	ختم خانۂ
۱۹۱	۵	قاضی القضات	قاضی القضاۃ
۲۰۹	۵	العظمت للہ	العظمۃ للہ
۲۰۹	۸	بنیات	بیّنات
۲۲۰	۴ (نیچے سے)	بتاؤں	بتاؤ
۲۲۵	۱۴	تسبیح و تحلیل	تسبیح و تہلیل
۲۵۶	۵	نارِ جہیم	نارِ جحیم

کتاب "اخبار مخبرِ عالم اور تحریکِ آزادی" آج سے تقریباً ایک صدی قبل کے ایک اخبار کی ایک مختصر داستان ہے۔ جون ۱۹۰۳ء میں مرادآباد، انڈیا سے جاری ہونے والا یہ اخبار پورے ۹۷ سال بعد آج بھی مرادآباد سے شائع ہوتا ہے، اگرچہ حالات اور فائدہ عام کے تحت اس کی زبان اب ہندی ہے۔ برِّصغیر میں شاید ہی کوئی دوسرا اخبار اس کا ہم عمر ہو۔ تقسیمِ ہند سے قبل اور اس کے بعد بھی جاری ہونے والے بہت سے اخبار کب کے مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان میں احسان، زمیندار، انقلاب، تیج، منشور، انجام وغیرہ کے نام سرِفہرست ہیں۔ لیکن مخبرِ عالم اب تک زندہ ہے، اس کی یہ "سخت جانی" اس کے اوّلین مالک و ایڈیٹر میرے محترم دوست حیدر جمیل رضوی صاحب کے دادا قاضی عبدالعلی عابد صاحب مرحوم کی نیک نیتی اور اخلاص کا کرشمہ ہے۔

کتاب کے نام سے اس کے مندرجات اور افادی پہلوؤں کا اندازہ نہیں ہوتا کیونکہ اخبار مخبرِ عالم کے جو مضامین اس میں نقل کئے گئے ہیں یا اس سے جو اقتباسات لئے گئے ہیں اُن کا تعلق صرف تحریکِ آزادی سے نہیں، بلکہ یہ بیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں کی ایک دینی، علمی، ادبی اور سیاسی و تعلیمی تاریخ ہے۔ کتاب کے ابواب نمبر ۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس میں جہاں اربابِ صحافت کے لئے گراں قدر سرمایہ ہے وہیں علم و ادب اور دینی و تعلیمی تحریکات کے شائقین کے لئے بڑی نادر معلومات ہیں۔ کتاب کے دو ابواب "حریت پرور، اور طنزیہ کلام" اور "علمی، ادبی اور فنی شخصیات" اس کی نمایاں مثالیں ہیں، اور سیاسی طنزیہ نظم "لارڈ کرزن سے جھپٹ" تو ایک نادر ادبی شہ پارہ ہے، اِس طرح مولانا رفیقی، جناب اشہری، شریمتی مالان دیوی اور ایک غیر مشہور شاعرہ و مغنیہ مشتری جان کے حالات شاید ہی تحریری صورت میں کہیں اور دستیاب ہو سکیں۔ یہ کتاب یقیناً اِس لائق ہے کہ اسے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر سیّد رضوان علی ندوی

مولانا امداد صابری نے اُردو صحافت کی تاریخ مرتب کرکے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بنیادی نوعیت کا ہے، اور بے مثال ہے، اُن سے پہلے اور اُن کے بعد بھی کسی نے اتنے بڑے پیمانے پر بے شمار اخبارات و جرائد کے بارے میں ایسی نادر معلومات فراہم نہیں کیں۔ ان سے اُردو صحافت کی تاریخ پر کام کرنے والا کوئی شخص بے نیاز نہیں رہ سکتا اور وہ اگر ایسا کرے گا تو موضوع کا حق ادا نہ کر سکے گا۔

اُردو صحافت کی تاریخ مرتب کرنے کے دوران مولانا صابری نے ایسا لوازمہ بھی جمع کیا جو کئی مستقل تصانیف کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔ ایسی ہی ایک تصنیف زیرِ نظر کتاب ہے جو مولانا کا آخری علمی کام ہے اور اُن کی وفات کے تقریباً گیارہ برسوں بعد پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

"مخبرِ عالم" مرادآباد (تاریخ اجراء: ۸، جون ۱۹۰۳ء) اردو کے اہم ترین اخباروں میں سے ہے۔ اس نے اُردو صحافت کو جو وقار دیا اور جس طرح برِّصغیر کی تحریکِ آزادی میں حصّہ لیا، وہ ہماری تاریخِ صحافت ہی کا نہیں، تاریخِ آزادی کا بھی ایک روشن باب ہے، یہ بظاہر حکومت کا مخالف اخبار نہیں تھا اور اس زمانے میں کھلّم کھلاّ مخالفت ممکن بھی نہیں تھی۔ لیکن اس اخبار میں مضامین اور خبروں کی اشاعت میں حریت پسند تحریکوں سے ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا جاتا تھا تاکہ اخبار بھی بند نہ ہو اور تحریکِ آزادی کو بھی تقویت ملتی رہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اسی اخبار کے حوالے سے تحریکِ آزادی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ایسی تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے جو تحریکِ آزادی کی تاریخ مرتب کرنے میں بہت کام آسکتی ہیں۔ یہی نہیں ۱۹۰۳ء کے بعد کے دس برسوں میں علمی، ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور سماجی مسائل سے متعلق بعض اہم اظہاریے بھی جمع کر دیئے گئے ہیں۔ نیز اس دور کی متعدد اہم شخصیات کے سوانحی کوائف اور خدمات پر مشتمل مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب نادر معلومات کا خزانہ ہے۔ اس مفید کتاب کی اشاعت کیلئے حیدر جمیل رضوی صاحب کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

مشفق خواجہ

مخبرِ عالم، اخبارِ عالم

مولانا امداد صابری سے میرا پہلا تعارف "تاریخ جرم و سزا" کے ذریعے ہُوا۔ اُن دنوں میری عمر بہت کم تھی اور میں مسلم انٹر کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ اور اب اُن کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کی افسوسناک خبر "مخبرِ عالم مراد آباد اور تحریکِ آزادی" کے ذریعے ملی جو اِن کی آخری تاریخی تحقیقی کاوش کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ ان دونوں کتابوں کے درمیان مولانا کی کتنی ہی اور تصنیفات اور تحقیقی مقالات سے استفادہ کیا۔ ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے لیکن مجھ جیسے طالب علم کیلئے (جو ابھی تک طالبِ علم میں سرگرداں ہے) مولانا امداد صابری کی ذات تحقیق و جستجو کے ایک روشن منارہ کی طرح رہی ہے۔ میں مولانا کا شمار اپنے اُن نادیدہ اساتذہ میں کرتا ہوں جن سے بالواسطہ تحصیلِ علم کی ہے، اور اس کا سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔

مولانا کی ذاتِ گرامی کے بارے میں یہ خراجِ عقیدت درحقیقت تمہید ہے "مخبرِ عالم" کے تذکرے کی جانب رجوع کرنے کا۔ "مخبرِ عالم" سے میرا تعارف مولانا امداد صابری کی واقفیت سے کہیں زیادہ پُرانا ہے۔ جب ہوش سنبھالا تو گھر میں والد ماجد، دادا، پردادا اور ان کے بھی بزرگوں کی جمع کی ہوئی کتابوں کے علاوہ "مخبرِ عالم" کے فائل بھی تھے اُن دنوں اخباروں کے فائل مجلد نہیں بلکہ بستوں میں بندھے ہوتے تھے جب اردو کی شُدبُد حاصل ہو گئی تو گھر میں موجود کتابوں پر دست درازی (دست درازی اس لئے کہ گھر کے بڑے یہی کہتے تھے کہ یہ کتابیں تمہارے اوسط سے زیادہ ہیں وغیرہ) کا آغاز ہُوا۔ اور ایک دن مخبرِ عالم کا بستہ کُھل گیا۔ مخبرِ عالم ویسے بھی خریدا جاتا تھا چونکہ مقامی اخباروں میں اس اخبار کو سب سے زیادہ عزّت و احترام حاصل تھا۔ اب میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا امداد صابری نے اپنی اس آخری تحقیق میں "مخبرِ عالم" کی جن خدمات کا تذکرہ کیا ہے، اُن دنوں میں ان حقائق سے آشنا نہ تھا اور اخباروں میں میری نظریں عجیب و غریب واقعات تلاش کرتی رہتی تھیں۔ اب جو اس تحقیق سے واقفیت ہوئی تو آنکھیں کُھل گئیں اور اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے بچپن میں مخبرِ عالم کی جو عزّت و تکریم کی جاتی تھی، وہ بے جا نہ تھی۔ ان دنوں ہمارے ہاں مدینہ، جمعیت، تیج، ملاپ، پرتاب، جنگ، منشور، قومی آواز اور انگریزی اخباروں میں ڈان، امرت بازار پتریکا اور ایسے ہی دوسرے اخباروں کے ساتھ ساتھ مقامی اخباروں میں مخبرِ عالم کے علاوہ "پبلک" (جو کبھی مسلم لیگ کے نام سے شائع ہوتا تھا اور جس کے بانی و مدیر ہمارے چچا اسحٰق بیگ صاحب تھے) وغیرہ بھی آتے تھے اور اس طرح ہمارا (میں میرے بھائی بہن) سارا وقت پڑھنے لکھنے میں ہی گذر جاتا تھا۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کے پس منظر میں جب میں نے مخبر عالم اور تحریک آزادی کا مطالعہ کیا تو آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے... اور کیوں نہ بہتے۔ اس نام نے ہی بچپن کی یادیں تازہ کر دیں کتنے ہی بزرگوں کے نام یادداشت، مراد آباد کی فضائیں، منظروں میں گھوم گئیں اور یہ احساس ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے وقت اور ماحول کے مطابق برصغیر کی نجات اور سربلندی کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔

میں محترم سید حیدر جمیل رضوی کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے اس حقیر کو یاد رکھا اور مولانا کی یہ تصنیف مجھے عنایت فرمائی۔

عبید اللہ بیگ

برصغیر میں باقاعدہ صحافت کا آغاز برطانوی تسلط کے بعد ہوا جب انگریزی مشنریوں نے یہاں پر چھاپہ خانہ قائم کئے جس سے اشاعت کا کام آسان ہو گیا۔ اخبار مخبر عالم کی اشاعت کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا، اس وقت انگریزی اقتدار کا سورج اپنے نصف النہار پر تھا۔ آزادی کی تحریکیں اس وقت اپنے ابتدائی دور میں تھیں اور ان میں اتنی شدت نہیں آئی تھی جو بعد کے سالوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ انگریزی تسلط کے خلاف اس ابتدائی دور میں اس وقت کے اردو اخبارات نے اہم کردار ادا کیا جن میں اخبار مخبر عالم کو نمایاں مقام حاصل ہے مخبر عالم اس دور کا ایک اہم اور مقبول عام اخبار تھا اس میں سیاسی سماجی موضوعات پر مبنی خبروں اور تبصروں کے علاوہ شعر و ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ اخبار کے بانی و ایڈیٹر قاضی عبدالعلی عابد خود اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے شاید اسی لئے اخبار کو اس دور کے صف اوّل کے ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل تھا جن میں ڈپٹی نذیر احمد منشی ذکاء اللہ دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جیسے مشاہیر کے نام گرامی شامل ہیں۔

اخبار مخبر عالم نے محتاط انداز میں انگریزی حکومت کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور آزادی کی تحریکوں کی شد و مد سے حمایت کی۔ کتاب کے مرتب امداد صابری ہیں لیکن پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کا کارنامہ قاضی حیدر جمیل رضوی صاحب نے سرانجام دیا ہے جو بانی اخبار کے خانوادے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں بڑی تحقیق، محنت اور لگن سے اخبار میں شائع ہونے والی تحریروں کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ یہ کہ اس دور کی صحافت، ثقافت اور سیاسی اقدار کی آئینہ دار ہے بلکہ برصغیر کی تحریک آزادی کے بعض ایسے مخفی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ یہ کتاب ہمارے صحافتی ادب و تاریخ میں یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے ہم عصر اخبارات کے برعکس یہ اخبار آج بھی مراد آباد سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، البتہ تقسیم ہند کے بعد اب یہ اخبار اردو کی بجائے ہندی زبان میں شائع ہو رہا ہے۔

محمد ضیاء کیانی

(ایڈیٹر پاکستان آوٹ لک)

میرے محترم اور دیرینہ دوست حیدر جمیل رضوی صاحب نے جب اپنے بزرگوں کی شاندار اور قابلِ فخر کاوشوں کا پُرمغز مجموعہ بہ صورتِ کتاب "تغیرِ عالم اور تحریکِ آزادی" ارسال کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا انہوں نے دل آویز پھولوں کے ایک ایسے گلدستہ سے مجھے نوازا ہے جس کی گوناگوں رنگینی اور خوشبو نے میرے دل ودماغ کے ہر گوشہ کو تروتازہ اور مشام روح کو معطر کردیا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کا ایسا کون سا شعبۂ حیات ہے جس کی تابندہ اور سبق آموز جھلک اس کتاب سے مخفی رہی ہو۔ اس میں مسلمانانِ ہندوستان کے عروج وزوال کی فکر انگیز داستان ہی نہیں بلکہ ہماری تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور دینی بے حسی کا مرثیہ بھی ہے۔ یہ کتاب صحافت وحق گوئی کے قابلِ رشک حوصلے اور حریت وحمیت ملی کے فلک شگاف نعروں سے بھی مزین ہے۔۔ سچ تو یہ ہے کہ قلمی جہاد کا ایسا جیتا جاگتا منظر میری آنکھوں نے بہت کم دیکھا ہے۔ اس کتاب کے سنہری اُوراق مسلمانانِ ہند کی تاریخ وسیاست اور صحافت وادب اور مستبد غیر ملکی حکومت کی ریشہ دوانیوں کا ایک ایسا بیش بہا سرمایہ ہیں جن کے متعلق بقول شاعر یہی کہا جاسکتا ہے:

وہ رفتہ رفتہ جام پلاتے چلے گئے   ہم رفتہ رفتہ ہوش میں آتے چلے گئے

ان جیسی تحریروں کی بدولت ہی ہم کو یہ احساس شدت کے ساتھ ہونے لگا کہ:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات   تو جھکا جب غیر کے آگے تو تن تیرا نہ من

اور پھر ہم نے قائداعظم کی رہنمائی میں ایک آزاد وطن کے لئے مسلم لیگ کی پُرعزم تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا اور جو برادرانِ وطن ہم کو اس نئے وطن میں فاقہ کشی اور فاقہ مستی سے ڈراتے تھے ان سے بقول اکبر الٰہ آبادی ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم آزادی کی نعمت اور خودداری کی عظمت کے لئے ہر صعوبت بخوشی برداشت کرسکتے ہیں۔

پتلون گر نہیں تو لنگوٹی ہی سہی   گھی میسر نہیں تو خشک روٹی ہی سہی
میں قوم کی فربہی کا مشتاق نہیں   بن جائیے میری عقل موٹی ہی سہی

امداد صابری صاحب نے اس کتاب کی تالیف وترتیب میں جس جدوجہد اور کاوش سے نبرد آزمائی کی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخ ساز اور ادبی کارنامہ ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں اس چراغِ ہدایت سے سالہا سال تک روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔ اب کہاں ہیں ایسے مدیر اور طنزیہ لکھنے والے جو اپنے اخبار میں "لارڈ کرزن سے جھپٹ" جیسی نظم بلا تامل اور بلاخوف چھاپ سکیں۔

پاکستان میں ایسے کئی ادوار گزرے ہیں جن میں زباں بندی اور حق پوشی ہم کو اندھیروں کی طرف لے گئی اور ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی جانب ہٹتے چلے گئے، ترقی کی بجائے تنزلی ہمارا مقدر بنی۔ یہاں تک کہ نہ یقینِ محکم رہا نہ عملِ پیہم! اور نہ محبت فاتحِ عالم۔۔ میرا دل یہ ضرب برداشت نہ کرسکا اور پکار اُٹھا:

بطحائی کی نگری محبت سے خالی   نہ کچل کی مستی، قلندر کی لعلی
ہے کیوں اُمتِ مسلمہ اب زوالی   نہ سینا کی حکمت، نہ فکرِ غزالی

لیکن صابری صاحب کی کتاب نے ان سوالوں کا اس حسن وخوبی سے جواب دیا کہ میرے دل سے دعا نکلی کہ "نوجوان مسلم" اس کا مطالعہ اور اس میں تدبر ضرور کرے۔

یہ اللہ بزرگ و برتر کی کیسی بندہ پروری ہے کہ آج جس "مخبر عالم اور تحریک آزادی" پر میں اپنے تاثرات رقم کر رہا ہوں اسی تحریک سے میں بھی طالب علمی کے دوران قائد اعظم کی قیادت میں منسلک اور منہمک رہا اور مراد آباد میں میرے والد بزرگوار نورالحسن صاحب کو (جو ایک عرصہ دراز تک وہاں کے میونسپل بورڈ کے ممبر اور چیرمین رہے) قاضی عبدالعلی عابد اور قاضی عابد علی جوہر صاحبان سے قرب کا شرف حاصل رہا، قاضی صاحب ازراہ کرم مخبر عالم کی ہر اشاعت میرے والد صاحب کو بھیجا کرتے تھے اور وہ اس طرح میری ذہنی نشوونما میں اسلامی اقدار کا رنگ بھرتے رہے، کبھی کبھی میری ان سے ملاقات نیازمندی ہو جاتی تو مجھ کو ایسا محسوس ہوتا کہ مولانا حالی پھر زندہ ہو کر میرے سامنے ہیں اور "مسدس حالی" اردو نثر میں لکھی جا رہی ہے اور وہ اپنی قوم خوابیدہ کو پھر سے بیدار کرنے میں مصروف ہیں۔

حیدر جمیل رضوی صاحب اسکول اور کالج سے میرے ہم جماعت رہے اور ان سے میری دوستی آج بھی اہرام مصر کی طرح مضبوط اور حیران کن ہے حالانکہ ہمارے دنیوی راستے جدا جدا رہے لیکن پھر بھی ہمارے دل ساتھ ساتھ دھڑکتے رہے۔ انہوں نے صحافت اور تجارت میں نام پیدا کیا اور میں نے قائد اعظم کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ملک وملت کی خدمت کا راستہ سول سروس میں تلاش کیا۔ حیدر صاحب کے بلند حوصلہ کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے پاکستان میں اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کے لئے باوجود علالت اور ناتوانی کے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور مجھ کو بھی اس میں کچھ کلمات لکھنے کی دعوت دی۔ اللہ ان کو اس بلند مقصد اور نیک کام کی جزائے خیر دے۔ آمین!

نصرت حسن نصرت

مخبر عالم کا شباب

جب "مخبر عالم" کا عالم شباب تھا تو ہم ایام بے خبری میں مبتلا تھے ہم کو نہ تو کسی خبر سے کوئی تعلق تھا نہ اتنا ہوش تھا کہ اخباروں پر نظر درازی کریں گویا بے خبری میں پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ صبح تڑکے ہی اسکول کا دھڑکا بعد دوپہر مولوی صاحب کی پیشی، پھر ماسٹر صاحب کی "رگڑائی" اللہ اللہ کر کے شام ڈھلنے سے کچھ پہلے جو چند ایک گھڑیاں تیراکی کی ملتی تھیں ان ہی میں جی کے ارمان پورے کر لیتے تھے۔ زیادہ تر وقت ہاکی کی بلے بازی میں گزرتا اور خوب گزرتا یا پھر کبھی اچھی ہوا دیکھی تو پتنگ بڑھالی۔ اب ایک ایسے لڑکے سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ "مخبر عالم" کی افادیت ومحاسن شماری کرے جس میں تصاویر بھی نہیں ہوتی تھیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتیں چونکہ ہم باتصویر اخبار ورسائل دیکھ کر تصویر بین تو بن گئے تھے البتہ مضامین اور خبروں سے ناآشنا ہی رہے ہاں جب کبھی بزرگوں کی گفتگو زور پر ہوتی تو حادثاتی طور پر "مخبر عالم" اور "دبدبہ سکندری" جیسے نام کان میں پڑجاتے جس سے اتنا ضرور سمجھ میں آتا تھا کہ یہ اخبارات مشرقی اور شمالی ہند خصوصاً اضلاع روہیل کھنڈ، دہلی، کلکتہ، لکھنؤ، علی گڑھ ...، ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔

رام پور سے مراد آباد سولہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور مراد آباد کی حیثیت اس زمانے میں اہل

رام پور کے لئے ایسی ہی اہم تھی جیسے کسی زمانے میں صدر کی اہلِ کراچی کے لئے یعنی شاپنگ کرنا ہو، نئی پکچر دیکھنا ہو، علاج معالجے کی حاجت ہو یا یوں ہی سیر سپاٹا کرنا ہو۔ لوگ سائیکلوں پر یہ سفر طے کرتے۔ سڑک بھی ایسی سایہ دار کہ سورج کے جھانکنے تک کی بھی گنجائش نہ تھی۔ راستے میں لہراتے بل کھاتے دو دو دریا، لہلہاتے مرغزار اور اس پر پرندوں کی چہکار۔ سڑک کیا تھی گویا جنت کے باغوں کی روش کا نمونہ۔ افسوس! ایسے نظر فریب مناظر اب یادوں کی البم کی زینت ہیں کیونکہ یہ خوشگوار شارع اب ڈیزل کے دھوئیں اور گرد سے بھری رہتی ہے۔ درختوں کے سائے سمٹ گئے ہیں۔ آم اور جامن کی جگہ ٹریفک جام، روزمرہ کا معمول ہے۔ یہ سفر بذریعہ ٹرین تو نہایت سہل اور مختصر تھا۔ ادھر بیٹھے نہیں کہ مراد آباد آگیا۔ ٹرین کے ڈبے میں "مخبرِعالم" پڑھتا دیکھ کر کبھی کبھار اپنا دل بھی نظر لڑانے کو چاہنے لگتا ہو۔ کبھی گڑھ نہ سکی اس لئے ممنون ہیں کہ بھائی حیدر جمیل رضوی صاحب نے جو ہمارے بڑے بھائی کے علی گڑھ اور مراد آباد کے ساتھی اور دوست ہیں اپنی برادر نوازی کے طفیل "مخبرِعالم" کا "خوانِ نعمت" مرتب کروا کے ہمیں فرنگیوں کے دورِ صحافت کے معیار اور صحافیوں کی جرأت مندی کا اندازہ لگانے کا موقع فراہم کیا جو تاریخ اردو ادب کی تاریخ کا کارنامہ ہے کیونکہ یہ دستاویز ہمیشہ علم دوستوں اور صحافیوں کے کام آتی رہے گی اور رہنمائی کرتی رہے گی اور بانیٔ "مخبرِعالم" الحاج قاضی سید عبدالعلی عابد رضوی مرحوم کی حق شناسی اور حق گوئی کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

آیئے اب "مخبرِعالم اور تحریکِ آزادی" کے صفحات کھنگال لیتے ہیں تو مراد آباد اور رام پور کے قرب مزید کا پتہ چلتا ہے۔ ایک صدی قبل برصغیر کے لوگوں کی سوچ کیا تھی، وہ کن حالات میں زندگی بسر کرتے تھے، اس دور کے ہمدردانِ قوم غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے کس قدر بے چین تھے، بے بسی اور گھٹن کی فضا میں سانس لینا ان پر کس درجہ گراں تھا، ہندوستانی محکوموں کی محرومیوں اور گورے حاکموں کو حاصل بے جا مراعات کو دیکھ کر ان کے دلوں پر کیا گزر رہی تھی۔ حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے والے اخبارات و جرائد خود کو کس طرح زندہ رکھے ہوئے تھے، غرض اسی قسم کے بہت سارے عکس ہیں جو اس آئینے میں دیکھے جاسکتے ہیں جسے مولانا امداد صابری نے "اخبار مخبرِعالم اور تحریکِ آزادی" کے نام سے کتابی صورت میں ڈھالا ہے۔ علاوہ ازیں کچھ اہم شخصیات کے خاکے بھی اس کتاب میں موجود ہیں جو بہ مشکل ہی کہیں اور میسر آسکیں۔ پچھلی صدی میں چھپنے والے اخبار و جرائد مع تمام تفصیلات و کوائف بھی اس کی زینت ہیں جو دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاصے کی چیز ہیں۔ علمی نوک جھونک کے باب میں مولانا حالی اور مولانا احسن مارہروی کے دو خطوط بھی شامل ہیں جو شاید اور کہیں دستیاب نہ ہوسکیں۔

غرض پچھلی صدی کی علمی، معاشرتی، سیاسی، صحافتی اور معاشی صورتحال کی جو تحریری تصاویر اس کتاب میں شائع کی گئی ہیں وہ معلومات افزا بھی ہیں اور نمونۂ عبرت بھی۔ بلاشبہ مولانا امداد صابری صاحب اس تالیفی کارنامے پر مستحقِ ستائش ہیں جنھوں نے اردو صحافت کی تاریخ کے طالبانِ علم اور شائقین کو اس بیش بہا سوغات سے نوازا اور اس طرح حیدر جمیل رضوی صاحب کے علمی زر و جواہر کے ورثے کو محفوظ کردیا۔ ہم خاص طور سے جمیل بھائی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے پڑوسی کا حق سمجھ کر ایک علیگ بھائی کو "مخبرِعالم" کے عالم شباب کی جھلکیاں دیکھنے کا موقع دیا تاکہ اس نادر و بامقصد اشاعت پر اپنے قلبی تاثرات رقم کرسکے۔

محمد ذاکر علی خان

برٹرینڈ رسل نے ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے طلوع ہونے پر لکھا تھا : وہ دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں ختم ہوجائے گی ۔ وہ اپنی ہی آگ میں جل کر ختم ہوگی ۔ اور اس کی راکھ سے ایک نئی اور نوخیز دُنیا پیدا ہوگی ۔ تازہ اُمیدوں سے پُر اور جس کی آنکھیں سحر کے نُور سے روشن ہوں گی ۔ برِّصغیر کی جدوجہد آزادی کے دور میں کچھ اسی طرح کے جذبات تھے ۔ ذہن اور رُوح روشن تھے اور پُر اُمید تھے ، ایک طویل دورِ آزمائش و ابتلا کے بعد لوگ آزاد ہونے تھے اس پُرخطر اور طویل جدوجہد میں اُردو صحافت نے جو جاندار ذہن ساز اور بامعنی کردار ادا کیا اس کی تصویر بڑے صاف گہرے رنگوں میں اخبار مخبرِ عالم مراد آباد اور تحریک آزادی کی صورت میں بنائی گئی ہے ۔ اس دورِ پُرابتلا میں اس حریّت پرور اور حق گو اخبار نے آزادی ، سچّائی ، لگن اور عام لوگوں کی خیر خواہی کو اپنا مقصدِ اوّلیں جانا ۔ امداد صابری نے اس اخبار کے مسلکِ حق گوئی سے لیکر رفاہِ عام کے کاموں کی رُوداد اور علمی ادبی فنی شخصیات کا ذکرِ جمیل بڑے سائنسی اور معروضی انداز میں پیش کیا ہے ۔

امداد صابری کا نام تاریخ صحافت اُردو کے سلسلے میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے ، حقیقتاً یہ ایک اہم مصنف کی نہایت اہم کتاب ہے جس میں نہایت مہارت ، محنت اور سلیقے سے واقعات ، معاملات اور افراد کے متعلق قیمتی اور صحیح معلومات یکجا کردی گئی ہیں ۔

حیدر جمیل رضوی نے اس دور نایاب رسالے کو شائع کیا کہ تاریخی نوعیت کے اس خزانہ معلومات کو قارئین استفادے کے لئے عام کرنے میں مدد دی اور ان یادگار زمانہ ہستیوں کے ذکرِ خیر سے جنہوں نے اپنے کارناموں سے اس دورِ شورانگیز کو بامقصد اور بامعنی بنایا تھا ، یاد کیا ۔

پروفیسر ذوالفقار مصطفےٰ

میرے والد محترم صاحبزادہ قدرت اللہ خاں مرحوم اور بانی مخبر عالم قاضی عبدالعلی مرحوم کے بڑے مخلص دوست تھے چنانچہ مخبر عالم ہر ہفتہ پابندی ہمارے یہاں آتا تھا ۔ بچپن میں تو اخبار کی ورق گردانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن جب قاعدہ بغدادی ختم کرلیا تو اخبار کی طرف بھی ہاتھ بڑھنے لگا ۔ مخبر عالم کے عنوانات مختصر خبریں ، ایڈیٹوریل ، خواب و خیال انتخاب و اقتباس ، عالم اسلام ، عالم ہنود ، عالم نسواں ، عالم اطفال ، علمی و تاریخی مضمون وغیرہ ایسے معلومات افزا اور پُرکشش تھے کہ ان میں ہر طبقہ کو اپنی خواہش کے مطابق مواد مل جاتا تھا ۔ چنانچہ میرے اور برادر مرحوم مبارک اللہ خاں کے درمیان جوں ہی اخبار آتا ، عالم اطفال ، پڑھنے کے لئے چھین جھپٹ شروع ہو جاتی اور پھر معاملہ اس طرح حل ہوتا کہ ہم دونوں بھائی بیک وقت عالم اطفال پڑھ لیتے ۔ اخبار کا مواد بالعموم بڑا سبق آموز اور قابل تقلید ہوتا اور ہم اسکی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ۔

یونیورسٹی کی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے جب علیگڑھ گئے تب بھی مخبر عالم سے یہ رشتہ قائم رہا چونکہ لٹن لائبریری بھی اس کی خریدار تھی یہاں تک کہ بچپن سے جاری یہ سلسلہ پاکستان منتقل ہونے تک قائم رہا ۔ بھائی حیدر جمیل رضوی نے اس اخبار کے اقتباسات پر مبنی مولانا امداد صابری کی مرتبہ کتاب " اخبار مخبر عالم اور تحریک آزادی " کا ایک نسخہ جب برائے اظہار رائے ارسال کیا اور یہ معلوم ہوا کہ انکے برادر خورد قاضی مظہر علی رضوی کے زیر اہتمام آج بھی شائع ہو رہا ہے لیکن اب ہندی رسم

الخلافمیں، مگر مضامین سلیس اردو میں ہوتے ہیں تو بڑی خوشی ہوگی، کتاب کے اقتباسات معلومات کا خزینہ ہیں اور بانی مجبر عالم کے صحافیانہ تبحر کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے غاصب حکومت اور اسکے سفید فام زعماء کے خلاف بڑی خوبی سے قلمی جہاد جاری رکھا اور اسطرح نوجوان نسل کو حصول آزادی کی جدوجہد کے لیے تیار کرتے رہے۔ کتاب بلاشک اس لائق ہے کہ اسے پاکستانی یونیورسٹیوں کے صحافتی شعبہ کے نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔

تجمل علیخان (علیگ)
ایڈووکیٹ

اخبار مُخبرِ عالم مراد آباد حُرّیت پرور
اور حق گو اخبار ہے۔ اس نے
انگریز کی غلامی کے خلاف ملک کو آزاد
کرانے کے لئے قلمی جنگ لڑی، اور
علمی و تعلیمی کارنامے انجام دیئے۔
نیز اس میں بانیٔ مُخبرِ عالم کے خاندان کے
حالات بھی تحریر ہوئے ہیں۔

امداد صابری
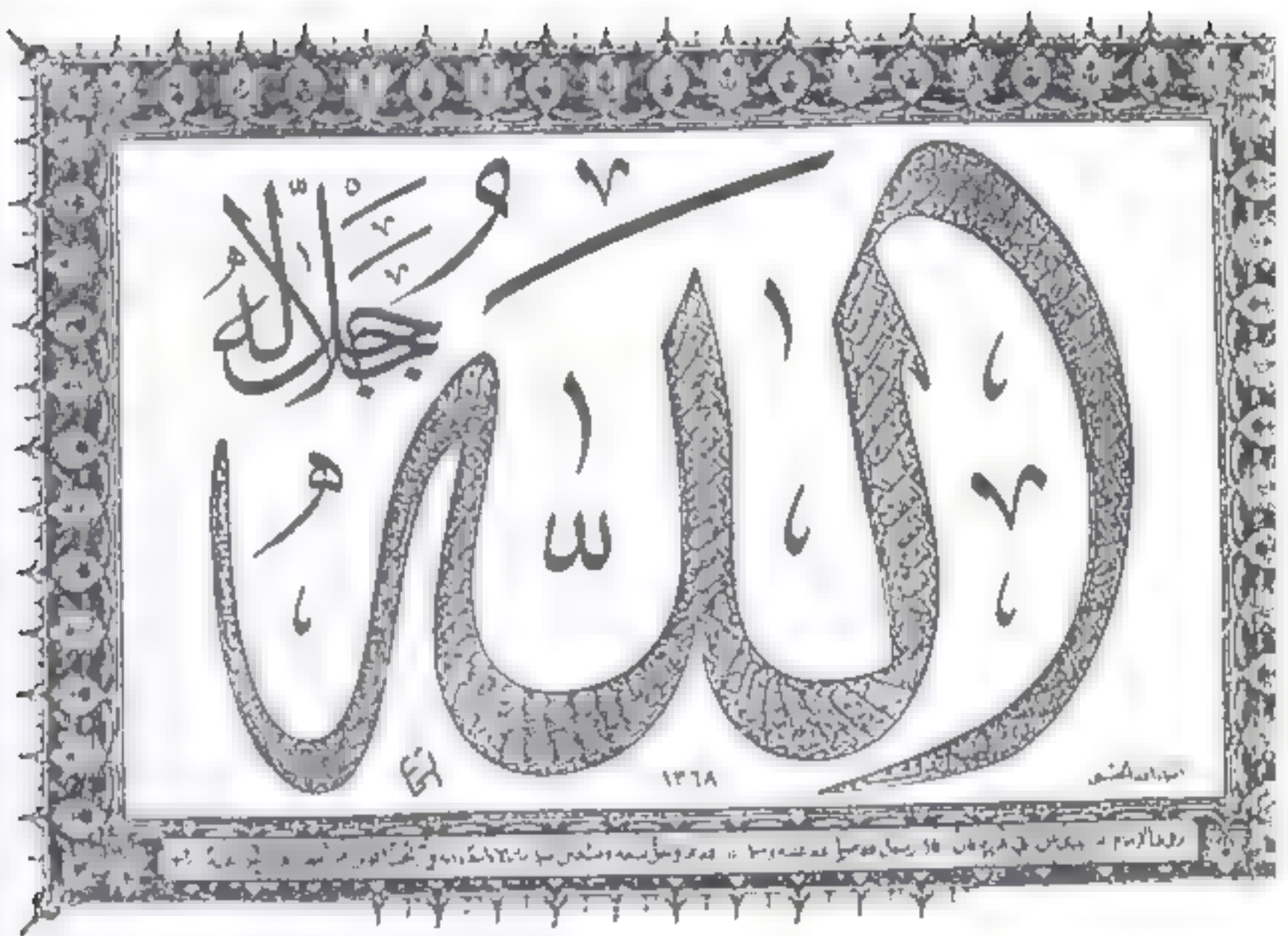
اللہ ۔ اس لفظ اللہ کی اندرونی ڈنڈوں میں اللہ تعالے کے ننانوے اسمائے حسنیٰ لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کتبہ مصری خوشنویس استاد محمود الشحات کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور ۱۳۶۸ھ میں لکھا گیا۔

فہرستِ عنوانات

اخبار مجزِ عالم مراد آباد اور تحریکِ آزادی

اِنَّہ مِن سلیمٰن و اِنَّہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیت قرآنی سورہ النمل ۔ شکل ناشپاتی

بقلم عبدالعزیز رفاعی ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء ۔

سببِ تالیف

محبی جناب راحت مولائی صاحب[1] ایڈوکیٹ و ایم ایل اے میرے پرانے دوست ہیں۔ انھوں نے غالباً ۱۹۵۲ء میں یوپی اسمبلی کا پہلا الیکشن آزاد امیدوار کی حیثیت سے کانگریسی امیدوار سے لڑا تھا، میں اس الیکشن کا انچارج تھا۔ مولائی صاحب الیکشن لڑنا نہیں چاہتے تھے، اس وقت وہ جیل میں تھے۔ مجھ کو وہاں کے احباب نے جیل سے فارم امیدواری پر دستخط کرانے کے لئے مقرر کیا۔ وہ میری بات مانتے ہیں، چنانچہ میں وہ فارم امیدواری جیل سے گیا، دستخط کرکر لایا، الیکشن لڑا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔

اس وقت سے میرا آنا جانا مرادآباد زیادہ ہوگیا۔ میرا دستور رہا ہے جب کسی شہر میں جاتا ہوں تو وہاں کے ادیبوں اور اہلِ علم حضرات سے ملتا ہوں۔ اگر کوئی لائبریری ہوتی ہے تو اس کی کتب کا مطالعہ کرکے اپنی تصانیف کے لئے مواد فراہم کرتا ہوں۔ اس زمانے میں تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد طبع ہو چکی تھی دوسری جلد اور دوسری کتابیں مرتب کر رہا تھا۔ مرادآباد میں وہاں کے ادیبوں اور صحافیوں کے بارے میں استفسار کیا۔ پتہ چلا کہ بہت کچھ اس دنیا سے سدھار گئے، بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔

صرف ایک مخبرِ عالم کے دفتر کا پتہ لگا۔ وہاں گیا۔ قاضی عابد علی صاحب جوہرؔ اور ان کے فرزند ارجمند قاضی مظہر علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ مخبر عالم کے کچھ پرانے فائل دیکھے۔ غرض جب بھی مرادآباد جانا ہوتا تو مخبر عالم کے دفتر میں ضرور جاتا اور زیادہ وقت وہاں گذارتا۔

اسی اثنا میں جناب قاضی عابد علی صاحب جوہرؔ مرادآباد میں ۹ نومبر ۱۹۶۹ء کو فوت ہو گئے۔ صدمہ ہوا۔ وہ اپنے خاندان کے حالات پر پورا عبور رکھتے تھے۔ پرانے آدمی تھے، مرادآباد کے بارے میں کافی معلومات اُن کو حاصل تھیں۔

---

[1] جناب راحت مولائی صاحب کا ۲۲ جون ۱۹۸۰ء کو انتقال ہوا۔

راقم الحروف نے اپنے والد حضرت علامہ شرف الحق صدیقی قادری کے حالات زندگی پر ایک مبسوط کتاب "داستانِ شرف" تالیف کی ہے جس کا اجراء دہلی کی غالب اکیڈمی بستی نظام الدین دہلی میں ہوا۔ اس کے بعد پاکستان جانا ہوا۔ کراچی پہونچا تو وہاں کے احباب جناب ایوب قادری صاحب، جناب مشفق خواجہ صاحب، جناب ابو سلمان شاہجہانپوری صاحب، جناب مولانا حامد علی قریشی صاحب، مہتمم انجمن حمایت الاسلام کراچی، جناب عبداللہ شمیم صاحب ایڈیٹر جنگ کراچی، جناب یوسف بخاری صاحب، جناب علاء الدین خالد صاحب، جناب الحاج حافظ منظر محمد صاحب، جناب حافظ محمد رحیم صاحب اور جناب عابد علی صاحب جو ہمدم ایڈیٹر مخبر عالم کے صاحبزادے جناب حیدر جمیل رضوی صاحب کے اصرار پر غالب لائبریری ناظم آباد میں پیر حسام الدین راشدی صاحب کی صدارت میں ۲۰ جون [illegible] کو "داستانِ شرف" کا اجراء ہوا۔

جناب حیدر جمیل رضوی صاحب نے میرے والد ماجد مولانا شرف الحق صاحب کے مختصر حالات زندگی انگریزی اور اردو کا اعلانات نامہ وقت مقررہ پر چھاپ کر عنایت کیا۔ یہ کام انھوں نے اس محنت اور مستعدی سے کیا کہ اگر میرا بیٹا بھی کرتا تو یہ مستعدی نہ دکھاتا۔ میرے والد ماجد کے حالات زندگی اردو میں منشی عبدالقدیر صاحب کے صاحبزادے جناب علاء الدین خالد صاحب نے طبع کرائے۔ ان دونوں حضرات نے یہ کام بلا اجرت لئے کیے۔

کراچی میں حیدر صاحب نے بھی تقاضہ کیا کہ آپ مخبر عالم کی تحریک آزادی میں حصہ کو مکمل کر دیں۔ میں اور میرے چھوٹے بھائی قاضی مظہر علی رضوی اس کے بیحد منتظر ہیں۔ میں کراچی سے واپس دہلی پہونچا اس وقت مرادآباد کے حالات اطمینان بخش نہیں تھے اس لئے قاضی مظہر صاحب کو لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب حالات پرسکون ہو گئے تو ۳ اپریل [illegible] کو قاضی مظہر علی کو ایک خط تحریر کیا کہ آپ مخبر عالم کے کچھ فائل مجھ کو بھیج دیں چنانچہ قاضی صاحب ۱۳ اپریل [illegible] کو دہلی میرے گھر تشریف لائے۔

جن دنوں مرادآباد میں مخبر عالم مرادآباد کی ورق گردانی کرتا تھا تو مخبر عالم کی حریت پرور خبریں اور کلام نقل کی جلد کے دوسرے صفحہ پر نوٹ لکھ دیا کرتا۔ یہ حصہ میں نے مرتب نہیں کیا تھا۔ اس کے لئے ملاقات میں قاضی مظہر علی صاحب سے میں نے درخواست کی کہ آپ ہر ہفتے مخبر عالم کے چھ فائل روانہ کر دیا کریں۔ میں مطلوبہ خبریں اور نظمیں نقل کرکے واپس کر دیا کروں گا۔

چنانچہ اس پروگرام پر قاضی صاحب نے عمل کیا۔ چھ فائل ہر ہفتے آتے رہے اور میں ان کو دیکھ کر واپس کرتا رہا۔ اس طرح دوسرے حصہ کی بھی تکمیل ہو گئی۔

محبی جناب راحت مولائی صاحب ایم اے کے چچا استاد رشید مرادآبادی ایک قادر الکلام

شاعر تھے۔ ان سے میرے بھی تعلقات تھے۔ انھوں نے ۱۱ فروری ۱۹۶۶ء کو مجھے اپنی ایک بیاض دکھائی۔ اس کی ورق گردانی کر رہا تھا اور اشعار پڑھ رہا تھا تو اس میں قاضی جمشید علی صاحب تجم کے کچھ شعر نظر پڑے۔ اس وقت میں قاضی جمشید علی صاحب تجم کے حالات زندگی تحریر کر رہا تھا اور مخبر عالم مرادآباد بھی زیر مطالعہ تھا۔ تجم صاحب کے اشعار بیاض میں دیکھے تو اسی وقت نقل کر لیے۔ اور ان کو اس کتاب میں درج کر دیا۔ تجم صاحب کا کلام نایاب تھا اس لیے ان اشعار کے حاصل کرنے کے بعد بھی میں نے ان کے اشعار کی مزید تلاش کرنے کی کوشش کی۔ تیغ پوری پبلک لائبریری دہلی، نذیریہ لائبریری دہلی و ہارڈنگ لائبریری دہلی کی فہرست کتب دیکھی لیکن مراد بر نہ آئی۔ اپنے والد ماجد حضرت علامہ مولانا شرف الحق صاحب کے کتب خانے کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اس میں بھی تجم صاحب کے اشعار نہیں ملے۔

یوں تو اس اخبار کے ایڈیٹروں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ وہ بڑے بہادر اور شجاع ہیں اور انگریزوں کے سخت دشمن ہیں۔ البتہ انھوں نے آزادی کے ساتھ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ بچتے بچاتے انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ سخت دور آیا تو مدح سرائی اور قصیدہ خوانی بھی کی۔

میں نے مخبرِ عالم کی ورق گردانی کی تو مجھے حریت پرور کافی میٹر ملا۔ جس کو پڑھ کر آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مخبرِ عالم کے ایڈیٹروں نے حکومت برطانیہ کے حکمراں طبقہ پر نکتہ چینی کرنے میں کسی پہلو کو نہیں چھوڑا، خوب خبر لی ہے۔ بہت سا میٹر دوبارہ فائلوں کے دیکھنے کے بعد ملا۔ اگر میں مخبر عالم کے فائل دوبارہ نہ دیکھتا تو یہ میٹر قطعی مجھ کو نہیں ملتا۔ جناب عبد العلی صاحب، ایڈیٹر مخبر عالم مرادآباد کا کلام نظمیں اور غزلیں بھی دوبارہ فائلیں دیکھنے سے حاصل ہوئیں۔

لارڈ کرزن، وائسرائے ہند کے خلاف جو نظم مخبرِ عالم میں شائع ہوئی ہے، اور جس میں اس کو بری طرح جھنجھوڑا گیا ہے اس کا شائع کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

"اخبار مخبر عالم مرادآباد اور تحریک آزادی" کا وہ حصہ جس میں "مخبر عالم" کی خبروں، مضامین اور نظموں پر بحث کی گئی ہے وہ صرف مخبر عالم مرادآباد سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی جمشید علی صاحب تجم مرادآبادی کے خاندان کے حالات کی ترتیب میں دوسری کتابوں اور رسائل کی مدد لینی پڑی ہے جس کی فہرست کتاب کے آخر میں درج ہے۔

امداد صابری

چوڑی والان۔ دہلی
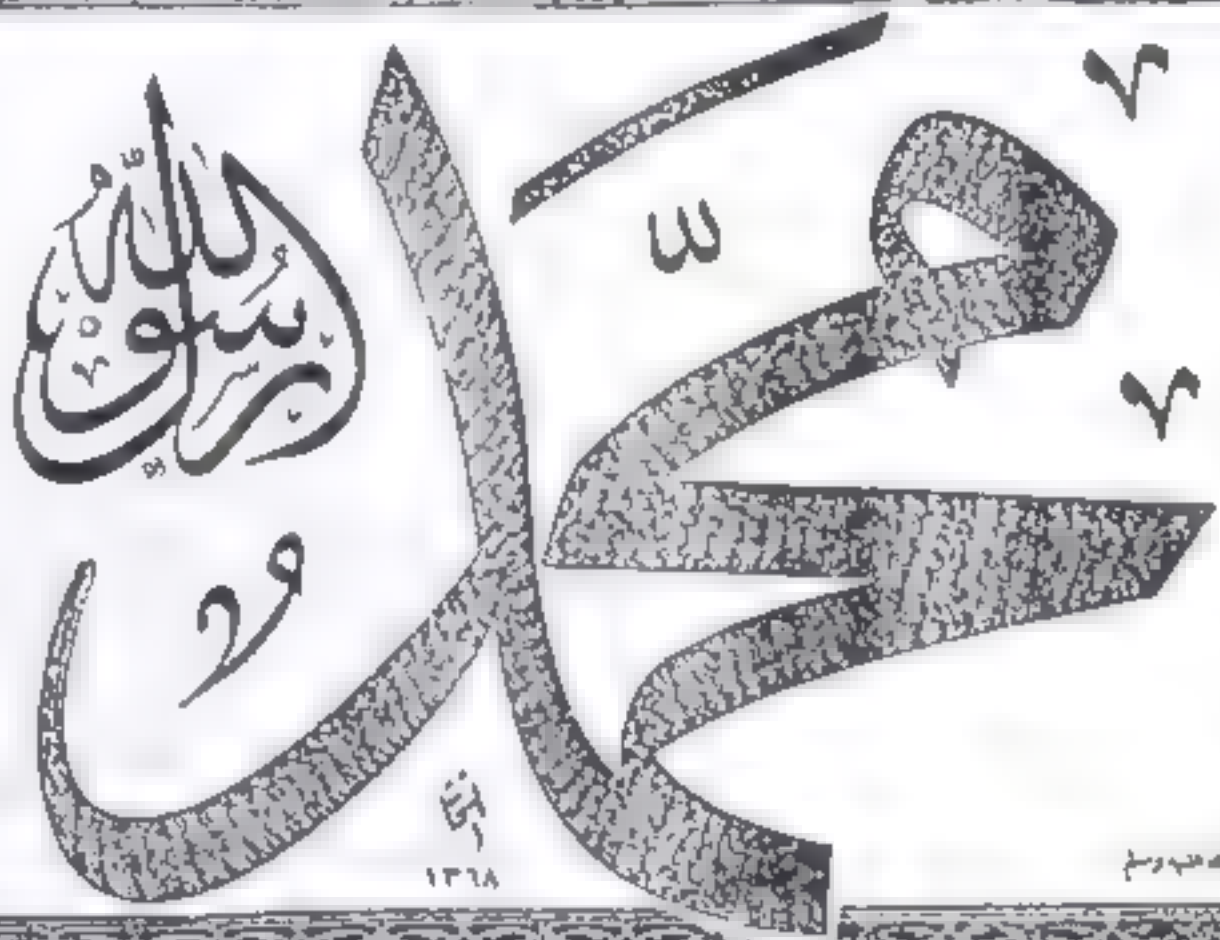
محمدؐ۔ اس نام نامی کے اندرونی لائنوں میں آپؐ کے اسمائے گرامی مدون کئے گئے ہیں۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

سنہ ۱۹۸۱ء میں مولانا امداد صابری صاحب مرحوم کراچی تشریف لائے تو ان سے پہلی مرتبہ شرفِ ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ اگرچہ ان کی کئی جلدوں پر مشتمل تحقیقی کتاب "تاریخ صحافتِ اردو" کے ذریعہ میں اُن سے غائبانہ طور پر متعارف تھا لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع میسّر آیا تو ان کی معلوماتی کاوشوں و تحقیقاتی جدوجہد کا صحیح طور پر ادراک ہو سکا۔ اسی ملاقات کے دوران مرحوم نے میرے والدِ محترم قاضی عابد علی صاحب جو کہ مرحوم اور برادرِ خورد عزیزی مظہر علی رضوی سے مراد آباد میں اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ فرما کر بتایا کہ میرے دادا مفتی سید عبدالغنی عابد صاحب مرحوم و مغفور کے جاری کردہ اخبار مخبرِ عالم میں تو ایک گراں بہا علمی اور تاریخی سرمایہ محفوظ ہے اور وہ اس لائق ہے کہ ہندوستان کے نوآبادیاتی نظام اور استحصالی چنگل سے نکل جانے کے بعد اب اس کو مختصراً ایک کتابی صورت میں منتقل کر کے محفوظ کر لیا جائے تاکہ ایسی کتاب ایک مورخ کے لئے ہی نہ صرف کچھ مواد فراہم کر سکے بلکہ عوام کی معلومات میں بھی اضافہ کا سبب بنے اور اس طرح نئی نسل کے سامنے برطانوی استبداد کی وہ تصویریں بھی آ سکیں جن کو بروئے کار لا کر یہ غاصب حکومت سنہ ۱۸۴۹ء تک ہندوستان کے ہر حصہ کو اپنے زیرِ نگیں کرنے کے بعد اور بالخصوص سنہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی کے ناکام ہو جانے کی وجہ سے سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۹۴۷ء ۹۰ سال کے طویل عرصہ تک کبھی قانون کا سہارا لے کر اور کبھی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کر کے اس عظیم ملک کی دولت، اس کے تمدن اور اس کی ثقافت کا بے دریغ استحصال کرتی رہی لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس کے ردِ عمل میں برطانوی حکومت کو دوام بخشنے کی خاطر "دار و گیر"، "قید و بند"، قتل و غارت اور ظلم و تعدی کے جو منتقمانہ کارنامے تہذیب و اخلاق کے داعی، قانون اور اصول کے علمبردار اور عدل و انصاف کی دعویدار برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھے وہ ورق تاریخ میں محفوظ ہیں۔

اور وہ اس سے حسن نیت جیسا غدار احسان ناشناس و محسن کش برطانوی قوم کے کردار کی وضاحت کے لئے کافی ہیں لیکن برطانوی جور و ستم کی آندھیاں مادر وطن کے جذبۂ ... دل کو کچلنے میں ناکام رہیں اور اس کے سپوت اس طویل دور میں زندگی اور زندگی کی مسرتوں سے بے نیاز ہو کر درویش گوشہ نشینی سے خوش و مطمئن رہے۔

بہرحال صابری صاحب مرحوم کا نقطۂ نظر قابل اعتبار تھا اس لئے میں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اپنے تعاون کے اظہار میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ کراچی تشریف لائے تو ان کے ساتھ زیر نظر کتاب کا مسودہ بھی تھا۔ انھوں نے خواہش کی کہ پہلے میں اس پر ایک نظر ڈال لوں تاکہ اس کی کتابت شروع کرادی جائے لیکن ان کی موجودگی ہی میں جب میں نے ان کے نہایت پختہ اور گھسے ہوئے خط میں تحریر شدہ مسودہ پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ اس کے منضبط کرنے کے لئے مرحوم نے استعمال قرطاس میں جس کفایت شعاری اور جزرسی کا ثبوت دیا ہے کہ باید و شاید۔ انھوں نے اس کو مختلف اقسام اور متفرق سائز کے کاغذ پر تحریر کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مرحوم نے بچوں کی یک طرفہ لکھی ہوئی خوشخطی کی کاپیوں اور اکاؤنٹ بکس کے اوراق کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا اور قدرتاً اس صورت میں میرے لئے اس مسودہ کا بتوجہ مطالعہ اور اس پر اپنی رائے کا اظہار مشکل تھا لیکن یہ خیال کر کے کہ مخبر عالم سے حاصل کردہ اقتباسات، حوالہ جات اور اندراجات ضرور درست ہوں گے اور ان میں کسی قسم کی غلطی یا بے ربطگی نہ ہوگی۔ میں نے مرحوم سے کہہ دیا کہ وہ اس کی کتابت کرا دیں تاکہ اس کے پڑھنے میں مجھے آسانی ہو اور اس کے بعد جلد از جلد طباعت کا مرحلہ بھی سر ہو جائے۔

اس ملاقات کے بعد تقریباً دو ماہ میں کتابت کا مرحلہ طے ہو گیا اور دہلی واپسی سے قبل مرحوم نے مسودہ اور کتابت شدہ متن میرے حوالے کر دیا۔ اب جو میں نے مسودہ اور کتابت کا مقابلہ کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہ رہ سکا کہ جب تک بذات خود مسودہ کے اندراجات و مخبر عالم سے نقل کردہ اقتباسات کا مقابلہ نہ کر لوں اس وقت تک طباعت کے معاملہ کو بمجبوری ملتوی کرنا پڑے گا چونکہ تحریر کی صحت لابدی شے ہے اور جب تک اس ضمن میں مکمل اطمینان نہ ہو جائے طباعت کا خیال بے معنی ہے۔

۱۹۶۳ء میں میرے مخترم دوست حافظ محمود الحسن صاحب مدینہ طیبہ سے کراچی تشریف لائے تاکہ رمضان مبارک میں نماز تراویح کی امامت کر سکیں۔ کلام اللہ سے حافظ صاحب کی وابستگی، قرأت اور صحت تلفظ ایسی خصوصیات ہیں کہ جب تک وہ مسجد رحمانیہ میں نماز جمعہ میں امامت و تقاریر کا سلسلہ قائم رہا اس مسجد کا طول و عرض سامعین کو اپنے اندر نہ سمو سکا اور لوگ ۱۵-۱۵ اور ۲۰-۲۰ میل کی مسافت طے کرکے انھیں سننے کے لئے آتے اور مسجد کے علاوہ ادھر ادھر کی سڑکیں بھی سامعین سے کھچا کھچ بھر جاتیں۔ حافظ صاحب کے مدینہ طیبہ منتقل ہو جانے کے بعد ان کی ذات سے استفادہ کا موقعہ ختم ہو گیا تھا اس لئے اس بار

ان کی عارضی واپسی اور ان کی ابتدا میں نمازِ تراویح سے گریز ناممکن تھا۔ چنانچہ اپنے غریب خانہ واقع سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی سے روزہ افطار نے کے بعد کمزوری اور نقاہت کے باوجود پی ای سی ایچ ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع صدیقی مسجد میں پہونچنے کا طویل سفر بھی وہاں ادائیگی تراویح میں مانع نہ ہو سکا۔ گیارہویں روزہ کے بعد میں بارہویں تراویح ادا کر کے فارغ ہوا تھا کہ یکایک دل کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ ۱۳ یوم تک تو میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر امراضِ قلب کے ہسپتال کے اس شعبہ میں بے حس و بے خبر پڑا رہا جہاں محض مختلف، برقی مشینوں سے جسم و جان کا رشتہ استوار کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر ۱۳ یوم کی جدوجہد کے بعد شفیق دعزیز معالجین ڈاکٹر اظہر فاروقی (فزیشین) و ڈاکٹر جمال نقوی (سرجن) نے پوری تندہی، اخلاص اور سوچ بچار کے بعد بنیادِ مرض کا کھوج لگایا اور تین آپریشنوں کے بعد دس سالہ مستند بینک کا آمد پیس میکر لگا کر رخصت کر دیا۔ یہ تو ہونے تھے لم یزل کا مجھ عاصی پر کرم بے پایاں ہے کہ ۱۹۸۳ء کے بعد ۱۹۹۳ء میں دوسری بار قلب کی اس سست رفتاری کو یک منٹ میں ۲، بار منقید کرا دیا اور میں ہمیشہ کی طرح اپنے روزمرہ کے معمولات میں مشغول ہوں لیکن اس سلسلہ میں کراچی کے امراضِ قلب کے ان دو شہرت یافتہ نیک ہوش و مریضوں کی دل دہی اور ان کے معالجہ و خبر گیری میں ہمہ وقت مستعد ڈاکٹروں کا شکریہ ادا نہ کرنا میرے لئے ناگزیر ہے جن کی خصوصی توجہ اور محبت نے علالت کے اس مرحلہ کو بخیر و عافیت طے کرا دیا میری دعا ہے کہ رب السموٰت والارض ڈاکٹر فاروقی و مرحین نقوی کو مزید دینی اور دنیوی سربلندیوں سے نوازے، اور ان کے جذبۂ خدمت کو مزید جلا بخشے جو مریضوں کے لئے شفاء اور ان کی شہرت کا سبب بنے۔

قلب کی تکلیف کے سدِباب سے فراغت کے بعد مجھے ثوٹیا نے آلیا، آخر آتش نے دائیں حصۂ جسم کو متاثر کیا اور بائیں کان نے بھی قبولیتِ ندا سے منھ پھیر لیا اور یوں صابری صاحب کی تالیف کردہ "اخبار مخبر عالم اور تحریک آزادی" کا کام رکا رہا۔ دورانِ علالت اور اعادۂ قوت مرحوم کئی بار کراچی آئے۔ عیادت اور مزاج پرسی کے مراحل تو سر ہوتے رہے لیکن "صورت بہ بیں حالت مپرس" سے متاثر ہو کر مرحوم نے ذکرِ طباعت کتاب سے گریز کیا۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مرحلہ اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچے گا جب تک میں خود مرادآباد جاکر اس کے اندراجات کی صحت سے مطمئن نہ ہو جاؤں اور اس سفر میں کبھی تو میری صحت، کبھی پرنٹ آرٹس (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے سلسلہ میں انہماک اور ۱۹۸۶ء میں ایک پروسیسنگ کے نئے ادارہ اسکین آرٹس پرائیویٹ لمیٹڈ کے معرضِ وجود میں آنے اور ابتدائی گتھیوں کے سلجھانے کے مراحل میرے سفرِ مرادآباد میں مانع رہے اور کوشش، تبلیغ کے باوجود "بوئے جوئے مولیاں آید ہمی" کی آرزو رکھنے والے ابوالحسن رودکی طرح رودِ رام گنگا کے کنارے آباد اپنے دلکش مولد مرادآباد کی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مشامِ روح کو ۱۹۹۰ء سے قبل معطر نہ کر سکا۔

"اخبار مخبر عالم در تحریک آزادی" کے اقتباسات آج کے نظریہ سے دیکھنا مناسب نہ ہوگا بلکہ ہمیں پچھتر سال قبل کے ہندوستانی ماحول کی طرف مراجعت کرنا ہوگی۔ اور یہ وہ ماحول ہوگا جبکہ برطانوی حکومت کا سورج نصف النہار پر تھا اور کہیں نہ کہیں اس کی قلمرو کو اپنی جبلی تمازت سے تند و گرم رکھتا تھا۔ اس کی سیاسی چال بازیوں اور نوآبادیاتی کرتوتوں سے دنیا کی ہر حکومت مرعوب اور علی الخصوص اسی کی قبیل کی ہر غاصب نوآبادیاتی مملکت متاثر تھی۔ اس کی حکومت کا ہر اہلکار نخوت و تکبر کا پتلا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر حکم کی تعمیل ہر ہندوستانی اسی طرح سرانجام دے گا گویا وہ حکم وحی منزل ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی انگریز سے نظر دوچار ہونے کے بعد کسی ہندوستانی سے سلام نہ کرنے کی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے ایک مجرم گردانا جاتا تھا اور اس کوتاہی کی سزا سے صرف نظر کر دینا گویا ہندوستانی کے ساتھ ترحم خسروانہ سے کم نہ ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کا ہر مراعات یافتہ طبقہ اور ہر حاکم "حضور فیض گنجور" "عالی جناب" یا بقابہ "بہادر اور دام اقبالہ" کے احترامی کلمہ سے نوازا جانا اپنا حق سمجھتا تھا یہی حال برطانیہ کے حاشیہ بردار اور اس کے اقتدار کو حصولِ دوام کے متمنی جابر اور ظالم ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کا ٹولہ یا خطاب یافتہ جی حضوریوں کے گروہ کا تھا جن کا اگر قولاً نہیں تو تحریراً ضرور احترام کرنا پڑتا تھا ——— ایسے دور میں اخبار نویسی کا فن اپنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ بہت نازک زمانہ تھا کہ اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی بیداری پیدا کرنے کا کام جاری رکھنا ہوتا تھا۔ مخبر عالم کے بانی اور مدیر جناب قاضی عبدالعلی صاحب عابد کی قابلیت اور زور کلام کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ مرحوم نے اپنے فرض کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے اخبار کے ذریعہ سے ان تمام تحریکوں کو واضح کرتے رہے جو ہندوستان میں غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے اور ہندوستانی تہذیب اور صنعت و حرفت کو برباد کر دینے والی تھیں۔ یہ کام آسان نہیں تھا مگر موصوف نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ موجودہ کتاب میں مخبر عالم کے جو اقتباسات درج ہیں ان سے اس کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے اعلیٰ صحافتی اصول بھی واضح ہو سکتے ہیں۔

ورودِ مرادآباد کے بعد جہاں تک بھی ممکن ہو سکا میں نے کتاب مذکور میں مخبر عالم کے اقتباسات کو درست کیا لیکن چچا رشید کی بیاض اور پردادا قاضی جمشید علی صاحب تجم کے کلام کی منقولات اور قاضی عبدالعلی صاحب عابد کی کچھ غزلیات کو جوں کا توں ہی چھوڑ دیا چونکہ چچا رشید کی بیاض اور سخن الشعراء اور تذکرۂ تلامذہ غالب جن سے اقتباسات لئے گئے ہیں وہ میری دسترس سے باہر تھے۔

اس کام کے تکملہ میں استاد محترم مولوی ضیاء الرحمٰن صاحب مرحوم کے صاحبزادے عزیزی افضال الرحمٰن صاحب جو کہ ہند کے عظیم تعلیمی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہند دہلی سے وابستہ ہیں کی مدد اور اسلم سحر وارثی صاحب بھیڑا یونی وار دو کے شاعر گرامی مرحوم جان نثار اختر کے نبیرۂ عزیزی دبیر احمد صاحب کا مسلسل

تعاون اگر میرے شاملِ حال نہ ہوتا تو شاید یہ مرحلہ اتنی جلد تکمیل کے مراحل طے کرنے سے قاصر رہتا میں ان حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہٗ ان کے جذباتِ دست گیری کو مزید توفیق سے نوازے۔ آمین،

حیدر جمیل الرضوی

مرادآباد مورخہ یکم مئی ۱۹۸۹ء
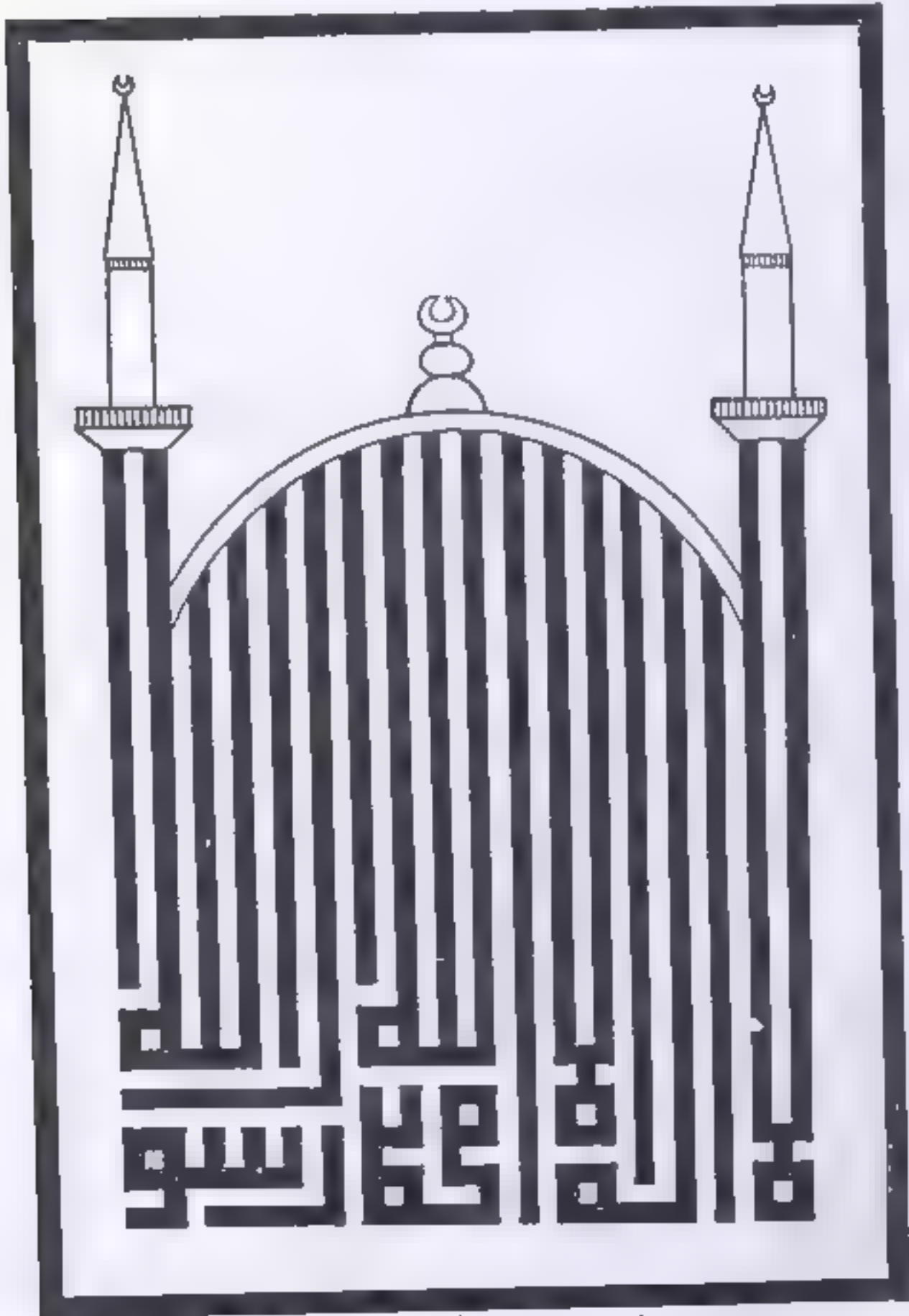
لا الٰہ الا اللہ مُحمّد رسُول اللہ - ترکی مساجد کی طرزِ تعمیر کے مطابق معماری کوفی خط -

لوح اخبار نجم عام مراد آباد ۸ ربیون سنہ ۱۹۰۳ء (پہلا پرچہ)

بانیِ مُخبرِ عالم

الحاج قاضی سیّد محمد عبد العلی عآبد رضوی

مخبرِ عالم کا مسلکِ حق گوئی

مخبر عالم ہفتہ وار ۸ جون ۱۹۰۳ء کو شیدی سرائے مراد آباد سے جلوہ افروز ہوا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ قاضی سید عبدالعلی عابدؔ مراد آبادی اس کے ایڈیٹر تھے۔ سالانہ چندہ تین روپے بارہ آنے تھا۔ مخبر عالم پریس مراد آباد میں چھپتا تھا۔

مخبر عالم جاری کرنے کی کیا غرض تھی۔ اس نے اپنے شمارے ۸ جون ۱۹۰۳ء میں "مخبر عالم کی ضرورت" کے عنوان کے تحت روشنی ڈالی ہے۔

"ہر نئے اخبار کے لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی شانِ نزول کی آپ ہی شرح کرے اور پبلک پر ظاہر کرے کہ یہ اس کا تازہ مہمان اپنے ساتھ کیا کیا خیر و برکت لے کر آیا ہے اور اس کا وجود ملک کے لئے کہاں تک فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔"

اس سوال کے جواب پر علی العموم ہر نوشیدہ اخبار یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ پرچہ نہایت آزادی کے ساتھ ملک کی ضروریات گورنمنٹ تک پہونچائے گا اور سرکاری خیر خواہی سے ہر ملکی قومی معاملات پر نکتہ چینی کرے گا۔ تازہ تازہ خبریں نئے نئے واقعات علمی و اخلاقی مضامین لکھے جائیں گے۔ ملکی ضرورتوں کا خیال ملحوظ رہے گا۔ لیکن ہرگز یہ بیان پورے طور پر اپنے وعدہ کی پابندی نہیں کرتا اور اردو اخبارات خود مدح و ذم اور تو تو میں میں کی بدولت عام طور پر بدنام ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اکثر خود غرض ایڈیٹروں کی وجہ سے اردو اخبارات پر اس الزام کا عام دھبہ لگ چکا ہے لیکن پھر بھی بہت سے اردو اخبارات اپنے رنگ ڈھنگ میں نرالے اور اینگلو انڈین اخبارات سے بہت اچھی پالیسی رکھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اردو اخبارات میں ہمارے مراد آبادی اخبارات کو بدنامی کا بہت زیادہ حصہ مل چکا۔ جس کی خاص کر وجہ یہ ہے کہ جامع العلوم جیسے منھ زور پرچے نے رام پور و لنبھورہ دو دیسی ریاستوں کی مخالفت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا

پھانا تھا اس پر وہ قانونی شکنجہ میں کسا گیا۔ اس مقدمہ میں جو عدالت جنٹ مجسٹریٹی سے فیصلہ صادر کیا گیا اس میں بہ تخصیص کل اخبارات کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا تھا۔ مشہور ہے کہ بڑوں کی بڑی بات ہوتی ہے لہٰذا یہی فیصلہ عام اخبارات کو سرٹی فیکٹ بدنامی دے گا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ ایک ایسا ہی آزاد پرچہ نکالا جائے جو نیک نیتی کے ساتھ ہر ملکی ضرورتوں کو گورنمنٹ پر اظہار کرے اور اپنے جائز حقوق چاہے اور کسی غیر ضابطہ دباؤ اور تحکم پر خوشامد کا ترانہ نہ گائے۔ نہ اپنے نفس پروری کے لئے ہجو و تعریف کا طومار لگایا کرے بلکہ آزادی کے ساتھ ہر ملکی و مالی، فوجی، زراعتی، صنعتی و قومی مضامین لکھے اور ملک و گورنمنٹ کو عموماً و خصوصاً توجہ دلائے۔ انشاء اللہ یہ ساری چیزیں آپ کو مخبر عالم میں میسر آئیں گی۔''

''قدردان ناظرین سمجھ لیں گے کہ یہی طرز تحریر اس سے ایک ہفتہ پہلے جین الاخبار میں موجود تھی مگر اس کی بنیاد ہی جب بدنامی بن چکی تھی تو کب طوطی کی آواز نقار خانہ میں کام دے سکتی ہے نیز اس کی بک ایجنسی کی چھپن آسن وکوک شاستر وغیرہ کی خوبیاں اور سونے میں سہاگا بن گئی تھیں، جو ایک خودغرضی کا نتیجہ تھیں اور اسی نے میرے ذاتی کارخانہ و تمام قیمتی سامان کو بے ترتیب کر دیا ہے۔ لیکن جس شخص نے اپنے آقائے نعمت سے نمک حلالی نہ کی ہو وہ کب کسی دوست سے وفا کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ ایک دوسرا مضمون ہے جس میں کئی اصلی واقعات کا اظہار ہونا مناسب نہیں ہے اس لئے ان واقعات کو کسی آئندہ پرچہ میں انشاء اللہ تعالیٰ ظاہر کیا جائے گا۔''

''اس وقت صرف یہی کہدینا مناسب ہے کہ مخبر عالم ہرگز اس خیال و پالیسی کا پرچہ نہ بنے گا جس کی وجہ سے اردو اخبارات بدنام ہوتے ہیں۔ بلکہ مخبر عالم آزادی و راست نگاری کو اپنی سپر بنا کر بلاخوف و خطر ملکی خدمت گذار ثابت ہوگا اور یقیناً حضرات ملک اس کی قدردانی فرمائیں گے۔''

مخبر عالم مرادآباد کے پہلے پرچے سے ہی شہرت ہونی شروع ہو گئی تھی۔ نوجوان بچے کے اٹھان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ چنانچہ نظام الملک ۲۴ جون ۱۸۹۰ء کے شمارے میں اس اخبار پر یہ ریویو چھپا تھا۔

''اخبار مخبر عالم جس کے مالک و ایڈیٹر قاضی عبدالعلی صاحب ہیں۔ ۸ جون ۱۸۹۰ء سے مرادآباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ قاضی صاحب کی خداداد لیاقت کا اندازہ

اس اخبار کو دیکھنے سے بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے ملک و قوم کے فائدے کا اسی اخبار سے بیڑہ اٹھایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ملک اس کی قدردانی کر کے قاضی صاحب کی ہمت بڑھائے گا۔ یہ وہی قاضی عبدالعلی صاحب ہیں جن کے ہاتھوں ابھی ابھی عین الاخبار نکلتا تھا اور عین الاخبار کی روز افزوں ترقی قاضی صاحب کی لیاقت کا نمونہ ہے۔"

دوسرے مہینے روہیل کھنڈ گزٹ مراد آباد نے ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء کے پرچے میں مخبر عالم مراد آباد پر حسب ذیل تبصرہ کیا تھا۔

"مخبر عالم ایک عمدہ اخبار ہے جو حال میں مراد آباد سے جاری ہوا ہے۔ قاضی عبدالعلی عابدؔ اس اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ جن کے والد قاضی جمشید علی صاحب مالک جام جمشید مراد آباد کے پرانے اخبار نویس تھے۔ عابدؔ صاحب ایک شوخ طبیعت، رنگین خیال آدمی ہیں۔ بچپن سے اخبار نویسی کی گود میں پلے ہیں۔ پھڑکتے ہوئے مضامین بناتے ان کی عمر گذر گئی۔ عرصہ دراز تک گھر کے اخباروں میں لکھتے پڑھتے رہے۔ پھر عین الاخبار کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسی میں جادو نگاری اور انشا پردازی کے جوہر دکھائے۔ جن کو عین الاخبار سے دلچسپی ہوگی وہ مخبر عالم کو ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے۔ ایڈیٹر کی قابلیت اور تیز طبعی سے امید ہے کہ یہ اخبار پبلک کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔"

جب مخبر عالم کو جاری ہوئے سات مہینے گذر گئے اور دوسرا سال ۱۹۰۴ء لگ گیا تو یک مختصر سی مثنوی تہنیت سال نو از صفیؔ ریلوی اس کی کامیابی و ترقی کے لئے جنوری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

کدھر ہے تو اے ساقیٔ انجمن — نیا سال ہے لا شراب کہن
غم سے لگا میرے منہ سے شتاب — کہ برج حمل میں گیا آفتاب
بجھا اب تو کچھ دل کی بیسری لگی — کہ دن بڑھ چلا رات گھٹنے لگی
نیا سال لایا مضامین نو — رخ فکر پر باندھو آئین نو
سخن غازۂ روئے زیبا ہوا — طبیعت کا جوبن ہے امڈا ہوا
وہ فرخندہ سال اب ہوا آشکار — کہ جس کا مہینوں سے تھا انتظار
مگر نزد طبع سخن آفریں — ابھی رات اور دن برابر نہیں
یہ مصرعے ہیں چھوٹے بڑے آجکل — ولا دیکھیوں مثل بیت الغزل
سخنور کو بھاتا ہے مضموں نیا — نئے سال سے کیوں میں خوش ہو گیا

مگر ہے خوشی آغازِ سالِ نو ۔۔۔ ترقی مخبر کی ہے فالِ نو

عجب دلبری طرفہ جاں پروری ۔۔۔ دلہن بن کے آ بیٹھے جیسے پری

اشاعت کا اس کے ہے کچھ ڈھب نیا ۔۔۔ یہ اخبار جب دیکھئے تب نیا

ابھی اشاعت ہو اس کی کثیر ۔۔۔ رہے کارخانہ ترقی پذیر

عیاں روز ہو عیش کی فالِ نو ۔۔۔ نشاط و طرب میں کٹے سالِ نو

کہیں جائے خالی نہ یہ آرزو
دعا ہے مفتی کی رہے آبرو

یہ وہ دور تھا جب کہ ہندوستان کے اکثر اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر ریاستوں کے چکر لگاتے تھے اور درباروں میں حاضری دینے کو معراج سمجھتے تھے۔ وہاں کی آمدنی پر ہی اخبارات و رسائل کی آمدنی کا دار و مدار تھا لیکن مخبر عالم درباری داری سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا تھا، پیسہ اخبار نے الزام لگایا کہ مراد آباد کے اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر دربار اور میں حاضر ہوئے اور دس دس پچاس پچاس روپے لے کر آئے۔ اس کا جواب ۶ / جنوری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں مخبر عالم نے حسبِ ذیل دیا۔

"چند موقع پر دیکھا گیا کہ ہم عصر پیسہ اخبار خواہ مخواہ ایڈیٹران اخبارات مراد آباد پر چوٹ کر جاتا ہے اور اپنے وہ خیالات جو اپنے پنجابی ایڈیٹران کی نسبت ظاہر کرنا چاہیں مراد آباد سے بھی منسوب کر جاتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ ہفتہ میں پیسہ اخبار روزانہ اور ہفتہ وار دونوں میں لکھا گیا ہے کہ منجملہ دیگر مقامات کے مراد آباد کے ایڈیٹران بھی بموقعہ تخت نشینی مہاراجہ اور گئے ہوئے تھے۔ جہاں مصنوعی ایڈیٹران کی جانچ پڑتال ہوئی اور بعض کو دس دس روپے دیئے گئے اور چند کو پچاس پچاس روپے کا عطیہ مرحمت ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ مراد آباد کا کوئی ایڈیٹر اخبار اس موقعہ پر نہیں گیا اور نہ بلا کسی خاص تعلق و طلبی بجز ایک ہندو برہمن کے جس کا یہ قومی پیشہ ہے کوئی نہیں جاتا ہے اور اس موقعہ پر تو ہم عصر صادق الاخبار ریواڑی نے تمام ایڈیٹران کی فہرست لکھ دی ہے کہ فلاں فلاں بزرگوار اس تخت نشینی اور میں شریک ہوئے۔ چنانچہ ہم بھی ذیل میں وہ فہرست لکھ کر ہم عصر کو دکھاتے ہیں کہ اس میں بجز پنجاب کے اور کہاں کے ایڈیٹر زیادہ ہیں اور کہاں کہاں کے مصنوعی ایڈیٹر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میرٹھ کے بھی چند صاحب اسی درجہ اور رتبہ کے شامل ہیں جیسے کہ پنجاب کے۔ لیکن کثرت زندہ دلانِ پنجاب ہی کی ہے۔

۱۔ منشی نثار علی شہرت ایڈیٹر روزنامہ لاہور
۲۔ نواب مرزا ایڈیٹر دہلی گزیٹ دہلی
۳۔ چرن دین ایڈیٹر رفیق ہند پنجاب
۴۔ بدرالدین ایڈیٹر آفتاب ہند پنجاب
۵۔ ایڈیٹر پنجاب پتریکا لاہور۔
۶۔ حافظ عبدالقادر ایڈیٹر الملک ہاپوڑ، میرٹھ
۷۔ ثابت علی ایڈیٹر ظریف الہند میرٹھ
۸۔ محمد امتیاز احمد وقار خانی ایڈیٹر وارث الاخبار میرٹھ

یہ بزرگوار تحقیقات کونسل سے ایڈیٹران اخبارات ثابت نہیں ہوئے اور دس دس روپے کے بھاری عطیہ کے ساتھ رخصت کئے گئے اور مندرجہ ذیل ایڈیٹر صاحبان تحقیقات سے صاحب اخبار ثابت ہو گئے۔ لہٰذا ۵۰۔۵۰ روپے انعام دیا گیا۔

۱۔ میر حسن صاحب مالک خیر خواہ عالم دہلی
۲۔ شیخ گلزار محمد صاحب ایڈیٹر گلزار ہند لاہور
۳۔ عبدالرحمان ایڈیٹر پنچ لاہور
۴۔ منشی جہان آرائن خیر خواہ ہند دہلی
۵۔ محمد فاضل صاحب ایڈیٹر مخبر ہند اشرف الاخبار۔ دہلی
۶۔ ظہور الحسنین ایڈیٹر قومی رفیق دہلی
۷۔ محمد دین مالک دارالعلوم۔ دہلی

لیکن ان منتخب اخبارات میں اشرف الاخبار تو عرصہ ہوا عدم آباد کو رخصت ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس کے مالک کی یہ عزت باقی ہے کہ اس کے وارثوں کو برابر حق پہونچتا رہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا ہم عصر پیسہ اخبار بلاتحقیق ایسے الزام سے ایڈیٹران اخبارات مراد آباد کو معاف فرمائیں گے جس کے لئے ہم پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ایڈیٹر مخبر عالم یوروپین حضرات کی قدر کرتے تھے اور بلاوجہ مخالفت کرنے سے پرہیز کرتے تھے لیکن جب قوم و ملک کے مفاد کا سوال آتا تھا تو وہ ان حضرات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج پر یورپین حضرات چھائے ہوئے تھے۔ اسٹاف میں ان کی کثرت تھی ٹرسٹیز ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یورپین

سٹاف اپنی من مانی کرتا تھا جس کی وجہ سے علی گڑھ مسلم کالج میں ہنگامہ ہوا اور کالج بند ہوا۔ اس وقت ایڈیٹر مخبر عالم نے ۸ مارچ ۱۹۰۷ء کے شمارے میں "علی گڑھ کالج کا قیامت خیز ہنگامہ" کے عنوان کے تحت اداریہ تحریر کیا۔

"یہ ہنگامہ ابھی تک ختم ہوا نہ آسانی کے ساتھ جلد ختم ہوتا معلوم ہوتا ہے کیونکہ پرنسپل صاحب کالج اور یورپین اسٹاف اس امر پر اڑ رہا ہے کہ تمام سرغنہ طلبہ فوراً خارج کیے جائیں جن کی تعداد سات آٹھ تک ہے۔ سب ٹرسٹیز وہ کسی طرح پرنسپل کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے کیونکہ ایسے معاملات میں بڑا حصہ ٹرسٹیان کا یک رائے پر متفق ہونا چاہیے جو موجودہ بے پرواہی کی وجہ سے محض ناممکن ہے اور اگر کاش ایسا ہو بھی تو پھر ٹرسٹیز کی رائے گورنمنٹ کی منظوری میں جاکر مقبولیت کا جامہ پہن کر، وقتیکہ واپس نہ آئے دشوار ہے اور اس طولِ عمل سے اس وقت غالباً ٹرسٹیز کو خود اعتراف ہوگا کہ وہ اپنی قوت آپ برباد کر چکے ہیں۔ گو اس قیامت خیز ہنگامہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بٹھایا گیا ہے جس میں نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین صاحب، مولوی نظام الدین حسن صاحب، مولوی عبداللہ خاں صاحب وکیل، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر، شیخ عبداللہ صاحب، نواب محسن الملک بہادر، مسٹر آرچبولڈ، میونسپل ممبران کمیشن ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کالج کے وہ تمام اندرونی معاملات جو اب تک پردہ میں دبے ہیں اس ذریعہ سے روشنی میں لائے جائیں گے۔ اور مشہور ہے کہ کالج کے ہر ایک کلاس سے تین تین طلبہ کے باقاعدہ اظہار قلم بند کیے جائیں گے اور ان لڑکوں کو صاف صاف طور پر تمام شکایات واپس لینا ہوں گی۔ لیکن اس موقعہ پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اس حالت میں نواب محسن الملک بہادر، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، شیخ عبداللہ، مسٹر آرچبولڈ پرنسپل بوجہ قیام علی گڑھ براہ راست کالج کے ایڈمنسٹریشن کے ذمہ دار خیال کیے جاسکتے ہیں تو کب ممکن ہے کہ ایک مجرم خود جج بن کر اپنے افعال و معاملات کی تحقیقات کرے اور نتیجہ نیک نکلے۔ ضرور ہے کہ ہر ہر طالب علم منہ پر شکایت کرنے سے رکے یا کسی وجہ سے روکا جائے اس لیے ہرگز یہ کمیشن کار آمد ثابت ہونے والا نظر نہیں آتا۔ ہاں اگر پرانے طلبہ کے ساتھ کچھ اہل الرائے کو بھی یہ کمیشن شامل کرے تو ضرور کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے ورنہ نائیں نائیں فش۔ افسوس ہے کہ قومی کالج، قومی سرمایہ سے سب تنخواہیں پائیں اور قوم ہی پر حکومت ناجائز و بے جا دباؤ ڈالے طلبہ کم بخت کو ایسی حالت میں کہ امتحان بہت قریب ہے، خواہ مخواہ خارج کرنے پر ضد پیدا کی جائے اور ان کی آئندہ زندگی برباد کرنے کی اس درجہ کوشش کی جاوے گی کہ بذریعہ اعلان عام طور پر مشتہر کیا جاوے

کہ وہ طلبہ جو بانی فساد ہیں ہم ان کے قصور ہرگز معاف نہیں کر سکتے۔ تعجب ہے کہ یورپین اسٹاف کی سرزوری پر لحاظ نہ کیا جائے اور طلبہ کی شورش کی عام شکایت کی جائے۔ یورپین استادوں کو ترقیوں پر ترقیاں دی جائیں۔ انگریزی تو انگریزی عربی کے واسطے بھی ولایت سے ہی پروفیسر بلوائے جائیں اور مسلمان جن کا علم عربی ایک قومی علم ہے اس خدمت سے محروم رہیں اور خود اسلامی کالج ہی مسلمانوں کو ناقابل سمجھے۔ بہت بہتر ہوا کہ ایک غیر متعلق واقعہ کے اندر اس موقعہ پر یہ بحث بھی چھڑ گئی ورنہ کیا تعجب تھا کہ کسی پادری کو اسلامی وعظ و تلاوت قرآن کے واسطے یہ کالج ولایت سے بلوا کر رکھ لیتا۔ کیونکہ در اصل یہاں کے تمام طلبہ کو اب تنگ زبانی آداب و اسلامی اصول سکھایا جاتا ہے اور جہاں تنگ خیال جاتا ہے یہ قومی کالج دنیا کے لئے زیادہ تر مسلمان طلبہ تیار کرتا ہے۔ کاش اس کی بنیاد میں جو پہلے سے خرابی مضمر ہے وہ دور ہو جاتی تو کیوں آج یہ روزِ بد پیش آتا اور اس وقت کی خرابی کو وہ اسلامی آداب آناً فاناً میں روک دیتا۔ ہمیں خوب یاد ہے جب مسٹر محمود کو کالج و معاملات کالج میں افسردہ دل اور ناکام ہونا پڑا تو اس جلسۂ ٹرسٹیز سے یہ مصرعہ پڑھ کر اٹھ گئے تھے۔ ع

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اُس وقت تو اس مصرعہ کا مضمون کچھ بے موقعہ و بے محل سمجھا گیا تھا مگر اب پندرہ بیس برس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ مصرعہ اس وقت کے لئے پیش گوئی تھا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کالج بند ہے۔ کچھ طلبہ اس اسلامی قلعہ میں اپنے اپنے کمرے بند کئے پڑے ہیں، کچھ چل دیئے، کالج کی طرف سے بھی تعطیل محرم کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ٹرسٹیز کچھ تو بے خبر ہیں کچھ دوڑتے پھرتے ہیں۔ سکریٹری صاحب یورپین اسٹاف کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ کیونکہ زمانے نے آپ کو پورا تجربہ کرا دیا ہے کہ اس گروہ کے خلاف رائے ہو کر کوئی اعزاز حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے کہ ملک کے وہ سربرآوردہ اہل قوم جنہوں نے اس کالج کو ہمیشہ امدادیں دی ہیں اس طرف جلد متوجہ ہوں اور اس خرابی کا قرار واقعی طور پر انسداد فرمائیں اور اس شورش انگیز خیال کو طرفین سے دفع کرا دیں اور بہتر ہو کہ گذشتہ را صلوٰۃ کہہ کر طلبہ کے تمام قصور معاف کرا دیں اور یورپین اسٹاف کو اپنی ہٹ کے واپس لینے پر سمجھائیں۔"

ایڈیٹر مخبر عالم جن کا مسلک حق گوئی تھا کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے وہ ہندو مسلم اتحاد کو قوم و ملک کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور جو قومی لیڈر ملک و قوم کے لئے بے لوث خدمات انجام دیتا تھا اور قربانی کرنے سے دریغ نہ

کرتا تھا۔ اس کی توقیر کرتے تھے۔ مسٹر گوکھلے نے جب کچھ مقامات کا دورہ کیا اور لوگوں نے ان کی قدر و منزلت کی تو ایڈیٹر مخبر عالم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے ۳۰ مارچ ۱۹۰۷ء کے شمارے میں مسرت کے ساتھ روشنی ڈالی۔

"اینگلو انڈین اخبارات اس بات سے مضطرب ہو رہے ہیں کہ ہندوستان جدید میں ایک عام قومیت کا احساس پھیلنے کا احتمال ہے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں اور فرقوں کے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم ہوتے دیکھ کر ان کے پیٹ میں پانی ہو رہا ہے اس طریق عمل سے ان کے حواس باختہ ہوتے جاتے ہیں۔ شمالی ہند کے ہندو و مسلمانوں نے جس دھوم دھام سے آنریبل گوپال کرشن گوکھلے کا صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں استقبال کیا ہے اس سے اینگلو انڈین اخباروں کے قوائے دماغی پر رعشہ پڑ گیا ہے۔ ان کو ہندوستان کے پولیٹکل فلک پر خطرناک سیاہ بادل نظر آرہے ہیں جو ان کے تصور کی تصویروں کے مطابق تمام ہندوستان کو طوفان نوح میں ڈبو دیں گے۔ اخبار "انگلش مین" جو ٹوری اکر حکومت کر دو پالیسی کا وکیل ہے، حسب ذیل لکھتا ہے:۔

"سب سے اس مسئلہ کی بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک صوبہ یا حصہ بھی اس اسپرٹ سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ مرہٹوں اور بنگالیوں کی مثال کے سامنے سکھوں، راجپوتوں اور گورکھوں کی بے وقری کو معدوم کرتی جاتی ہے۔ لکھنؤ کلکتہ کا سواد شہر بن جاتا ہے، ہندوستان ایک ہی دنظر آتا ہے۔" اور یہ اندیشہ انگلش مین کا فضول نہیں ہے۔ تمام ہندوستان میں جوش پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ یک حصہ ملک کا دوسرے صوبہ سے اس کی تکلیفوں میں ہمدردی کرتا ہے اور اس قسم کا درد محسوس کرتا ہے۔ یک صوبہ دوسرے صوبہ کی خوشیوں میں حصہ لیتا ہے۔ قومی ہلچل زمانے کے آثار کے مطابق ہے۔ شمالی ہند کے جن شہروں سے مرہٹے لیڈر مسٹر گوکھلے کا گذر ہوا ہر گروہ کے لوگوں نے دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا۔ علی گڑھ کے کنزرویٹو پروفیسروں اور طلبہ نے مسٹر گوکھلے کو مدعو کرکے ان کی تقریر کو توجہ سے سنا۔ امرتسر، لاہور، میرٹھ اور دیگر تاریخی شہروں میں ان کی گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے ہر طبقہ کے لوگ ان کی گاڑی کو کندھا دینا باعث فخر سمجھتے تھے۔ در مادر ہند کے دو بیٹوں ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق تقریریں انھوں نے کیں ان کو انھوں نے گہری توجہ سے سنا اس کا کیا سبب ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان اتحاد کے خیالات پھیلتے جاتے ہیں۔ ان آثار سے ہماری خود پسند اور جابر حکام کی آنکھیں کھلنی چاہئیں۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل کارتوسوں میں سور کی چربی اور گائے کی چربی لگانے کا پروپگنڈہ کیا گیا تھا جو صحیح تھا۔ اسی طرح سودیشی تحریک کے دوران بھی ولایتی بسکٹوں کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں سور کی چربی کی آمیزش ہے یہ خبر جب مئی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں چھاپی گئی تو مخبر عالم کے ایڈیٹر نے صحیح مشورہ دیا۔

"غیر ممالک کے بعض مسلمانوں نے مسٹر عبداللہ کوئیلیم سے دریافت کیا کہ باہر کے مشہور ولایتی بسکٹوں میں سور کی چربی کی آمیزش بتلائی جاتی ہے۔ یہ امر کہاں تک درست ہے تحقیق کر کے لکھیں۔ اس پر مسٹر ہنٹلے اینڈ پامرز کو خط برائے دریافت حال لکھا۔ جس میں یہ بھی لکھا کہ اگر آپ براہ مہربانی مجھے اس امر کی اجازت دیں کہ بسکٹ تیار ہونے کی کارروائی بچشم خود ملاحظہ کر سکوں تو آپ کے اور آپ کے مسلمان خریداروں کے لئے زیادہ مفید ہوگا کیونکہ اس صورت میں خود اس امر کی تصدیق کر سکوں گا کہ یہ بسکٹ ہر قسم کی ممنوعہ اشیاء کی آمیزش سے پاک ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوا ہے وہ بالکل ناقابل اطمینان ہے۔ انھوں نے یہ تو اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ ان بسکٹوں میں سور کی چربی پڑتی ہے یا نہیں اور نہ مسٹر کوئیلیم کو بسکٹ تیار ہونے کی کارروائی ملاحظہ کرنے کی اجازت دی، صرف اس قدر گول مول لکھ کر ٹال دیا کہ ان کی ساخت میں نہایت خالص اور بہترین اشیاء کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے اجزاء سے مطلع کرنا اصول تجارت کے خلاف اور ہمارے عظیم نقصان کا باعث ہے۔ مسٹر کوئیلیم اپنے نامہ نگار کو مطلع کرتے ہیں کہ اندریں حالات وہ انھیں بسکٹوں کے استعمال کرنے کی صلاح نہیں دے سکتے۔

"سوال صرف یہ تھا کہ بسکٹوں میں سور کی چربی پڑتی ہے؟ جس کے جواب میں انھوں نے محض دفع الوقتی سے کام لیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اگر سور کی چربی ان بسکٹوں کا جز نہ ہوتا تو وہ فوراً اس کی تردید کرتے غیر متعلقہ امور کی پناہ نہ ڈھونڈتے۔ ہم بھی مسٹر کوئیلیم کی رائے کی بڑی زور کی تائید کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تاکید کرتے ہیں کہ جب تک ان بسکٹوں کے اجزاء کے متعلق اطمینان نہ ہو اس وقت تک ان کے استعمال سے بالکل محترز رہیں۔"

ہندوستان میں رہنے والے کچھ انگریز بھی معقول تھے جو حب الوطنی کے جذبہ سے واقف تھے۔ ایک ہندوستانی نے کسی سرکاری دفتر میں ملازمت کی درخواست دی اور اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ میں سودیشی تحریک کا مخالف ہوں وہاں کے کسی افسر نے یہ فقرہ پڑھ کر یہ کہہ کر کہ "تم ملکی نمک حرام ہو" ملازمت سے جواب دے دیا۔ یہ خبر اسی مذکورہ شمارہ مئی ۱۹۰۸ء

میں چھپی ہے۔

"یک بنگالی نوجوان نے کسی سرکاری دفتر میں چند روز ہوئے نوکری کے لئے عرضی دی تھی جس میں اپنی صفات کے ساتھ یہ فقرہ بھی ٹانک ڈالا کہ میں سودیشی تحریک کا مخالف ہوں' اس کا خیال تھا کہ انگریز افسر اس خوشامد سے خوش ہوگا اور اسے ضرور بالضرور ہی وہ اپنے زیر سایہ لے لیگا۔ لیکن صاحب نے اس کو جو جواب دیا وہ اس کی حب الوطنی کا ثبوت ہے۔ صاحب نے اس کی عرضی پر لکھدیا "میرے پاس تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ تم ملکی نمک حرام ہو۔"

انگریز حکمراں طبقہ کا جبر و استبداد

اور

اس کا امتیازی سلوک

انگریزی دورِ حکومت میں ہندوستان میں کالے و گورے کے ساتھ آسمان و زمین کا امتیاز برتا جارہا تھا۔ گورے یورپین کے سامنے کالے ہندوستانی کی جی بھر کے بے عزتی کی جاتی تھی اور ان کو اذیتیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مخبر عالم مرادآباد ایسی خبروں کو اپنی رائے کے ساتھ شائع کرتا تھا اور ان کی مذمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔

"ایک یورپین گورا جعلی چیک بناکر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ عدالت میں مقدمہ کیا گیا۔ اس نے ایک روز کی سزا دے کر بری کر دیا۔"

یہ خبر مخبر عالم میں ۳۰ جون ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"ایک اخبار لکھتا ہے کہ مسٹر ولیم کرانٹن ایک یورپین صاحب بہادر چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ کے اجلاس میں اس جرم میں پیش ہوئے کہ انھوں نے پروپرائٹر گرینڈ ہوٹل کو فریب دینے کی نیت سے کمرشل بینک لاہور کے نام اسی روپے کا چیک لکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب بہادر نے لاہور میں بھی یہی جرم کیا تھا۔ جس کی تحقیقات درپیش ہے۔ گو صاحب بہادر نے مجسٹریٹ صاحب سے اقرار جرم کیا ہے لیکن ہم تو جھوٹ سمجھتے ہیں۔ شاید صاحب بہادر نے دل لگی کی ہوگی اور ہوٹل والے کو چھیڑنے کے لئے یہ مذاق کیا ہوگا جب ہی لائق پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے کوئی جرم قائم نہیں کیا اور دو سو روپے کی ضمانت پر چھوڑ دیا۔ بس حاضری عدالت کی کیا تھوڑی سزا ہے۔"

انگریزی حکومت ہندوستانیوں کو ذلیل وخوار کرنے کے ساتھ ان کی اقتصادی حالت بھی اچھی نہیں رکھنا چاہتی تھی اور انگریزوں کی اقتصادی حالت اچھی بنانے کی فکر میں لگی رہتی تھی۔ تنخواہوں میں بھی کافی فرق تھا۔ انگریزی ملازموں کی دگنی تنخواہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ریلوے کے ملازمین، فورمین اور ڈرائیور کی انگریزی اور ہندوستانی تنخواہوں میں کافی فرق تھا۔ جیسے مخبر عالم مرادآباد مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۰۳ء میں "کالے آدمی ملازمان ریل" کے عنوان کے تحت اس امتیاز پر روشنی ڈالی ہے

" ہم مسٹر وکیل نے جو اخبار یونین پیڈ منسٹر کے جو حال غریب دیسی ملازمان ریلوے کے لکھے ہیں ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ خدمت نے آخر ان غریب دیسیوں کا کیا حشر ہوگا۔ گزٹی عہدوں سے دوسرے درجہ پر فورمین ہیں جن کی تنخواہ ایک سو پچیس سے تین سو روپے ماہوار تک ہوتی ہے اور ینز یہ فورمین علی ترتیب گزٹی عہدوں پر بھیجے جا سکتے ہیں۔ مگر ہم نہایت افسوس سے لکھتے ہیں کہ ایک بھی ہندوستانی کسی گزٹی عہدہ پر نظر نہیں آتا۔ فورمینوں کے نیچے، انسپکٹر ہیں جن کی تنخواہ ایک سو دس سے لے کر دو سو بیس تک ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے نہ کوئی اسسٹنٹ فورمین اور نہ کوئی انسپکٹر دیسی ہے۔ اگرچہ شپ یارڈ کے پاس کر دہ بہت سے دیسی ایسے مل سکتے ہیں جو یہ دونوں کام بخوبی سر انجام کر سکیں۔ مگر ان کا دیسی ہونا ہی ان کے لئے باعث نفرت سمجھا گیا۔ مزید براں بہت سی ایسی آسامیاں ہیں جن پر یورپین اور دیسی برابر مامور ہیں مگر ان کی تنخواہوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

		سال اوّل	سال دوم	سال سوم
جونیئر فورمین	یورپین	تیس روپے	چالیس روپے	پچاس روپے
	دیسی	آٹھ روپے	نو روپے	دس روپے
سینیئر فورمین	یورپین	ساٹھ روپے	ستر روپے	
	دیسی	گیارہ روپے	تیرہ تا پندرہ روپے	
شنٹر	یورپین	نوّے روپے	سو روپے	
	دیسی	تیرہ روپے	اٹھارہ سے انیس روپے تک	
ڈرائیور	یورپین	ایک سو دس سے ایک سو نوّے تک		
	دیسی	بارہ روپے سے ۳۵ روپے تک		

مزید براں انگریز یورپین ڈرائیور کو پورے چار سال تک دو سو روپے ماہوار پانے کے بعد ایک سو دس روپے اور نو سال کی ملازمت کے بعد دو سو دس روپے ملتے ہیں اور دیسیوں کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ہندوستانیوں کو وہی فرائض منصبی ادا کرنے پڑتے ہیں جو یورپین صاحبان کو، بلکہ دیسی ہونے کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں زیادہ خیال کی جاتی ہیں پھر بھی تنخواہ کا یہ حال ہے کہ بمشکل چوتھائی ہے۔ علاوہ براں یورپین ڈرائیوروں کی کارگذاری یومیہ آٹھ گھنٹے ہے اور دیسیوں کی دس گھنٹے اور شرح الاؤنس گورے صاحبان کی

نسبت تقریباً تہائی کے حساب سے دیا جاتا ہے۔ یورپین ڈرائیوروں سے نکل کر اسسٹنٹ فورمین یا فورمین ہو جاتے ہیں اور دیسی بے چاروں کی معراج وہی ڈرائیوری ہے اور بس۔ گاڑیوں کے محکمے میں انگریز فورمین فرٹر کو ایک سو دس یا ایک سو بیس روپے شروع میں ملتے ہیں اور غریب دیسی کو بمشکل بیس روپے سے شروع کر کے ترقی کرتے ہیں اور ان میں وہ بڑے ہی خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں جن کو مرنے سے پہلے ۳۵ روپے مل جائیں۔

اس ہمعصر نے نہایت ہی افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ پہلے ہی سے جب دیسیوں کی یہ درگت ہے تو دہلی کانفرنس کرنے کرانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ نہ ان غریبوں کی اصلاح ہوگی نہ غریبوں کی دادرسی۔ ؎

رقیبوں سے ملا کر مجھ کو دیکھو　　تفاوت ہے زمین و آسماں کا

انگریزی حکومت طرح طرح سے ہندوستانیوں کو پریشان کرتی تھی اور ایسے قانون نافذ اور سرکلر جاری کرتی تھی جس سے ہندوستانی پریشان ہوں۔ چنانچہ یوپی کے محکمۂ تعلیم نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی منشا پر ایک ایسا سرکلر نافذ کیا کہ اگر کوئی طالب علم ابتدائی تعلیم یوپی کے علاوہ کسی دوسرے صوبہ میں پاچکا ہو تو اس کو یوپی کے کالجوں میں داخل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس سرکلر کی بھی مخالفت کی گئی جس میں پیش پیش مخبر عالم تھا۔ اس نے ۱۴ جولائی ۱۹۰۳ء کے شمارے میں "ہمارے سررشتۂ تعلیم کا نرالا سرکلر" کی سرخی لگا کر مخالفت میں لیڈنگ آرٹیکل تحریر کیا۔

"ہمارے ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ نے ایک عجیب و غریب سرکلر جاری کیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کا کوئی باشندہ جس نے کسی اور یونیورسٹی کا امتحان انٹرنس پاس کیا ہو صوبہ ہذا کے کسی کالج میں داخل نہ ہو سکے گا۔ گویا وہ شخص جس نے الٰہ آباد یونیورسٹی کا امتحان انٹرنس پاس نہ کیا ہو صوبہ ہذا کے کسی کالج میں داخل نہ ہو سکے گا ان دونوں حالتوں میں ملک کو عام طور پر نقصان کا سامنا ہے۔ بہت سے روزگار پیشہ حضرات صوبہ ہائے غیر میں اپنی اولاد کو تعلیم دلا رہے ہیں۔ جہاں وہ انٹرنس پاس کرتے ہیں اور پھر صوبہ ہذا کے محمڈن کالج علی گڑھ یا کسی دوسرے کالج میں وہ اپنے والدین کے ہمراہ آکر داخل ہو جاتے ہیں۔ اب اس سرکلر سے ان پر یہ اثر پڑ سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ پردیس ہی میں سلسلۂ تعلیم قائم رکھیں اور ان کے والدین اپنے وطن کو واپس ہو جائیں مگر وہ کم بخت ہمیشہ غریب الوطنی کا مزہ اٹھاتے رہیں اور کبھی ان کو اپنے صوبہ کا کالج دیکھنا نصیب نہ ہو یا وہ وطن میں آکر تعلیم کو خیر باد کہہ دیں۔ رہا دوسرا حکم۔ اگر وہ صحیح ہے تو اس سے محمڈن کالج علی گڑھ کو ایک بے اندازہ نقصان کا

سامنا کرنا پڑے گا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی موجودہ حالت دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے سرچند بلکہ چہار چند دیگر صوبہ جات کے طلباء داخل ہیں، اور صوبہ پنجاب و مدراس و برما و بمبئی ہر جگہ کے طالب علم انٹرنس پاس کر کے آتے ہیں اور داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سرکلر ان کے تعلیم آئندہ کا اب سدِ راہ ہو جائے گا اور اس سے کالج مذکور کو ایک غیر معمولی نقصان پہونچے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ڈائرکٹر صاحب نے یہ منصوبہ کیا یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی منظوری کے بعد مشتہر کیا ہے یا بطور خود یہ عجیب و غریب سرکلر نافذ فرمایا ہے جس نے دروازۂ علم ہی بند کر دینا چاہا ہے۔ اگر در اصل یہ سرکلر سنڈیکیٹ کی منشا کے موافق نافذ نہیں کیا گیا ہے تو تعجب ہے کہ کیوں سنڈیکیٹ نے ایسے ضروری امر میں انھیں اتنے بڑے اختیارات کے استعمال کا موقع دے دیا ہے۔ جس سے عام طور پر طالبان علم کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ٹرسٹیان علی گڑھ کالج اور دیگر کالجوں کی رایوں کو شریک کر کے اس انوکھے اور عجوبہ سرکلر کو منسوخ کرانے کی ضرور کوشش کریں گے کہ یہ نرالا حکم واپس لیا جائے۔ ملک بھی یقین ہے کہ اس سرکلر کی خرابیوں اور نقصانات کو جناب چانسلر صاحب یونیورسٹی کی خدمت میں اپیل پیش کرے گا تاکہ یہ ناحق کا بخار دور ہو۔"

ہندوستانی عوام انگریزوں کی حرکتوں سے بے حد جلا ہوا تھا یہی حالت صحافیوں کی تھی۔ انگریز کی ہر بری حرکت کا پروپگنڈہ کرتے تھے اور ان کے غیر مہذب ہونے کی قلعی کھولتے تھے۔ انگریزوں میں بیاہ شادی کے جو طور طریقے تھے مرد اپنی سے زیادہ عمر کی عورتوں سے شادی کرتے تھے اس کو ہندوستانی عوام اچھا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں اسی قسم کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ اس کو عرصے سے کر مخبر عالم نے ۱۶ جولائی ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔

"مردم شماری انگلستان کے نقشہ جات بابت ۱۹۰۱ء جو حال میں شائع ہوئے ہیں عورتوں کے حالات اور ترقی کے دلچسپ واقعات سے پر ہیں۔ نقشہ جات بیاہی ہوئی عورتوں کی مد میں جو اعداد درج کیئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے عجیب واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اس واقعہ پر کوئی مشکل سے یقین کرے گا کہ انگلستان میں اس وقت بیاہی ہوئی ۳۰ لڑکیاں ۱۵ سال کی ہیں اور ۹۲ لڑکیاں ۱۶ سال کی عمر کی ہیں۔ تمام انگلستان میں ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہے کہ نوجوان مرد اپنی سے عمر میں زیادہ کی بی بی پسند کرتے ہیں۔ ایک مرد نے جس کی عمر ۱۵ سال تھی ۱۱ سال کی عمر کی لڑکی سے شادی کی۔ ۱۱ سال کی عمر کے لڑکے نے ۲۵ برس کی عمر کی عورت کے ساتھ شادی کی۔ ایک لڑکا جس کی عمر ۱۸ سال کی ہے اس کی بیوی کی عمر ۵۰ سال کی ہے۔ ایک لڑکے کی عمر ۲۰ سال ہے لیکن اس کی بیوی صاحبہ کی عمر ۶۵ سال ہے لیکن جس وقت یہاں کے نوجوان ۲۰ سال کی عمر تک پہونچتے ہیں وہ ہم عمر بیوی پسند کرتے ہیں۔ پس نقشہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۸ لاکھ سے زائد خاوند و بیوی عمر میں درمیان ۲۱ اور ۳۰ کے ہیں۔ اور عملی طور پر ہم عمر ہی ہیں۔ بر وقت مردم شماری فی ۴۳ عورتوں کے شمار میں ایک عورت اپنے خاوند سے علیحدہ تھی اس کا باعث صرف یہ ہے کہ خاوند بوجہ کاروبار وغیرہ کے باہر گئے ہوئے تھے ۹ بیویاں اور ۴۳ بیوائیں ایسی ہیں جن کی عمر اس وقت سو برس کی ہے۔ ۱۰ مرد اور ۶ رنڈوے بھی سو سال کی عمر تک پہونچ گئے ہیں۔ اس وقت انگلستان میں بمقابلہ مردوں کے ۱۰ لاکھ ایسی عورتیں زائد ہیں جو اپنے کمسن بچوں کی جانب سے بالکل غافل ہیں اور انہیں کی جانب رجوع ہیں جو کچھ پیدا کرنے کے قابل ہیں۔ بدیں وجہ عورتوں کو محنت مزدوری کرنا لازم ہوتی ہے ۱۰، سال سے زائد عمر کی ہر ایک ۲۹ بن بیاہی عورتوں میں جو گھر کے باہر کام نہیں کرتی ہیں ۲۳ عورتوں کا ذریعہ بسر اوقات محنت مزدوری ہے۔ بیاہی ہوئی عورتوں میں منجملہ ۷ عورتوں کے ایک عورت اپنے خاوند سے علیحدہ بسر اوقات کے لئے روپیہ پیدا کرتی ہے اگر عورتوں کی

ملازمت کے نقشہ جات ۱۹۱۰ء اور ۵۰ سال اس طرف کے نقشہ جات کو باہم موازنہ
کیا جائے تو بہت کچھ تغیر نظر آئے گا۔"

۱۸۶۱ء میں متوسط درجہ کی عورتوں کے لئے بجز معلمی کے کسی دوسرے پیشہ کا در کھلا نہ تھا اگر اس وقت ۲۰۰ عورتیں دوا فروش تھیں اور ۱۰۶ اخبار پردازی میں مشغول تھیں۔ آج کل کچہری اور بڑی فوج اور قانون کے اور تمام در مرد اور عورت کے لئے برابر کھلے ہیں۔ اس وقت ۱ ہزار عورتیں دوا فروش ہیں۔ ۴ ہزار عورتیں بزاز قصاب اور ۴۰ عورتیں قصائی کا کام کرتی ہیں۔ ۵۰ عورتیں بینکوں میں کام کرتی ہیں۔ ۲۲ نگہبانی کرتی ہیں اور ہر ایک عورت صرف یہی بات نہیں ہے کہ عورتیں زیادہ تر سیکی تجارت میں مصروف ہیں بلکہ ایسے کاموں میں بکثرت ہیں جن میں جسمانی قوت زیادہ درکار ہوتی ہے کوئی عورت اس وقت تک کام نہیں کرتی ہے لیکن ۶ ہزار عورتیں کانوں کے اوپر کام کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے ۳ ہزار کوئلہ تیار کرنے والی ہیں۔ ۱۰ ہزار سے زائد عورتیں مختلف دھاتوں کے کام میں مصروف ہیں۔ کئی سو عورتیں لوہاری کا کام کرتی ہیں اور لوہا پیٹنے والی ہیں۔ جواہرات اور نازک اوزاروں کی تیاری میں ۲۰ ہزار کے قریب عورتیں مصروف ہیں۔ لیکن خاص کام جن میں عورتیں زیادہ مصروف ہیں۔ خدمت گاری اور کارخانوں کی ملازمت ہے۔ ۱۱ لاکھ عورتیں مختلف قسم کے کاموں پر خاندانوں میں ملازم ہیں۔ منجملہ ان کے ۳ لاکھ آگ جلانے والی اور کپڑا دھونے والی ہیں۔ ۴۰۰ عورتیں سوداگروں کی ملازم ہیں۔ ۹۰۲ عورتیں بحیثیت تجارتی ایجنٹ سفر کرتی ہیں۔ ۴ عورتیں محاسب ہیں۔ ۹۰ نیلام کرنے والی اور کئی سو ریل کے اسٹیشنوں پر بحیثیت کلرک، پوائنٹس مین اور دیگر ملازمین اسٹیشن تعینات ہیں لیکن ان دنوں تعلیم یافتہ عورتوں کو ملازم رکھنے میں زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ ۲ لاکھ عورتیں اس وقت معلمی کرتی ہیں ۲۵۲ عورتیں ڈاکٹر اور دندان ساز ہیں ۴۰ ہزار عورتیں تیمار داری کا پیشہ کرتی ہیں۔ اور ۵ ہزار عورتیں علاوہ کیتھولک مشن کے مذہبی تعلیم دینے والی ہیں۔ غرض انگلستان اپنے آغوش میں سب سے زیادہ سرمایہ عورتوں کا لئے ہوئے ہے۔

ریلوے محکمہ میں ہندوستانیوں کو اچھے اور بڑے عہدوں پر رکھنے کی بجائے، اگر کہیں ایک آدھ ہندوستانی بڑے عہدے پر لگا ہوا ہوتا تو اس کو علیحدہ کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے جس کے خلاف مخبر عام مرادآباد مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۳ء نے اپنے ہم عصر وکیل کا حسب ذیل نوٹ شائع کیا۔

"ہم عصر وکیل لکھتا ہے کہ ریلوے کانفرنس دہلی میں جو یہ تجویز ہوئی تھی کہ محکمۂ ریلوے کے بڑے بڑے عہدوں سے دیسیوں کو حتی الامکان محروم وخارج کر دیا جائے اور ان کی جگہ یورپین بھرتی ہوں۔ اس کی نسبت ہر چند کہ لارڈ کرزن بہادر بار بار یقین دلاتے رہے کہ یہ تحریک سرکاری نہیں ہے اور اس پر عمل درآمد نہ ہوگا۔ لیکن آخر رفتہ رفتہ اس کا [illegible] پیدا ہو کر

یہ ثبوت دینے لگا ہے کہ کانفرنس مذکور گویا سرکاری ہی تھی۔ چنانچہ میسور میں ریلوے حکام نے سگنلر کی پوسٹ یورشین امیدواروں کے لئے مخصوص کر ہی دی۔ اب ای۔ بی ریلوے کے ٹی یس صاحب بہادر نے بھی اپنے ماتحت ڈسٹرکٹ افسروں کے نام ایک سرکلر جاری کرکے ان سے مشورہ لیا ہے کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر صرف یورشین سگنلر رکھے جائیں اور جہاں جہاں دیسی سگنلر کام کرتے ہیں ان کو چھوٹے اسٹیشنوں پر تبدیل کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ڈی ٹی ایس صاحبان بڑی خوشی سے اس سوال کا جواب ٹی ایس صاحب کے حسب منشا ہی دیں گے اور اس طرح دیسی مظلوم اس عہدے سے محروم ہو جائیں گے اور جب دیگر لائنوں پر بھی ان نظیروں کی تقلید کی گئی تو آخر ایک دن غریب نیٹو معقول تنخواہ اور ذرا عزت کی آسامیوں سے بالکل ہی بے نصیب رہ جائیں گے۔ خدا جانے اب بھی لارڈ کرزن بہادر دہلی کانفرنس والی تحریک کی حیثیت سرکاری تسلیم فرمائیں گے یا نہیں۔"؟

---

۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ایک کالم میں چار خبریں اسی قسم کی یورپین صاحبوں کے امتیاز کی شائع ہوئی ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "گورے صاحب بہادر، گل کھلے۔"

"گذشتہ نمبر میں ہم جس مسلمان پنکھا قلی کو سنگین سے قتل کئے جانے کا لکھ چکے ہیں۔ اس کا قاتل گورا صرف اسی لئے بری کر دیا گیا کہ وہ بر وقت ارتکاب قتل خلل دماغ کے عارضہ میں مبتلا تھا۔ شکر ہے کہ یہ وحشیانہ آفت ایک بے چارے پنکھا قلی پر پڑی۔ ورنہ ممکن تھا کہ اور ہندوستانی بھی اس لپیٹ میں آجاتے اس لئے بہتر ہے کہ تمام ہندوستانی اس بے چارے گورے کے لئے دعا مانگیں کہ وہ جلد صحت یاب ہوکر فوجی خدمت انجام دے اور آئندہ سے خدا تعالےٰ کسی گورے کو خلل دماغ کے عارضہ میں مبتلا نہ کرے جو کہ پنکھا قلی پھٹ جاتے کے سنگین سے قتل کر دے۔"

دوسری خبر کا عنوان ہے "ایک گورا سارجنٹ ہائی کورٹ سپرد ہوا۔"

"ان صاحب بہادر نے میرٹھ کے ایک دیسی "کالا مین" کو عدم آباد چلتا کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ ہائی کورٹ سپرد ہوئے۔ اگر واقعی اتفاقیہ قتل ہے تو ڈھائی سو روپے دیسی جان کی قیمت لگ چکی ہے دے دینا کافی ہے۔ ورنہ کچھ دنوں اور مصیبت سہی۔"

تیسری خبر یہ ہے۔

"ہم عصر وکیل بحوالہ پبلک لکھتا ہے کہ اسٹیشن ریلوے جالندھر پر ایک دیسی شریف برف والے سے اس کی گراں فروشی کی شکایت کر رہا تھا۔ ایک یورپین صاحب بہادر نے فرسٹ کلاس سے اتر کر غریب ہندوستانی کے منھ پر سوڈا واٹر کا بھرا گلاس کھینچ مارا۔ یہ غریب ان صاحب بہادر کا منھ تکتا رہ گیا۔ تعجب ہے کہ صاحب پبلک کو اس معمولی بات کی شکایت پیدا ہوئی۔ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ "کالا مین" جان سے بچ گیا۔ ورنہ تلی پھٹ جانا کوئی مشکل بات نہیں۔"

چوتھی خبر کی عبارت یہ ہے

"چھاؤنی دمدم نواح کلکتہ میں چند فوجی گوروں نے ایک شریف مسلمان نوعمر لڑکی کی عزت پر حملہ کیا ہے جس کی تحقیقات درپیش ہے۔ شاید صاحبان بہادر نشے میں چور ہوں گے یا عورت ہی رضامند ہوگی۔ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ پھر کیا غم ہے!"

ایڈیٹر مخبر عالم نے ۲۴ راگست ۱۹۰۳ء کو "ایک صاحب بہادر کا قہر و غضب" کے عنوان سے لیڈنگ آرٹیکل تحریر کیا تھا۔

"ٹریبون شکایت کرتا ہے کہ میاں میر کے ایک یورپین کپتان صاحب بہادر نے ایک غریب مسلمان کو بے گناہ یورپین انسپکٹر کے سامنے نہایت بے رحمانہ، وحشیانہ طور پر پکڑوا کر اپنے بنگلہ کے احاطہ میں اس قدر مرمت کرائی کہ وہ بے چارہ بے ہوش ہو گیا۔ اور جب اس کے ہر زخم سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ اور وہ عالم بالا کو چلنے والا نظر آیا تو چھاؤنی کی سڑک پر ٹانگ پکڑوا کر کتوں کی طرح ڈلوا دیا۔ جہاں پولیس مین اس مضروب کو ہسپتال لے گیا۔ ہر چند یہ کالا بدقسمت بے دم ہو کر بیہاں آیا تھا لیکن اپنی سخت جانی سے سسک سسک کر جی اٹھا اور اب بے حیا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اس پر طرہ یہ کہ اسے انتقام نے مجبور کیا اور پولیس کے بھرتے میں کر نالش داغ دی ہے۔ اخبار مذکور اس مقدمہ کی روئداد اس طرح بیان کرتا ہے۔

"کہ چھاؤنی میاں میر میں ایک مسلمان بعض مالکان مکان کا ایجنٹ ہے جو کہ کرایہ داروں سے کرایہ کوٹھیوں وغیرہ کا وصول کر کے مالکان کو بھیجا کرتا ہے۔ ایجنٹ مذکور کے احاطہ مکان میں ایک ذخیرہ لکڑیوں کا جمع تھا۔ اس میں سے اکثر لکڑیاں چوری ہوتی رہتی تھیں۔ ایجنٹ تاک میں تھا ایک کپتان

صاحب جن کا نام عالی جناب رینک صاحب بہادر ہے اور گیارہویں رسالہ بنگال کے افسر ہیں ان کے خدمت گاروں میں سے ایک شخص ہمیشہ لکڑیاں چرا کر لے جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ایجنٹ مذکور نے پولیس کو خبر کر دی، فوراً پولیس انسپکٹر معہ چند کانسٹبلوں کے موقع واردات پر آئے اور اس خدمت گار کو لکڑیاں چراتے گرفتار کیا۔ اتنے میں خدمت گار کے آقا کپتان صاحب بھی موقع پر آپہونچے۔ ان سے خدمت گار کی گرفتاری کا نظارہ برداشت نہ ہو سکا۔ انسپکٹر پولیس ہر چند چتے چمڑے والا فرنگی تھا لیکن کپتان صاحب کے غصے کا مقابلہ نہ کر سکا بدقسمت مسلمان ایجنٹ پاس کھڑا تھا اور یہ معلوم کر کے کہ اسی کی رپورٹ کرنے پر اُن کے خدمت گار کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ کپتان صاحب اس غریب پر اس طرح جھپٹے کہ جیسے کہ ایک باز کبوتر پر جھپٹتا ہو۔ کپتان صاحب کا ہاتھ ڈالنا تھا کہ ان کے خدمت گار بھی آپڑے اور اس کم بخت ایجنٹ کو گھسیٹتے ہوئے کپتان صاحب کے بنگلہ میں لے آئے۔ پولیس انسپکٹر صاحب یہ کیفیت دیکھ کر کھسک گئے۔ کپتان صاحب بہادر نے اپنے شکار کو بخوبی قابو پا کر اس کو پیٹ بھر کر زدوکوب کیا اور گرایا۔ کپتان صاحب نے کیل دار جنگی بوٹوں کی ٹھوکروں سے اس کا تمام سر لہولہان کر دیا، کپتان صاحب کے نوکروں نے قابو پا کر اس کو زمین پر دے پٹکا، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس بے رحمی اور سفاکی سے ضربوں پر ضربیں دیں کہ ظالم سے ظالم شخص بھی یہ بے رحمی گوارا نہ کرتا۔ مگر صاحب بہادر نے اس بے دردی پر بھی بس نہ کی اور اس غریب بے ہوش کو اصطبل میں لائے وہاں گھوڑوں کی پچھاڑی سے اس کی مشکیں اس طرح بندھوائیں کہ گھوڑوں کی ٹاپیں متواتر پڑتی تھیں۔ غریب ایجنٹ کی حالت بالکل بے جان معلوم ہوتی تھی منہ سے، اور ناک کے نتھنوں سے اور کانوں اور آنکھوں سے خون بہتا تھا، سر پھٹ گیا تھا تب کپتان نے پانی منگوایا اور اس کے خون آلودہ کپڑوں کو پانی سے دھلوایا اور ازاں بعد اس کو شارع عام پر اس طرح پھکوایا کہ جیسے کتا ہو۔ وہ اسی حالتِ غشی اور بے ہوشی میں پڑا تھا کہ پولیس نے اسے اٹھوا کر اسپتال میں پہونچا دیا۔ وہاں زندگی اور موت کے درمیان میں اس لٹکتے ہوئے کو مرہم پٹی، درد دارو سے کچھ آرام ہو گیا ہے۔ یہ شخص جسامت میں مضبوط تھا کہ، تنی مار کھانے پر بھی جاں بر ہو گیا ورنہ کپتان صاحب نے اس کو عدم آباد بھجوانے میں کیا کسر رکھی تھی۔

اخبار ٹریبون نے لکھا ہے کہ کپتان صاحب نے اس شخص سے ذاتی انتقام لیا ہے۔ کپتان صاحب اس سے پہلے جس کوٹھی میں رہتے تھے اس کے مالک کا بھی یہی شخص ایجنٹ تھا۔

کرایہ وغیرہ کی بابت مالک مکان اور کپتان صاحب میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس ایجنٹ کو مارا ہے وہ مالک کا طرفدار ہے۔ بہرحال اب یہ مقدمہ میاں میر کے مجسٹریٹ چھاؤنی کی عدالت فوجداری میں دائر ہے وہاں دوران تحقیقات تمام حالات، سابقہ تعلقات وغیرہ خود بخود ظاہر ہو جائیں گے۔ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ کم بخت ایجنٹ نے اتنی مار کھا کر بھی صاحب بہادر کے رتبہ کا اندازہ نہ کیا اور عدالت تک تکلیف گوارہ کی، اسی پر شکر کیا ہوتا کہ جان بچی سب کچھ پایا۔ خیر خیر سے پر سو درتے کی طرح یہ حسرت بھی وہ نکال کر دیکھ لے۔ اب تو فوجداری عدالت کیا فیصلہ دیتی ہے۔"

اس زمانے میں زیادہ تر انگریزی اخبارات پر یورپین حضرات کا قبضہ تھا۔ انگریزی اخبارات اور انگریز ہندوستانیوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو تذلیل کن خطابات بھی دینے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ اس ذہنیت سے مجبور ہو کر ہندوستانی اخبارات ان کا جواب دینے سے نہیں چوکتے تھے اور موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی یورپین غیر مہذب حرکت کرے تو اس کی تشہیر کی جائے اور یورپین تہذیب کو آشکارا کیا جائے۔ چنانچہ نیر عالم مراد آباد مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۰۲ء میں ایک نہیں بلکہ دو واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلی خبر کا عنوان ہے "نیم وحشی کون ہے":

"صاحب لوگ ہندوستانیوں کو نیم وحشی، بے وقوف، پاگل کہا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے مہذبانہ کرتوت سن کر ہندوستانی اس تہذیب کو سو سلام کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک یورپین صاحب کے مہذب طرز عمل کی الٰہ آباد رشتہ ٹریفک تحقیقات کر رہا ہے جس کی دو ریلوے گارڈوں نے رپورٹ کی ہے کہ ایک یورپین صاحب بہادر ٹرین نمبر ۱۲ ڈاؤن، جو کان پور سے چلتی ہے، غریب گاؤں اسٹیشن پر دوسری گاڑی کے غسل خانہ میں انھوں نے عجیب و غریب نظارہ دیکھا کہ کان پور کا یہ یورپین شراب میں مست ایک لیڈی کے ساتھ لپٹا پڑا تھا اور بالکل برہنہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فرنگی صاحب چلتی گاڑی میں پائیدان پر پاؤں رکھتا ہوا درجہ دوئم کی گاڑی میں داخل ہوا جہاں ایک مسافر لیڈی کسی ضرورت سے غسل خانہ گئی تھی وہیں ان مست الست صاحب بہادر کا ہم کو دو ملیکم کہنا پڑا، اور وہ غریب اس وحشیانہ حرکت کو دیکھ کر چیخ پڑی۔ تنہائی میں صاحب بہادر کو کامیاب کرا دیا ہوگا۔ تعجب ہے کہ اینگلو انڈین اخبارات نے ان صاحب بہادر کی ذرا سی بھی تحقیق نہیں کی کہ یہ کون کان پور کے یورپین شریف تھے اور کون نیک بخت لیڈی صاحبہ تھیں۔ ہاں اگر کوئی نیم وحشی ہندی اگر ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا تو صفحہ کے صفحہ سیاہ ہو گئے ہوتے

ان واقعات پر انصاف آپ فیصلہ کر دے گا کہ کون مہذب ہے اور کون نیم وحشی ہے۔"

دوسری خبر کی سرخی ہے "ڈاکو لیڈی"

"پونا اور بمبئی کے درمیان سفر ریلوے میں ایک متموّل خاندان کی پارسی لیڈی کو ایک یورپین میم صاحبہ کے ذریعہ سخت مصیبت پیش آئی۔ سفر ریلوے میں چوریوں کی واردات میں تو سنی ہی جاتی ہیں لیکن یہ یورپین صاحبہ اس فعل کی مرتکب ہوں واقعی عجیب بات ہے۔ پونا سے ایک فرنگی لیڈی اس کے ساتھ سوار تھی وہ اگلے اسٹیشن پر اتر گئی۔ وہاں ایک دوسری لیڈی اس کمرے میں سوار ہوئی' عمر میں نوجوان تھی' جسامت میں مضبوط' قد میں لمبی' گھاس کی ٹوپی سر پر تھی اور ہینڈ بیگ ہاتھ میں تھا۔ ان میم صاحبہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تمام کھڑکیاں بند کر دیں۔ پارسی لیڈی نے روکا لیکن پرواہ نہیں کی گئی۔ اس کے بعد اپنا دستی بیگ کھولا' اس میں سے ایک بڑا چاقو نکالا اور ایک ریوالور اور ایک رسی بھی نکال کر نشست کی جگہ پر رکھ دی۔ وہ اس زنانہ ساتھی کی اس حرکت پر سہم گئی کہ یہ کیا کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ میم صاحبہ پارسی لیڈی کے پاس آکر اس کی جیب زبردستی ٹٹولنے لگی۔ اور مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ ایک جیب میں نقدی کا بٹوہ تھا جو جبراً نکال لیا جس میں ... نہیں روپے تھے جو فی الفور لے لئے گئے۔ پارسی لیڈی کے پاس اسباب کی جو ... کنجی بھی اسی طرح حاصل کی گئی۔ بٹوہ اور چابی حوالہ کرکے کسی بہانہ سے پاخانہ میں گھس گئی۔ اس نے ریشمی رومال میں ۱۲۵ روپے کے نوٹ بندھے تھے۔ یہ رومال ایک اور جیب میں تھا جو اس وقت تک فرنگی لیڈی کو نہ سوجھا تھا۔ اس رومال کو پارسی لیڈی نے اپنے کمر پر پیٹ کر بخوبی چھپا رکھا تھا۔ پارسی لیڈی رفع حاجت کرکے کمرے سے نکلی تو میم صاحبہ پھر اس کے پاس آئی ایک ہاتھ اس کی گردن پر رکھا اور دوسرے سے اس کے دونوں ہاتھ قابو کئے۔ اسی حالت میں گڑ اسٹیشن آ گیا۔ تو وہ میم صاحبہ جھٹ کمرے سے نکل کر چلتی پھرتی نظروں سے غائب ہو گئی۔ پارسی لیڈی ایسی خوف زدہ تھی کہ کچھ عرصے تک اس کے منہ سے آواز نہ نکلی' چیخنے چلّانے کی جرأت نہ پڑی' آخر ریلوے پولیس کو رپورٹ کی گئی۔ وہ اس مجرم میم صاحبہ کی تلاش کر رہی ہے۔ یہ نرالی قسم کی واردات ہے فرنگی لیڈی اور یہ کرتوت۔ پونا کے انگریزی اخبار ایجرور نے یہ خبر اسی طرح شائع کی لیکن ہمارا خیال ہے کہ نازک مزاج پری تمثال حور وش بھولی بھالی یورپین میم صاحبہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔ اس کا سفید چہرہ کالے چہرے والوں کا کام ہرگز نہ کرنے دے گا۔ کہیں کوئی دیسی عورت سایہ پہن کر اور پوڈر لگا کر لیڈی نہ بن گئی ہو۔ کیونکہ یہ کام انھیں کا ہو سکتا ہے مگر جب پونا کا انگریزی اخبار خود یورپین

میم تسلیم کرتا ہے تو کیا یورپین میم صاحبہ بھی ایسا کر سکتی ہے؟

برطانیہ سرکار سے جب ہندوستان میں پاؤں جما لئے تو عیسائی مشنریوں نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ جب ان کو کامیابی ہوئی تو یہ جے پور بھی ہو پہنچے وہاں بھی پرانے طریقے اختیار کئے تو جے پور والے چراغ پا ہو گئے اور ان کے خیالات کی ترجمانی تجز عالم مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۰۳ء میں کی گئی۔ عنوان تھا "جے پور میں عیسائیوں کے کرتوت"

"ریاست جے پور میں جہاں بہت دنوں سے عیسائی پادریوں کے قدم جمے ہوئے ہیں ان کے دو مشن اسکول جاری ہیں۔ ایک عالی شان گرجا بنا ہوا ہے۔ عیسائی لیڈیاں گھر گھر جا کر تعلیم دیتی پھرتی ہیں۔ اور بڑی آزادی کے ساتھ عیسائی پادری وعظ کہتے ہیں۔ مشنی فوج رہتی ہے اور راج کی طرف سے ان کو پوری آزادی حاصل ہے اب عرصہ کے بعد ان پادریانہ برکتوں کا اظہار ہوا ہے۔ کہ اس ہندو راج میں ایک ریاست کے سب جج برہمن اور ایک لیڈی ڈاکٹر برہمنی کو عام طور پر عیسائی بنایا گیا۔ جس سے ہر طرف اس گروہ سے عام ناراضی اور نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہندوؤں نے اپنے بچوں کو اسکولوں سے اٹھا لیا۔ مشنری لیڈیوں کا آنا جانا بند ہے، عیسائی اسکول ویران پڑے ہیں، زنانہ وعظ بند ہیں۔ ریاست نے بھی ہمدردی مذہب کے جوش میں اس برہمن اور برہمنی کو ملازمت ریاست سے خارج کر دیا ہے۔ لیکن یہ تازہ عیسائی پادری صاحبان کی حمایت میں خوش ہیں اور پادری اس نمایاں کاروائی کو شاید ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ جو برابر راج میں معمولی کاروائیاں کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ڈر ہے کہ یہ مذہبی جھگڑا ہے کہیں کوئی ہنگامہ بپا نہ ہو جائے اور راج کی بے جا طرفداری دیکھ کر تعجب نہیں کہ ہندو قوم بگڑ جائے اور پھر راج کو کسی سخت نقصان کا مقابلہ کرنا پڑے۔ عیسائی گروہ جہاں جاتا ہے آزادی پاکر یہی کاروائی جاری کر دیتا ہے۔ اور وہاں اسی قسم کا نتیجہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب ریاست و رعایا ریاست کو جو اس موقع پر افسوس ہے وہ محض فضول ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اس یکایک نفرت سے کوئی اور فتنہ پیدا نہ ہو جائے۔ اسکولوں کا ویران ہونا مشنری لیڈیوں کا گھروں میں جانا بند کر دینا کوئی خرابی پیدا نہ کر دے۔ بہتر ہے کہ راج اس نازک امر میں کامل غور کر کے اس اشتعال کو دور کرا دے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو نظر انداز کر کے امن و سکون کی تباہی و بربادی کا ہی خیال کیا جائے جو اس قسم کے واقعات سے عمل میں آتے تھے چونکہ ہمیشہ پادری صاحبان

کی ذات سے ایسے ہی معاملات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

ایک دیسی اخبار نویس مسٹر مترا جو ایک انگریزی اخبار دکن پوسٹ کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مسٹر نیوٹن بیرسٹرایٹ لا کی درخواستِ تقرری پر اپنے اخبار میں نکتہ چینی کی تھی اور دوسرے صاحب بہادر مسٹر ڈیل جو مالک اخبار تھے، ان کو اخباری ناراضگی تھی۔ ان دونوں نے مل کر مسٹر مترا کے خلاف شرمناک الزامات لگا کر مقدمہ دائر کر دیا جب وہ مقدمہ مسٹر مترا جیت گئے تو اس پر ایڈیٹر مخبر عالم مرادآباد نے مخبر عالم مورخہ ۸ نومبر ۱۹۰۳ء میں یورپین عصبیت کی شرمناک حرکتوں کا بھانڈا اپنے اداریے میں پھوڑا۔ اس اداریہ کا عنوان ہے "شرمناک الزاموں سے بریت":

"مسٹر مترا کی بریت نے صاحب بہادروں کے عقدہ کا ایسا دلچسپ نقشہ کھینچ دیا ہے کہ کالے وحشی بھی اس قوم کے طریقِ انتقام پر انگشت بدنداں ہیں۔ اگر کوئی ایڈیٹر کسی دیسی شخص کے معاملات پر نکتہ چینی کرتا یا اس کے واقعات سے بھی چھیڑ چھاڑ کی جاتی تو شاید وہ زیادہ سے زیادہ نالش لائبل داغ دیتا یا اس کی نسبت توہین آمیز خیال ظاہر کرتا۔ مگر کسی کالے کو (جس کو وحشی کا خطاب دیا گیا ہے) یہ نہ سوجھتا کہ اپنی مہذب قوم کی ایک حسینہ مہ جبینہ نا کتخدا سے زنا بالجبر کا جھوٹا دعویٰ کراتا اور اگر بدقسمتی سے وہ بھی نہ چلتا تو کسی کا ناجائز حمل اپنے مخالف کے سر نہ تھپواتا۔ افسوس کہ مسٹر مترا جو ایک انگریزی اخبار دکن پوسٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے مسٹر نیوٹن بیرسٹرایٹ لا کی درخواست تقرری عہدہ گورنمنٹ ایڈوکیٹ پر نکتہ چینی کی تھی۔ اور ایک دوسرے صاحب بہادر مسٹر ڈیل جو مالک اخبار ہیں ان کو کچھ اخباری ناراضگی تھی۔ ان دونوں بزرگواروں نے اس دیسی شخص پر اس طرح انگریزی عقدہ کا اظہار کیا اگر مسٹر نارٹن کا سا پیروکار نہ ہوتا تو شاید اس غریب کا پتہ بھی نہ لگتا۔ لیکن اس سازش کا عدالت سیشن جج سکندرآباد میں بھانڈا پھوٹ گیا کہ ایک یورشین مس گلبرٹ کو تیار کر کے مسٹر مترا پر زنا بالجبر اور ناجائز حمل وغیرہ کے شرمناک الزامات لگائے گئے تھے مقدمہ مدتوں سے چل رہا تھا آخر میں صاحب سیشن جج بہادر سکندرآباد نے مسٹر مترا کو صاف بری کر دیا اور اس بات کو تسلیم کر لیا کہ بے شک ان صاحب بہادروں نے ایسی کمینہ اور ذلیل کوشش اختیار کی کہ ایک دیسی تباہ ہو جائے اور ایک یوریشین مس کا پردہ اس طرح سے فاش ہوا۔ اور اس کے ماں باپ کا راز یوں طشت از بام ہو گیا کہ توبہ۔ خیر مسٹر مترا کو تو خدا نے بچا دیا لیکن اس انگریزی ناراضگی کے نتیجہ سے ایک زمانہ واقف ہو گیا کہ تہذیب کے مدعی بھی لالچ اور انتقام کے لئے ایسا فعل کر جاتے ہیں ۔۔۔ افسوس۔

ہندوستان کے عیسائیوں کو حکومت نے ملازمتوں کے لئے سفارش کرنے کے اختیارات دے دیئے تھے یا یہ خود ایسا کرتے تھے۔ ان کی سفارش کے بغیر ملازمتیں نہیں ملتی تھیں اور یہ مذلیل ہندوستانیوں کو گوارہ نہ تھی۔ اس کی مخالفت عام تھی اس لئے لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں ایک مراسلہ عرشی صاحب نے گیا (بہار) سے مخبر عالم میں اشاعت کے لئے ارسال کیا جو ۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں طبع ہوا۔ جس کا عنوان ہے "زمانہ کا تو تو"

"زمانہ موجودہ میں انقلاب کے دم قدم سے جیسے کچھ عجیب و غریب واقعات روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں وہ محتاج تفصیل نہیں۔ ابھی تو خیر کسی قدر ہندوستانی روسا یا اہل پیشہ کے ہاتھ میں تھوڑی بہت رقم ہے۔ جب یہ بھی ہاتھ سے خدانخواستہ نکل جائے گی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کا ورق کس طرح پھر الٹے گا اور کیا ہوگا۔ صرف بے جا کی بدولت مجھے یقین ہے کہ ہمارے ننھے ننھے بچے اپنے زمانہ آخر میں وہ وقت ضرور دیکھیں گے جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہی نہیں بلکہ ایک روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اوروں سے کیا بحث یہاں میں خود ایسی نظیر ہندوستان میں موجود ہوں جس کی اگلی فضول خرچی کا برا انجام آج اظہر من الشمس ہے۔ لوگ ملازمت ملازمت کرتے ہیں۔ مگر ذرا آنکھوں میں روشنی بخش عینک لگا کر نہیں دیکھتے کہ ملازموں کی موجودہ زمانہ میں کیسی کٹتی ہے اور ان پر کیا گذرتی ہے۔ آہ دیسی امیروں اور رئیسوں کی ملازمت شرفاء کے قابل نہیں رہی۔ ان کی خلاقی خرابیوں نے ان کو اندھا اور بہرا بنا رکھا ہے یہ نصیحت پسند نہیں کرتے ایسی باتوں کو نہیں سنتے یہ اپنے بُرے بھلے پر نگاہ نہیں ڈالتے کیونکہ ایک روز ان کی اولاد کو بھیک مانگنا ہے۔ خوشامد پسند بہت ہو گئے ہیں اور وہ وقت قریب ہے کہ ان کے مصاحب ان کے قدم پر سجدہ کر کے ان کو پوجنا شروع کر دیں گے۔ انگریزی ملازمت سے بھی فارغ البالی حاصل نہیں ہوتی۔ ہر روز ایک جدید قانون شائع ہوتا ہے۔ حکام کی نگاہ میں کچھ خیال و تفرقہ شریف و کمینہ اور بے علم و باعلم کا نہیں رہا۔

منجملہ اور محکموں کے ریلوے میں بھی لوگ ملازمت کیا کرتے تھے مگر اب اس کی حالت ہی کثرت علم سے غیر ہو گئی ہے، ترقی یک گونہ بند کی گئی ہے اور آبرو کا تو یہاں نام نہ لیجئے۔ معمولی سا معمولی ہندوستانی کرسچین آنکھ نہیں ملاتا بلکہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بات بات پر اس سے رنج کرتا ہے اور غیر عیسائیوں کے مقابلے میں کمینے لوگ با وقعت سمجھے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس محکمہ کی حالت صرف کرسچینوں کے عام تعصب سے نہایت ہی ابتر ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس

جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے اور دیکھتا ہوں ایک غیر معمولی تاریکی سارے ہندوستان پر دوڑتی نظر آتی ہے اور بجز اس کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ہم ملازمت کا سودا اپنے دماغ سے نکال دیں اور جو لوگ اس کو پسند کر چکے ہیں ان سے روٹی کے چھیننے کی نیت نہ کریں۔ ہم تجارت یا کاشت یا اور کسی حرفہ کو اپنا کر مزدوری سے اپنا پیٹ بھر لیا کریں۔ مسلمان اگر عام طور پر اس جانب توجہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمام لوگ راہ راست پر جلد آجائیں گے اور وہ بات جس کو ہم اپنی بدنصیبی کے سبب ایک شرمناک کام سمجھ رہے ہیں بہت جلد حاصل ہو جائے گی۔

ہمارا کام سمجھانا ہے یارو
اب آگے چاہے تم مانو نہ مانو

ایڈیٹر مخبر عالم بے پردگی کے مخالف اور پردہ کے حامی تھے چنانچہ ۸ر فروری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں پردے کے ایک مخالف کی مراسلت شائع کر دی۔

"ایک عرصہ سے پردہ سسٹم کے بارے میں مخالفین پردہ اپنی اپنی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں مگر اب تیار لوگ ایسے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں کہ اپنی پرزور تحریروں سے قلم تک توڑ دیئے ہیں جیسا کہ ایک صاحب معزز حیدرآبادی کی تحریر ایک ماہوار رسالہ میں نظر سے گذری کہ صاحب مضمون نے عورتوں کی آزادی کے مسئلہ پر پوری پوری قابلیت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی ہی کو مسلمانوں کی ترقی بھلائی' قومی ہمدردی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں کہ اگر دیسی عورتوں کو مثل یورپین لیڈیوں کے پردہ سسٹم سے آزادی دے دی جائے تو اس حالت میں مسلمان ترقی کر سکتے ہیں۔ ان صاحب نے اپنا پورا زور ختم کر دیا لیکن واہ حضرات واہ مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ بھی آپ نے خوب سوچا۔ اب دیر کس بات کی ہے اور آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں بسم اللہ کیجئے اور مرد میدان بن کر سب سے آگے قدم بڑھائیے اور گھر کی عورتوں کو پردے سے آزادی دے کر ذیل کے شعر پر عمل کیجئے۔

قول مردوں کا نہیں کام ادھورا کرنا
دخل جس کام میں دینا اسے پورا کرنا

پھر اس حالت میں جب ان کی ترقی ہوں لوگوں کو ثابت ہو گا تو ضرور ممکن ہے کہ وہ بھی آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چل سکتا۔ شاید معزز مضمون نگار نے پردہ سے آزادی دینے کے نفع و نقصان کو نہیں خیال

کیا۔

اجی صاحب یہ تو ابھی چند روز ہی کا ذکر ہے کہ یہ خبر اخباروں میں گشت کر رہی تھی کہ ایک صاحب جنٹل مین جو کہ بیرسٹری پاس کرنے کے واسطے ولایت کی تیاری پر اپنی بیوی صاحبہ کو بھی پردہ سے آزادی دے کر ہمراہ لے گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیوی صاحبہ نے تو اپنا تعلق ایک فرانسیسی جوان سے پیدا کر لیا اور بیرسٹر صاحب کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔ اب فرمایئے کہ یہ قوم کی ترقی ہوئی یا تنزلی۔ لہٰذا اب ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ یا تو معزز مذکور ایسے لغو خیالات سے باز آئے اور نہیں تو اپنے کو خود پیش رو ثابت کر کے اپنے گھر کی عورتوں کو پردہ سے آزادی دے اور کمیٹیوں میں شریک ہونے کی اجازت دے دے۔"

راقم سالم ایس کے آزاد شکوہ آبادی

حکومت برطانیہ ایک "قانون رازداری" نافذ کرنا چاہتی تھی جس کا مقصد حکومت کو اپنے اوپر نکتہ چینی کرانے سے روکنا تھا اور اس قانون میں یہ بات بھی ہندوستانیوں کے لئے قابلِ اعتراض تھی کہ ملزم پر بارِ ثبوت ڈالا گیا تھا۔ اس قانون کی ہندوستان میں بڑے زور و شور سے مخالفت ہوئی۔ مخبر عالم مرادآباد تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے اپنے قلم کو جنبش دی اور ایک آرٹیکل ۱۹ فروری ۱۹۰۳ء کے شمارے میں تحریر فرمایا۔ عنوان ہے "قانون رازداری"

"اس عجیب قانون کے بُرے نتائج پر غور کر کے دیسی اخبارات کالم کے کالم سیاہ کر رہے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ پائنیر جیسے نیم سرکاری پرچے نے بھی اس کا نفاذ باعثِ خرابی ظاہر کیا ہے اور وہ اپنے متواتر لیڈنگ آرٹیکلز میں اس کا رد نار و رہا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا بمبئی کا ایک سر بر آوردہ انگریزی پرچہ ہے وہ بھی پائنیر کا ہم خیال ہے۔ اسی طرح سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور مدراس میل و انگلش مین بھی اس قانون کی برائی کا عام اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ لارڈ کرزن صاحب نے خود مسودہ پیش کرتے وقت اجلاس کونسل میں تسلّی و تشفّی دی تھی لیکن یہ تسلّی و تشفّی کچھ بے کار جاتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس ہائے ویلا کے بعد جو کچھ امید تھی وہ گذشتہ ہفتہ کے واضع آئینِ ہند کے اجلاس کو دیکھ کر مفقود ہوتی نظر آتی ہے۔ اس دن اس مسودۂ قانون رازداری کی بابت سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی تھی جس کو دیکھنے والوں نے معلوم کیا ہے کہ اس میں وہ تمام خرابیاں اور نقائص بھرے ہوئے ہیں جن کی بابت ابتدا ہی میں شکایت کی گئی تھی۔"

سلیکٹ کمیٹی نے صرف ایک اعتراض پر غور کیا ہے کہ اس الزام کو بعض حالتوں میں قابلِ

ضمانت و مچلکہ قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ ابتدائی صورت میں یہ مسودۂ قانون الزام خلاف رازداری سرکاری کو ناقابل ضمانت و مچلکہ قرار دیتا تھا۔ اس مسودۂ قانون کے بڑے بھاری نقص یہ ظاہر ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ملکی معاملات کی خبروں کو آزادی کے ذیل میں لاتا ہے۔ دوسرا بھاری یہ نقص ہے کہ بے قصوری کا بارِ ثبوت ملزم پر ڈالا جاتا ہے اور دونوں بردستیاں اس قدر سخت ہیں کہ سلطنت کے کسی اور حصہ میں ایسا قانون پیش کرنے کی جرأت نہ پڑ سکتی۔ تمام مہذب اور عام رائیں ان بندشوں کے نقصان پر بڑے زور و شور سے افسوس ظاہر کر رہی ہیں۔

افسوس لارڈ کرزن صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ یہ مسودۂ قانون کی وجہ سے ایک بھی سچے اور بے قصور آدمی کو خوف زدہ ہونے کی وجہ نہ ہوگی۔ ایسے ہی مسٹر آرنڈل صاحب نے بھی اطمینان دلایا تھا کہ یہ مسودۂ قانون صرف بدخواہوں اور بدکرداروں کے لئے ہے نہ کہ نیک نیتی اور بے ضرر الوالعزمی کے لئے ہے لیکن کلکتہ کا ایک بھی اخبار سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس وعدہ کا ایفا نہیں پاتا ہے۔ ہندوستانی رائے کے قائم مقام چار روزانہ اخبار انگریزی ہیں اور تین روزانہ اخبار فرنگیوں کے ہیں وہ سب اتفاق رائے سے اس قانون کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ سرکاری کاموں کی نکتہ چینی کو عملی طور پر بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس قانون کے پاس ہونے پر کوئی ملکی انتظام کے متعلق خبر افشا ہونے نہ پائے گی اور کوئی مخفی بات ظاہر کرنے والا مجرم اور ذمہ دار ہوگا اور اس الزام میں گرفتار ہونے پر بے قصوری کا بارِ ثبوت ملزم پر ڈالنا ہوگا۔ اس امر کی مخالفت بڑے زور و شور سے کی جا رہی ہے۔ اس قانون کے پاس ہونے پر تمام سرکاری دفاتر اخبارات کی نکتہ چینی کے خوف سے بے پرواہ ہو جائیں گے۔ انگریزی اخبارات اس موقع پر یہاں تک لکھ چکے ہیں کہ روس کی سی زبردستی یہاں بھی اختیار کی گئی ہے۔ ایسا مسودہ جنوب دیپ میں پیش کرنے کی کبھی جرأت نہ پڑتی۔ کہا جاتا ہے کہ کونسل آئین ہند میں جتنے ممبر غیر سرکاری ہیں وہ سب اس مسودۂ قانون کے خلاف پائے جاتے ہیں۔ مسٹر گوکھلے صاحب مخالفوں کے لیڈر ہیں۔ وہ صاحب بتلا چکے ہیں کہ یہ مسودۂ قانون پاس ہوتے پر بڑی سخت خرابیوں اور شرمناک برائیوں کا باعث ہوگا۔ اس موقع پر وائسرائے نے مسٹر گوکھلے کی رائے پر بہت بے چینی ظاہر فرمائی تھی اور یقین دلایا تھا کہ گورنمنٹ کے مقصد وہ نہیں سمجھتے ہیں اور خواہ مخواہ غلط معنی نکالتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ منتخب کمیٹی میں اصلاح ہو کر مسودہ پیش کیا گیا ہے۔ افسوس کہ مسٹر گوکھلے صاحب کی باتیں صحیح اور درست پائی جاتی ہیں۔ یہ بات گورنمنٹ کے ہاتھ

میں ہے کہ تمام زمانہ ایک طرف ہونے پر بھی اپنی مرضی کا قانون پاس کر سکتی ہے۔ اس کا صرف
نیک نیتی پر مدار ہے جس کا آخری فیصلہ خود اس کے اختیار میں ہے۔ اس قانون کے لئے
افسوس نہ ہرگز نا معقول ہے جب کہ افسوس کرنے والوں میں تمام بڑے بڑے ہم عصر افراد حصہ
لے رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے ظاہر کیا ہے کہ اس قانون کے نہ ہونے کے باعث انتظامی
امور میں بارہا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ خیال کرتی ہے کہ بعض سول راز بھی قبل از وقت ظاہر
ہونے کی حالت میں ایسے ہی پیچیدہ اور مضرت بخش ہیں جیسے کہ ملٹری راز ہیں۔ یہ باتیں گورنمنٹ
کے نقطہ خیال سے بھی جائیں تو خود تسلیم کرنے کے قابل ہوں گی۔ لیکن عام لوگوں میں تو یہ اظہار
اتنی بڑی وقعت نہ رکھے گا۔ کیونکہ اختلافی پہلو سے بحث کرنے کے لئے وسیع میدان ہے۔
اس میں کلام نہیں کہ اینگلو انڈین و دیسی اخبارات نے اس امر میں دل کھول کر بحث و مباحثہ کا
بازار گرم کر رکھا ہے۔ اب اگر بدقسمتی سے یہ مسودہ پاس بھی ہو جائے (جیسا کہ ۹ فروری کو پاس
ہونے کی امید ہے) تو یہ اتفاقی بات ہے اور ہم بھی یہ سمجھ کر دل کو تسکین دے لیں گے۔

شکست و فتح تو قسمت سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد ٹیکس لگانے کی ابتدا کی جس سے ہندوستان بھر میں بے چینی پھیل گئی۔ اس زیادتی کے خلاف برطانیہ کے پارلیمنٹ کی ممبری کے ایک امیدوار نے اپنی آواز اٹھائی تو ہندوستان کے عوام نے اس کو پسند کیا اور اس کی تائید و حمایت میں مخبر عالم مراد آباد مورخہ ۴ مارچ ۱۹۰۴ء نے ایک اداریہ تحریر کیا، جس کا عنوان تھا "ایک یورپین کی آزادانہ تقریر"۔

"مسٹر رونالڈ سیمسٹن نے جو آج کل برطانوی پارلیمنٹ کی ممبری کے امیدوار ہیں حال میں
بجواب اس سوال کے کیا برطانیہ اپنے فرائض ہندوستان کے متعلق ادا کر رہا ہے؟ کہا مجھے
افسوس ہے کہ برطانیہ دن بہ دن اس اعتماد و اعتبار اور عزت کو کھو رہا ہے جو اس کے لئے
ہندوستان میں موجود تھی۔ برطانیہ طرح طرح کے ٹیکسوں سے ہندوستان کو دق کر رہا ہے اور
اس کی عرض و معروض پر توجہ نہیں کرتا۔ برطانیہ کو جب دوستانہ طور پر سمجھایا جاتا ہے تو بھی کچھ
پروا نہیں کرتا خالی تقریر و تحریر کا زمانہ گیا اب کام کرنے کا وقت آیا ہے اور کام بھی وہ جو
استحکام و استقلال کے ساتھ سر انجام دیا جائے۔"

دوران تقریر اس لائق لیکچرار نے ہندوستانیوں کو مرض اصراف میں مبتلا دیکھ کر گورنمنٹ کو اس مرض کا بانی قرار دیا اور اس کا صرف یہی علاج پیش کیا کہ گورنمنٹ اپنے اخراجات کو گھٹائے۔ اور باشندوں پر ٹیکس کم کرنے سے ان کو ابھرنے کا موقع دے۔ یہ الفاظ یورپین ہی زبان کے لئے خدا نے محدود کئے ہیں اور وہی ادا کر سکتے ہیں۔ بے چارے ہندوستانی اخبارات اگر ایسے مضامین لکھیں کہ جس میں اپنی گورنمنٹ کو فرائض کی طرف اس طرح توجہ دلائیں تو وہ گستاخی اور دریدہ دہنی میں شامل کئے جائیں گے۔ لیکن صاحب بہادر جو کچھ کہیں وہ سب مہذبانہ شکایت سمجھی جائے گی۔ اب ہماری قسمت کہ کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو ضرور معلوم ہو گیا ؎

وہ غیر بھی کہنے لگے قصہ مرے دل کا
بگڑا ہوا کچھ حال ہے ایسا مرے دل کا

واقعی ہندوستان میں، ٹکم ٹیکس کم کرنے کی ضرورت ہے اور گورنمنٹ کو اپنے وعدے کے مطابق اس طرف کامل غور کرنا چاہیے۔"

لارڈ کرزن وائسرائے ہند، انگریزوں کی طرح ہندوستانیوں کو تضحیک و ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا چنانچہ اس نے اپنی تقریر میں بھی ہندوستانیوں کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے ہندوستانیوں کی کھلم کھلا توہین ہوتی تھی۔ اس تقریر نے پورے ہندوستان میں ہلچل مچا دی۔ مخزن عالم بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ۱۶ مارچ ۱۹۰۵ء کے شمارے میں "لارڈ کرزن کی تقریر کا اثر" کے زیر عنوان تحریر کیا۔

"ہمارے وائسرائے صاحب بہادر نے جو کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن کی دھواں دھار تقریر میں بد قسمت کالے لوگوں کے اخلاق و صداقت پر ناگوار حملہ فرمایا تھا اور اس کے اثر کی بابت اخبار امرت بازار پتریکا کلکتہ لکھتا ہے کہ دہلی میں ڈاک خانہ جات کے ڈپٹی کمشنر ولر صاحب بہادر کے دفتر میں اس تقریر کی کاپی کر کے دفتر میں ایسی جگہ پر آویزاں کی گئی ہے کہ وہاں سب کی نظر پڑتی ہے اور خصوصاً دفتر ہذا کے ہندوستانی کلرکوں سے خبر گیری ہے کہ وہ لوگ صداقت کی بلندی سے گرے ہوئے ہیں اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اس کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس تقریر کی نقل کر کے اس کے نیچے بطور فٹ نوٹ کے یہ حاشیہ چڑھایا گیا کہ دیکھو لارڈ کرزن کی رائے دیسیوں کی نسبت کیا ہے۔ بقول یہ کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ لارڈ کرزن صاحب خود ہی قیاس فرما سکتے ہیں کہ یہ چالیں نیک نامی پیدا کرنے اور شہرت کو بڑھانے والی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی مصلحت

ہو۔ ایک صاحب خطائے بزرگاں گرفتن خطا است اور دوسرے صاحب خلاف رائے سلطان جستن یہاں سلطان کی جگہ پر کرزن بھی چسپاں ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ ایک اعتراضی جلسہ کی کامیابی کے واسطے سامان کافی اور مصالحہ چوکھا موجود ہے۔ ہر چند کہ لاہور وغیرہ میں ان اعتراضی جلسوں کے انعقاد کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے۔ بہت بہتر ہو کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں چیدہ چیدہ حضرات جمع ہو کر اپنے اظہار صداقت بر وفاداری کے جلسہ کر کے اس پر لارڈ موصوف کو توجہ دلائیں کہ کالے بدقسمتوں کے سروں سے پرکلنک کا ٹیکہ چھوٹے اور کالوں کو جاہل وحشی کہنے والوں کا اور زیادہ حوصلہ نہ بڑھے"

اڈیٹر مخبر عالم کی ہندوستان کی ہر چیز پر نگاہ تھی وہ تقریباً ہر فنکار کی حالت سے واقف تھے اور ان پر نگاہ رکھتے تھے کہ ہندوستانی فنکار کس طرح روز بروز مفلس وقلاش بنایا جاتا ہے۔ کسانوں اور ہندوستان کے مزدوروں کی اقتصادی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ دن بہ لگان کا اضافہ ہو رہا تھا چنانچہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۸ء میں اڈیٹر مخبر عالم نے دنیا کے کسانوں کی آمدنی کا نقشہ دیا ہے۔ پھر ہندوستان کے کسانوں کی آمدنی کا نقشہ پیش کیا ہے کہ باوجود زیادہ مشقت کرنے کے ہندوستانی کسان کی آمدنی دنیا کے کسانوں کے مقابلے میں کم ہے۔

"روئے زمین کے تمام ممالک سے زیادہ ہندوستان میں کاشتکاری ہوتی ہے اور یہاں کے کسان تمام دنیا کے کسانوں سے زیادہ مشقت کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہندوستان کے کسان ہی دنیا بھر کے کسانوں سے زیادہ مفلس اور محتاج ہیں۔ اس کا اصلی سبب (۱) اجلد انعقاد بندوبست (۲) زیادتی لگان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ ناظرین کی دل چسپی کے لحاظ سے دنیا بھر کے کسانوں کی فہرست معہ آمدنی درج کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ برٹش راج کے سب سے چمکتے ہیرے ہندوستان کے بدقسمت اور بدبخت کسانوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔

نام ملک	سالانہ آمدنی	نام ملک	سالانہ آمدنی
فرانس	۲۱۵ روپے	آئرلینڈ	۱۹۸ روپے
عرب	۱۰۲ "	اسپین	۱۵۳ "
انگلستان	۲۳۱ "	برما	۱۱۷ "
مراکو	۱۳۷ "	مصر	۱۶۲ "
پرتگال	۱۱۸ "	ترکی	۱۳۴ "

نام ملک	سالانہ آمدنی	نام ملک	سالانہ آمدنی
جاپان	۲۹ روپے	اٹلی	۱۴۹ روپے
آسٹریا	۱۶۱ 〃	امریکہ	۱۳۴ 〃
جرمنی	۱۸۴ 〃	فارس	۱۵۵ 〃

یہ تھی غیر ممالک کے کسانوں کی آمدنی۔ اب ہندوستان کے مختلف صوبوں کی آمدنی ملاحظہ ہو۔

نام صوبہ	روزانہ کارگذاری	کارگذاری سالانہ	سالانہ آمدنی	زرمالگذاری فی بیگھہ
صوبجات متحدہ	۹½ گھنٹے	۸ ماہ	۴۰ روپے	۲ روپے ۴ آنے
پنجاب	۸½ 〃	۶½ 〃	۴۰ 〃	۳ روپے
راجپوتانہ	۱۰ 〃	۸¾ 〃	۲۸ 〃	۲ روپے ۲ آنے
بمبئی	۸ 〃	۷½ 〃	۳۸ 〃	۳ روپے
وسط ہند	۸ 〃	۸ 〃	۴۵ 〃	۳ روپے ۴ آنے
بنگال	۵ 〃	۴ 〃	۹۲ 〃	۲ روپے ۸ آنے
مدراس	۶ 〃	۵ 〃	۶۲ 〃	۲ روپے ۱۲ آنے
صوبجات متوسط	۷ 〃	۶ 〃	۵۰ 〃	۳ روپے ۱۲ آنے

(مخبر عالم ۱۲؍اپریل ۱۹۰۸ء)

جب بھی کوئی غیر ملکی ہندوستان کی آزادی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا تو ہندوستانی اس کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ لندن کریل انسٹی ٹیوٹ میں لارڈ کرزن کی صدارت میں مسٹر جوزف صاحب نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو دوسرے ہندوستانی اخباروں کی طرح مخبر عالم نے بھی مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۰۹ء میں ان کی تقریر کے حصہ کو شائع کیا۔

"آپ فرماتے ہیں کہ کونسلوں کی اصلاح میں سرکاری مجارٹی کو موقوف کرنا ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ ہر چند وائسرائے ہند کو ہر یک مناسب تجویز کو منسوخ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے لیکن اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے کام میں حرج اور انتظام میں خلل واقع آئے گا اور بعد میں سرکار کو پچھتانا پڑے گا۔ آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اہل ہند میں ناراضی کی فیلنگ موجود ہے لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہاں حکومت جمہوری جاری نہیں کی جاتی۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہل ہند حکومت جمہوری چاہتے ہیں بقول آپ کے اہل ہند صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی لوگ عزت اور اعتبار کے عہدوں پر بلا تمیز قومیت کے مقرر کئے جائیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں باوجود قابلیت اور تجربے کے اعلیٰ مناصب سے محروم کئے جاتے ہیں تو اس کا وہ رنج ضرور محسوس کرتے ہیں۔ سر بلفاٹ اس بات پر خوش ہیں کہ مسٹر سنہا کونسل وائسرائے کے ایگزیکیوٹو ممبر مقرر کئے گئے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ امپریل اور پراونشل سروس کی تمیز موقوف کی جائے۔ ہر یک محکمہ میں آسامیوں کے دو حصے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں کے حصہ پر وزیر ہند صاحب ولایتی لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں اور ادنیٰ عہدوں کے حصہ پر دیسی لوگ مقرر کئے جاتے ہیں اور یہاں بھی انگریزوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور ہندوستانیوں کی قابلیتوں کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ یہ بہت برا ہے، ان کا خیال ہے کہ وزیر ہند کی سرپرستی بالکل اٹھا دینی چاہئے۔ اعلیٰ عہدوں کا ایک خاص حصہ ہندوستانیوں کے لئے مخصوص رکھنا چاہئے تاکہ ان کو گورنمنٹ کی نیک نیتی کا یقین ہو اور یہ خیال نہ کریں کہ سرکار ان پر اعتبار نہیں کرتی ہے۔ آگے چل کر سر بلفاٹ صاحب نے ہندوستانی عہدے داروں کی وفاداری اور بیدار مغزی کی تعریف کی اور کہا تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ کئی ہندوستانی بلحاظ لیاقت تجربہ اور معاملہ فہمی کے انگریز افسروں سے افضل ہیں مگر پھر بھی اعلیٰ عہدوں پر ان کی ترقی کو بے پروائی سے نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس سے بددلی پیدا ہوتی ہے۔ بے وجہ نہیں ہے جو ہندوستانی ماتحت عہدوں پر کام کرتے ہیں وہ اپنے افسروں کو سبق دیتے ہیں لیکن اس پر بھی وہ ترقی

کی مدد نہیں کر سکتے اور یہ کہا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ اکثر ایسا سلوک کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہ حقیر اور ناچیز ہیں۔ انگریزوں کی ناقص بے پروائی اور عجلت پسندی ہی اس خرابی کی ذمے دار ہے جو خود کو تیس مار خاں سمجھ کر کسی دیسی کو خیال میں نہیں لاتے اور قوم و سرکار دونوں کو بدنام کرتے ہیں وہ ہندوستانیوں کو وحشی اور ناقص سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھ بوجھ میں ان سے کہیں زیادہ مدبر اور ہیچ ہیں۔ ایسے ہی ریلوے کے سفر میں جس بدسلوکی اور بدتہذیبی سے ہندوستانیوں کی بے توقیری اور ذلت کی جاتی ہے اگرچہ ہندوستانی لوگ بظاہر اس کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن دلوں میں اس کا اثر بخوبی ہو جاتا ہے اور ایک شخص واحد کی بدخواہی تمام قوم کو بدنام کر دیتی ہے اور ایسے طریقوں سے دل بگڑ جاتے ہیں۔ ہندوستانی لوگ اپنی عزت کی بہت قدر کرتے ہیں اور جب انگریز اپنی فرضی حیثیت کے زعم میں ان کی عزت بگاڑتے ہیں تو بے چینی اور شورش کا پیدا ہونا واقعی ایک امر لازم اور قدرتی ہے غرضیکہ جب تک ان تمام باتوں میں احتیاط نہ کی جائے گی۔ سر بفیلڈ فرماتے ہیں کونسلوں کی اصلاح سے ہرگز ہرگز کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ علاج وہی صحیح ہوتا ہے جو مرض کی تشخیص کے بعد کیا جائے لیکن کونسل کی اصلاح سے اصل مرض کا علاج نہ ہوگا جب تک حکومت سر بفیلڈ کی رائے کے مطابق عمل نہ کرے گی۔"

۱۹۱۲ء میں پریس ایکٹ ہندوستانی اخبار والوں کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اخبار سے ضمانت مانگ لی جاتی تھی اور اخبار بند کر دیا جاتا تھا جس سے اخباری طبقہ میں ایک دہشت پھیلی ہوتی تھی مخبر عالم نے بھی اس پریس ایکٹ کو ختم کرانے کے لئے ۲۸ فروری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں ایک اداریہ لکھا تھا۔

"تمام اردو اخبارات اطراف و اکناف بھی ترمیم پریس ایکٹ کے لئے شور کر رہے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی آواز کہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کے کانوں تک پہونچتی ہے۔ اخبار ہی وہ قابل اطمینان ذریعہ خبر رسانی ہے جس سے گورنمنٹ نے مدتوں فائدہ اٹھایا ہے اور اب وہ ہر ضروری یا غیر ضروری خبر کو اس قانونی شکنجہ کے خوف سے لکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اسی وجہ سے اکثر ضروری خبریں بھی گورنمنٹ تک نہیں پہونچ سکتیں۔ چنانچہ مہاراجگان بڑودہ و دیناک کے حالات و واقعات کیا کسی ہندوستانی اخبار کو پہلے سے معلوم نہیں تھے۔ مگر ان کا کسی اخبار میں اشارۃً بھی ذکر نہ آسکا اور دربار دہلی کے موقع پر ان حالات کا عام طور پر انکشاف ہوا اور وہ بھی جبکہ اخبار لندن ٹائمز نے اس معاملہ پر خاص طور پر روشنی ڈالی۔ افسوس

ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اخبار اس معاملہ میں بھی اسی پریس ایکٹ کی وجہ سے خاموش رہے اور سات سمندر پار کے اخبار نے ان حالات پر رائے زنی کی اور اس ضمن میں ہندوستانی اخبارات کی بے چارگی کا بھی ذکر کیا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ ساری باتیں اسی پریس ایکٹ کی بدولت ہوئیں۔ علاوہ ازیں لطف تو یہ ہے کہ گو یہ ایکٹ بداندیش و مخالف گورنمنٹ طبقہ کے لئے نافذ کیا گیا تھا مگر ان کے ساتھ خیر خواہ ملک و گورنمنٹ بھی شامل ہو گئے اور دوست دوشمن ایک درجہ میں آ گئے ہیں۔"

پریس ایکٹ کو منسوخ کرنے کے لئے تحریر عالم نے کافی کوشش کی اور ایک اداریہ ہی نہیں بلکہ کئی اداریئے تحریر کئے۔ چنانچہ ۵ار جون ۱۹۱۲ء کا اداریہ ان طویل اداریوں میں ایک ہے اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ ہوں عنوان ہے "پریس ایکٹ ضرور قابل منسوخی ہے"

"ہمعصر افغان نے اپنے اخبار مطبوعہ ۵ جون میں معاصرین کی سہل نگاری اور پریس ایکٹ کی سختیوں کے خلاف "افغان کی چھٹی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر اس امر کی شکایت کی ہے کہ اس کی اس انگریزی چھٹی کا جس میں ہمعصران سے مندرجہ ذیل امور کا جواب چاہا گیا تھا کہ آیا

۱۔ آپ کے خیال میں اس قانون مطابع کا اصل منشاء کیا ہے ؟
۲۔ کیا اب بھی پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی ضرورت ہے۔ ؟
۳۔ اب اس قانون کی ضرورت نہیں یا ہے تو کن وجوہ سے۔ ؟

مگر بجز ایک آدھ جواب کے اور کسی ہمعصر کی کوئی تحریر موصول نہیں ہوئی ورنہ وہ ان تمام تحریروں کو یکجا کر کے ایک درخواست کے ساتھ وائسرائے ہند کی خدمت میں پیش کرتا جہاں سے ممکن تھا کہ اس غدارانہ اور مغویانہ لٹریچر کے انسداد والے قانون کو اب محض بے ضرورت اور ناگوار سمجھ کر اس کی جکڑ بند سے آئندہ پریس کو نجات ملتی اور آئے دن یہ سننے میں نہ آتا کہ آج فلاں اخبار سے ضمانت طلب ہوئی۔ فلاں کو نوٹس دیا گیا، اس کو ہدایت کی گئی۔ نئے اخبار مطابع وغیرہ کا باب اشاعت بند ہو چلا۔ گو معاصرین کی اس سہل نگاری کی افغان کو واقعی اور بجا شکایت ہے اور افسوس ہے کہ ہمیں معاصر افغان کی ایسی کوئی بھی چھٹی نہیں پہونچی ورنہ ہم ضرور اس کا جواب لکھتے ہاں اب ۵ار جون کے افغان کے ساتھ اس کا خط نمبری ۳۰۲ مورخہ ۵ار جون ۱۹۱۲ء بھی ملا ہے جس میں ہم سے بھی انھیں امور کا جواب چاہا

گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کے پہلے استفسار "آپ کے خیال میں اس قانون مطابع کا اصل منشا کیا ہے ؟" کا یہی جواب ہے کہ جس زمانہ میں اس پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا تھا وہ ایک ایسا پر آشوب زمانہ تھا مگر جب بنگال سے یہ پر آشوب کالی گھٹائیں اٹھ کر پنجاب تک برس چکیں اور ہندوستان کا مطلع صاف ہو گیا تو یہ بے ضرورت ایکٹ عام اخباروں کی آزادانہ رفتار میں خلل انداز ہونے لگا اور باہمی ملالوں اور رنجشوں اور مترجموں کی غلطی اور لیں صاحبانِ ضلع کے اردو نہ جاننے کے باعث موجودہ اخبارات سے بھی ضمانتیں طلب ہونے لگیں اور وہ خیر خواہ ملک اخبارات جو اپنے شہر اور اپنے صوبے کی عدالتوں اور عام محکمہ جات اور ان کے عمال دولیسی ریاستوں کی سختی اور بے جا کارروائیوں کی حکام، علی دگورنمنٹ کے کانوں تک پہونچاتے تھے وہ بھی اس ایکٹ کے ذریعہ خوف زدہ کئے گئے اور انھیں مجبوراً خاموش رہنا پڑا اور یہی شکایتیں بھی پردے میں رہیں۔ اس وجہ سے جب پبلک کا نقصان اور گورنمنٹ کا خود ایک معقول ذریعہ خبر رسانی ابتر ہوا تو یہ ایکٹ عام طور پر بے ضرورت اور ناگوار معلوم ہونے لگا جو اب کسی طرح مفیدِ ملک و حکومت نہیں چنانچہ حال ہی میں بنگالی اخبار نویسوں نے اس بے ضرورت ایکٹ کی منسوخی کا ایک میموریل صاحب سکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا مگر افسوس ہے کہ ان کے جواب نے اس وقت تو اس کی منسوخی کی امید کو منقطع کر دیا ہے۔ صاحب موصوف نے فرمایا ہے۔

"بعض اخبار نویسوں کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ پریس ایکٹ بغاوت اور غدارانہ سازشوں کے انسداد کے لئے نافذ ہوا تھا" حالانکہ قانونِ مذکور کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔"

صاحب موصوف کا یہ جواب بطور خود ایک معمہ اور چیستاں ہے جو انتہا درجہ کا پر معنی اور کمال وسعت رکھتا ہے اور سخت محتاج تشریح کے ہے اور اس نے شدید ضرورت پیدا کر دی ہے کہ پریس اپنی متفقہ قوت سے اس امر کی کوشش کرے کہ گورنمنٹ عالیہ اس قانون کو منسوخ فرما دے اور اگر فی الواقع اب بھی اس کے نفاذ کی ضرورت لاحق ہے تو صاف طور پر معلوم ہو سکے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ "کیا اب بھی اس قانون کی موجودگی کی ضرورت ہے ؟" اس کا جواب بھی سوال نمبر ایک میں آچکا ہے اور کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو یہ ایکٹ سود مند اور مفید ہو بلکہ اخبارات کی ترقی اور جائز آزادی اور خبر رسانی کا سد راہ ہے چونکہ جس وقت یہ ایکٹ گورنمنٹ

کے لئے مفید سمجھا گیا تھا تو کسی خیر خواہ اخبار نے مخالفت نہیں کی تھی بلکہ اس کو یک عارضی قانون سمجھ کر اس کا خوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا تھا لیکن جب وہ ضرورت رفع ہو گئی تو یہ ایکٹ قابلِ منسوخی سمجھا گیا اور یہی جواب "افغان" کے تیسرے دریافت طلب سوال کا ہو سکتا ہے اور اگر اس قانون کی ضرورت نہیں رہی ہے تو کس وجہ سے۔ ؟ جب جوابات اول و دوم میں پورے طور پر واضح ہو چکا ہے کہ کن وجوہ کی بنا پر یہ قانون نافذ کیا گیا تھا اور اب کہ ان وجوہ کی بیخ کنی ہو چکی ہے تو بظاہر کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ یہ قانون اب مفید ثابت ہو سکے اگر دوسرے فرسودہ قوانین کی الماریوں میں یہ قانون بھی رکھنا منظور ہو تو اور بات ہے چونکہ شروع زمانۂ حکومت سے بعض قوانین اب تک رائج ہیں، چنانچہ ایسے ہی قانون سے برسوں بعد پنجاب میں کام لیا گیا تھا لیکن ہم اس امر سے واقف ہیں کہ بغیر خاص توجہ دلائے گورنمنٹ اس قانون کو منسوخ فرما دے گی کیونکہ گورنمنٹ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ مٹھی بھر مٹی اور چلو بھر پانی لے کر بچوں کی طرح گھروندہ بنائے اور بگاڑے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی پریس اپنی پوری قوت سے متفقہ طور پر گورنمنٹ کو اس ایکٹ کی طرف توجہ دلائے تو وہ ضرور اس کی سچی اور جائز خواہش کی تکمیل فرمائے گی اور اخبار والوں کے گلے کی یہ پھانسی جلد نکل جائیگی"

پریس ایکٹ سے اخبارات کو کافی نقصان پہونچا۔ ان سے معمولی معمولی باتوں پر ضمانتیں طلب کر لی جاتی تھیں جس کی وجہ سے کافی اخبارات ضمانتیں نہ دے سکے اور بند ہو گئے۔ مخزن عالم نے ایسے اخبارات کی سرکاری رپورٹ ۱۵ فروری ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع کی ہے۔

"پریس ایکٹ کی دفعات ۸، ۱۰، سنہ ۱۹۱۳ء کے تحت جس قدر اخبارات اور مطابع بند ہوئے یا زیر ضمانت ہوئے ہیں ان کی صحیح تعداد صوبہ وار حسب ذیل ہے۔ صوبہ مدراس میں آٹھ اخبارات سے ضمانت طلب کی گئی جن میں سے تین نے مطلوبہ رقم جمع کر دی اور پانچ بوجہ عدم ادائے ضمانت بند ہو گئے۔ بنگال کے اخبارات میں سے چھ کو ضمانت داخل کرنے کا حکم ہوا، جن میں سے پانچ نے داخل کر دی اور ایک روزنامہ "حبل المتین" اردو بوجہ عدم ادخالِ ضمانت بند ہو گیا۔ صوبہ جات متحدہ میں بھی چھ اخبارات قابلِ ضمانت سمجھے گئے تھے، جن میں سے پانچ حکم ادخالِ ضمانت کے بعد اب تک شائع ہی نہیں ہوئے اور چھٹے کے متعلق بھی، جو کانپور کا ایک اخبار ہے، بند ہونے کا شبہ ہے۔ پنجاب میں دو اخبارات سے ضمانت طلب کی گئی، جن کے داخل کرنے کی ابھی تک رپورٹ نہیں آئی ہے۔ صوبہ سرحد

میں ایک اخبار "افغان" سے بھی ضمانت طلب کی گئی ہے۔ برما میں بھی اس ایکٹ نے دو اخبارات کا گلا دبا دیا تھا لیکن وہ مطلوبہ ضمانت داخل کر کے اس کے پنجہ سے رہا ہو گئے اس حساب سے گذشتہ سال میں ۳۲ اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئی تھیں جن میں سے نصف کے قریب ضمانتیں داخل نہ کرنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ نے جن مطابع سے ضمانت لی ہے ان کی تعداد ۵۰ بتائی جاتی ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے مطابع ضمانت داخل نہ کر سکنے کی وجہ سے بند ہو گئے۔ سوائے ایک دو اخبارات کے باقی تمام اخبارات سے ۵۰۰ - ۵۰۰ کی ضمانتیں طلب کی گئی تھیں۔ ۱۹۱۳ء میں اوسطاً ہر مہینے تین اخباروں سے ضمانت طلب کی جاتی رہی ہے لیکن ۱۹۱۴ء کا پہلا ہی مہینہ اہل اخبارات اور مطابع کے لئے کس قدر منحوس ثابت ہوا ہے وہ پریس ایکٹ کی ترمیم کے منظور نہ ہونے اور "زمیندار اسٹیم پریس" کی دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کرنے اور سامان پریس کے ضبط ہونے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے جس کا تمام اخباری دنیا کو افسوس ہے اور ہمعصر "زمیندار" کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔

مخالف بھی مخالفت میں طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے اور نئے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے چنانچہ بنگالیوں نے پوسٹروں، ہینڈبلوں اور بلیٹوں کے علاوہ دھوتیوں پر باغیانہ عبارتیں لکھنی شروع کر دی تھیں اس کا علم جب حکومت کو ہوا، تو وہ کب بخشنے والی تھی چنانچہ ان دھوتیوں پر بھی پریس ایکٹ کا نفاذ کر کے ضبط کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر ۸ مارچ ۱۹۱۲ء کے مخبر عالم میں یہ چھپی ہے۔

وہ منحوس ماہانہ اخبارات و رسائل کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ لیکن جوشیلے بنگالیوں نے دھوتیوں پر بھی قابل گرفت مضامین چھاپنے شروع کر دیئے ہیں اور گورنمنٹ کو اخباروں رسالوں کی طرح ان پر بھی پریس ایکٹ کا اطلاق کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حال میں بنگال میں ایک خاص قسم کی دھوتیاں پائی جاتی ہیں جن پر ایک مشہور بنگالی گیت "اے ماتا الوداع" چھپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ان دھوتیوں کو ضبط کرنے کا فرمان جاری کر دیا ہے۔"

ایڈیٹر مخبر عالم یوں تو آزاد خیال تھے لیکن کانگریسیوں کی ذہنیت سے واقف تھے اس لئے تقریباً ان کی ہر چیز کی دھجیاں اڑاتے تھے اور ان کی پولیں کھولتے تھے۔ کانگریسی مسلمانوں کو شو بوائے کی طرح رکھنا چاہتے تھے لیکن کسی معقول جگہ پر لانے کے خلاف تھے۔ اس ذہنیت کو ۸ جولائی ۱۹۱۵ء کے شمارے میں طشت از بام کیا ہے۔

"آنریبل پنڈت موتی لال نہرو (جو حلقہ الہ آباد کی میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی جانب سے ممبر کونسل ہیں) کی بابت اخبار لیڈر میں بحث شروع ہوئی ہے کہ وہ آئندہ خاص الہ آباد میونسپل بورڈ کی جانب سے ممبری کونسل کے امیدوار ہوں اور مسٹر چینتامنی صاحب بی اے ایڈیٹر اخبار لیڈر حلقہ الہ آباد کی میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی جانب سے امیدوار ممبری کونسل ہوں اور ہماری پیشین گوئی ہے کہ دونوں صاحب اپنی اپنی جگہ پر کامیاب ہوں گے۔ اور ممالک متحدہ کو خواہ گورنران کونسل ملے یا نہ ملے لیکن اس مسئلہ کے متعلق الہ آباد میں جلسہ کرنے کے لیے جو کوشش مسٹر چینتامنی صاحب نے کی ہے اس کا انہیں ضرور نتیجہ ملے گا اور اب کے وہ کونسل کے ممبر ہو جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اخبار لیڈر کے نزدیک الہ آباد میں یا حلقہ الہ آباد میں کوئی ایک بھی مسلمان اس قابل نہیں ہے جو ممبری کونسل کا اہل ہو۔ کیا ہمارے یاران وطن کو مسلمانوں کی صرف اسی کام کے لئے ضرورت ہے کہ جب کانگریس والوں کو کسی آواز کو زوردار بنانا ہو تو مسلمانوں کو شریک جلسہ کر کے ان کی شرکت کو اہم اور نمایاں کیا جائے اور جب ممبری کا وقت آئے تو مسلمانوں کو ناقابل بنا کر علیحدہ رکھا جائے۔"

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور ان کے ساتھی اسیر مالٹا بنا دیئے گئے تھے تو اس کے بعد حکومت برطانیہ نے ریشمی رومال کی تحریک کی تفتیش کے لئے ولایت کے جج رولٹ صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں ہندوستان کے چند یورپین حکام اور ججوں کے علاوہ دو ہندوستانی جج بھی شامل کئے تھے۔ اس نے اپنی ایک رپورٹ تیار کی۔ اس کے کچھ اقتباسات ۵ / اگست ۱۹۱۸ء کے مخبر عالم میں چھپے ہیں۔

"انگلستان کے دشمنوں کی مدد کے خواہش مند چند مسلم افراد تھے۔ پندرہ لاہوری طلبہ جنوری ۱۹۱۵ء میں کالجوں کو چھوڑ کر سرحد کے مجاہدین کی طرف گئے۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں آٹھ طلبہ ایک اور جماعت مشرقی بنگال کے مقامات رنگ پور اور ڈھاکہ سے جا کر مجاہدین کے لئے آٹھ ہزار روپے لے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی مجاہد بن چکے تھے اور چندہ کر کے وطن کو گئے تھے اگست ۱۹۱۶ء میں ایک سازش منکشف ہوئی جس کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی۔ مدعا یہ تھا کہ سرحد پر حملہ کرانے اور ہندوستان کے اندر فساد کرنے سے برطانیہ حکومت تباہ کی جائے اس کی تکمیل کے لئے مولوی عبداللہ مع عبیداللہ، فتح محمد، محمد علی اگست ۱۹۱۵ء میں سرحد سے پار ہو گئے عبیداللہ سکھ نومسلم ہے، اس نے دیوبند میں تعلیم پائی وہاں اس نے چند طلبہ اور معلمین کو بھی ہم خیال بنا لیا۔ مولانا محمود الحسن بھی جو مدرسہ دیوبند کے سالہا سال سے اوّل مدرس

تھے، اس کے اثر میں آ گئے مگر مدرسہ کے مہتمم اور کمیٹی نے بروقت تدارک کر دیا اور عبید اللہ مع سرکردہ رفقاء خارج کر دیا گیا۔ بعدہٗ حساب و کتاب کے متعلق بھی عبید اللہؒ کی گڑبڑ پائی گئی۔ عبید اللہ مع رفقاء پہلے مجاہدین کے پاس گیا۔ پھر کابل جہاں ترکی۔ جرمن مشن کے ارکان سے ملا اور ان سے بھائی چارہ قائم کیا۔ اس کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی اس سے وہاں جا ملا۔ یہ شخص مولانا محمود الحسن کے ہمراہ عرب جا کر ۱۹۱۶ء میں واپس آیا۔ اور جہاد کا اعلان ہمراہ لایا۔ جو غالب پاشا موجود الوقت ترکی فوجی گورنر حجاز نے مولانا کو دیا تھا۔ اس اعلان موسومہ "غالب نامہ" کو محمد میاں دوران سفر ہندوستان اور سرحدی قبائل میں تقسیم کرتا گیا۔ جرمن مشن کے ساتھ مہندر پرتاپ بھی آیا تھا جسے ہردیال نے سوئزرلینڈ میں ورغلایا تھا۔ برکت اللہ بھوپالی جو جاپانی یونیورسٹی سے موقوف ہو کر امریکہ میں غدر پارٹی میں جا ملا تھا۔ برلن سے کابل آیا ہوا تھا، ان سب نے مل کر تجویز سوچی کہ انگریزوں کے اخراج کے بعد ہنگامی حکومت قائم کی جائیگی مہندر پرتاپ پریسیڈنٹ ہوگا اور برکت اللہ وزیر اعظم اور عبید اللہ وزیر ہند۔ جرمن مشن ناکام بننے پر ۱۹۱۶ء کے اوائل میں افغانستان سے واپس ہو گیا مگر ہندوستانی وہیں رہے اور ان کی ہنگامی گورنمنٹ نے روسی گورنر ترکستان اور زار روس کو خط بھیجے کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اخراج میں مدد کریں۔ زار کو سنہری لوح پر خط لکھا گیا۔ ترکوں سے بھی مدد مانگنے کے لئے ایک خط مولانا محمود الحسن کو لکھا گیا جس کی تاریخ ۸ رمضان مطابق ۹ جولائی ۱۹۱۶ء تھی۔ یہ خط شیخ عبدالرحیم ساکن حیدرآباد سندھ بدیں ہدایت بھیجا گیا کہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ یا خود لے جا کر اسے بمقام مکہ مولانا محمود الحسن کو پہنچا دے۔ عبدالرحیم اب روپوش ہے یہ خط انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ اسے ہم نے بھی معائنہ کیا ہے۔ یہ زرد ریشم پر نہایت خوشخط لکھا گیا ہے۔ اس میں ترکی جرمن مشن کی آمد، "غالب نامہ" کی تقسیم اور ہنگامی حکومت کے قیام کے ذکر کے بعد خدائی لشکر کی ترتیب کا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ یہ فوج ہندوستان سے بھرتی کی جائے اور مسلمان حکمرانوں میں اتحاد قائم کرایا جائے۔ مولانا محمود الحسن یہ تمام باتیں ترکی حکومت تک پہنچا دیں۔"

"خدائی لشکر کی تجویز یہ تھی کہ صدر مقام مدینہ میں ہو۔ مولانا سپہ سالار اعظم ہوں۔ قسطنطنیہ طہران و کابل میں ضمنی صدر مقام بنائے جائیں۔ کابل میں خود عبید اللہ جرنل ہوگا۔ فہرست منسلکہ میں تین سر پرستوں، ۱۲ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے دیگر اعلیٰ جنگی افسروں کے نام ہیں۔ لاہور

کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل اور ایک کو کرنل اور چھ کو لیفٹیننٹ کرنل بنایا گیا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اکثر مجوزہ اشخاص سے ان تقرریوں کے متعلق کوئی مشورہ نہ کیا جا سکا تھا۔ تاہم ان ریشمی خطوط کے مضامین کی وجہ سے بعض بعض احتیاطوں کا انتظام مناسب سمجھا گیا اور وہ کر لیا گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقا میں سے چار شخص انگریزوں کے ہاتھ آ گئے اور اب ایک برطانوی مقبوضہ میں اسیران جنگ ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا تھا وہ بھی اسیر جنگ ہے اور ایک کا غذ پر جو مولانا محمود الحسن کی جماعت نے اس کے سامنے پیش کیا تھا دستخط کرنے کو تسلیم کر چکا ہے۔"

"یہ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ چند مسلمان ہندوستان میں پہلے فساد پھر بغاوت برپا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ مخفی سازشوں سے بے کراعلانیہ قرد کے لئے درپے ہیں بعض اوقات رنگروٹ بھیجتے اور روپیہ جمع کر کے روانہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ خود بھی جاتے ہیں۔"

پریس ایکٹ کا تعلق اخبارات سے تھا لیکن برطانیہ حکومت نے عوام پر بھی ٹیکس لگانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ اس سے پریشان ہو گئے تھے چنانچہ مراد آباد میں جو ہاؤس ٹیکس نافذ ہوا تھا اس سے پبلک چلا اٹھی۔ پبلک کی آواز کے ترجمان مخبر عالم مراد آباد نے بھی ۵ جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارے میں تحریر کیا۔ جس کا عنوان "مراد آباد میں مزید ٹیکس" تھا۔

"اس عنوان سے میونسپل گزٹ لاہور لکھتا ہے کہ مراد آباد میں ابھی تک لوگ ہاؤس ٹیکس سے پریشان تھے جس کی تجویز میونسپل بورڈ نے منظور کر لی ہے کہ حال میں بورڈ نے گاڑیوں کے پہیوں پر ٹیکس تجویز کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ہاؤس ٹیکس کی موجودگی میں بورڈ کو ایسے دوسرے ٹیکس عائد کر کے رعایا کو پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں اگر میونسپلٹی آگرہ کی طرح وہ ایسے ٹیکس عائد کر کے لوگوں کو ہاؤس ٹیکس سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو ہم میونسپل بورڈ مراد آباد کے ممبران کی تعریف کریں گے اور اگر اس کے خلاف بورڈ ہاؤس ٹیکس کے علاوہ یہ نئے ٹیکس لگانا چاہتا ہے تو ہم ان سے اہل شہر کی واویلا پر توجہ کرتے ہوئے درخواست کریں گے کہ وہ اہل شہر کو زیادہ ٹیکسوں سے نہ ستائیں۔"

ہم عصر موصوف کو شاید یہ نہیں معلوم کہ مراد آباد میں ہاؤس ٹیکس اور جدید ٹیکسوں کے علاوہ ابھی تو چنگی بھی قائم رہے گی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ڈرینج ورکس کے غیر معمولی صرف کثیر سے چنگی بہت زیر بار ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں مراد آباد پر گویا تین قسم کے ٹیکس عائد ہو جائیں گے۔ اور باشندگان مراد آباد ہرگز اس کی برداشت کی قوت نہیں رکھتے۔ بڑا افسوس ہوگا اگر ممبرانِ چنگی مراد آباد نے ممبران چنگی آگرہ کی طرح ان جدید ٹیکسوں کی وجہ سے ہاؤس ٹیکس کو نہ روکا۔ اور جب آگرہ جیسے شہر میں ایک دم دو ٹیکسوں کے قائم کئے جانے پر اعتراض ہوا تو پبلک مراد آباد کب اس بارگراں کے اٹھانے کے قابل ہے۔ اس لئے حکام و گورنمنٹ کو اس طرف توجہ فرما کر ان جدید ٹیکسوں سے پبلک مراد آباد کو جو اس بارگراں کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی ہے، محفوظ رکھا جائے اور ممبرانِ چنگی کو خاص طور پر باشندگانِ مراد آباد کی مفلوک الحالی ظاہر کر کے اس آفت سے نجات دلانا چاہئے۔"

مراد آباد میں ہاؤس ٹیکس کے اعلان سے شہریوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی وفد ملے۔ خیال تھا کہ ان احتجاجات کا حکومت پر اثر ہوگا۔ لیکن حکومت نے کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ مالکان مکان کو نوٹس وصولی کے جاری ہو گئے۔ تنازعہ فضا میں زیادتی ہوگئی حتیٰ کہ ممبران چنگی نے نوٹس بھی دیئے، جلسے بھی ہوئے جن کی کاروائیاں ۵ فروری سنہ ۱۹۱۵ء، ۲۳ فروری سنہ ۱۹۱۵ء یکم مارچ سنہ ۱۹۱۵ء اور ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۱۵ء کے شماروں میں چھپی۔

"مراد آباد میں جو عرصہ سے ہاؤس ٹیکس کی تجویز و تشخیص کا انتظام ہو رہا تھا بالآخر مکمل ہو کر یکم اپریل سے باقاعدہ جاری ہو جائے گا جس کی نسبت میونسپلٹی نے حال میں جا بجا نوٹس لگا دیئے ہیں کہ فہرست ہاؤس ٹیکس بالکل مکمل ہو گئی ہے جس کا معائنہ بلا کسی فیس کے دفتر میونسپل بورڈ مراد آباد میں ہر شخص کر سکتا ہے اور ۴ مارچ تک اس کے متعلق عذرداریاں قبول کی جا سکتی ہیں اور اگر تشخیص ہاؤس ٹیکس میں واقعی غلطی ہے وہ دور کر دی جائے گی مگر گذشتہ کاروائیاں دیکھتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ اس سے مفر ہو سکے۔ کیونکہ چند متفقہ جلسوں اور باقاعدہ عرضداشتوں کے علاوہ ایک ڈیپوٹیشن لیفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے حضور میں بھی پیش ہو کر مایوس اور ناکام رہ چکا ہے۔ جس کی بظاہر وجہ ہے کہ چنگی مراد آباد ڈرینج ورک کے سبب سے بہت سخت زرِ قرض کی زیر بار ہو چکی ہے جس کی ادائیگی کی وجہ سے ہاؤس ٹیکس و چنگی دونوں تا وصول زرِ قرض جاری رہیں گے اور علاوہ ادائے قرض صفائی وغیرہ کے متعلق ابھی اور بہت سی ضرورتیں واقع ہیں جن کا پورا کیا جانا لازمی ہے۔ اس لئے سنا ہے کہ پانچ روپے سیکڑہ سالانہ کرایہ پر ہاؤس ٹیکس تجویز ہو کر اپریل سے جاری

ہوجائے گا۔ جس کے خیر مقدم کو ہر حالت میں اہل مرادآباد موجود ہیں مگر اس گرانی و پریشانی کے عالم میں اس وقت اس ٹیکس کا نفاذ پذیر ہونا افسوسناک امر ہے۔ کاش جس طرح کہ ٹیکس دو تین سال سے زیر غور چلا آرہا تھا کچھ دن اور ملتوی رہتا اور جب کہ آنے والی فصل کے بعد گرانی و عام پریشانی دور ہوجاتی تو یہ ٹیکس جاری کر دیا جاتا تو بہت مناسب تھا کیا اچھا ہو کہ صاحب چیرمین بہادر و لوکل گورنمنٹ اس جانب توجہ فرماکر پبلک مرادآباد کو ممنون فرمائیں۔

اور امید ہے کہ تمام عذر داریاں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ نہ کہ سقوں اور قصابوں کی پنچایت کی طرح بالکل معافی کی کوشش کی جائے۔

مخبر عالم ۵ ر فروری ۱۹۱۵ء

"ہم گذشتہ ہفتے لکھ چکے ہیں کہ مرادآباد میونسپلٹی نے اجراء ہاؤس ٹیکس کے متعلق عام اطلاع نامے جاری کر دیئے ہیں۔ جس کے سبب پبلک مرادآباد اس گرانی و قحط سالی کے عالم میں نہایت پریشان ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں کا ایک جلسہ بہ تحریک حکیم مولوی ہدایت علی صاحب لکھنوی و حکیم مولوی سیّد دائم علی صاحب امام جامع مسجد و مولوی مرزا اسحاق بیگ صاحب و حکیم مرزا فرخ بیگ صاحب ۱۹ ر فروری کو بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ جس میں علاوہ مسلمانوں کے کچھ ہندو حضرات بھی آگئے۔ اور انھوں نے یہ تحریک پیش کی کہ اس ہاؤس ٹیکس کا ہر دل پر اثر ہے۔ اس لئے بجائے جامع مسجد کے میدان عیدگاہ میں ایک مشترکہ ہندو مسلمان اور عیسائیوں کا جلسہ ہونا چاہئے جو باتفاق عام منظور ہو کر تجویز ہوا کہ ۲۱ ر فروری کو میدان عیدگاہ میں متفقہ جلسہ کیا جائے چنانچہ اس مختصر سے وقفہ میں ایک عام شہرت ہو گئی اور ۲۱ ر فروری کو اتوار کے دن ۲ بجے اس میدان میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور ہر قوم و ہر فرقہ کے آدمی جمع ہونا شروع ہو گئے جن کی بیس پچیس ہزار سے تعداد ہرگز کم نہ تھی۔ دکانداروں نے کثرت سے دکانیں بند کر دی تھیں۔ قصابوں نے مذبح بند کر دیا تھا۔ سقوں، بھنگیوں، دھوبیوں اور ہر قوم نے اس وقت اپنے اپنے کام کی تعطیل کر دی تھی۔ ۳ بجے کارروائی جلسہ شروع ہوئی۔ باتفاق عام آنریبل سیّد رضا علی صاحب بی اے ایل ایل بی صدر انجمن بنائے گئے۔ سیّد صاحب موصوف نے ایک مختصر مگر نہایت پر معنی تقریر میں عام جوش کو روک کر ہاؤس ٹیکس کی تجویز اور اس کے التوا کا کچھ دنوں رہنا بیان کرتے ہوئے اس موقع پر ممبران چنگی پر نکتہ چینی کو بے موقع بتایا اور کہا کہ اوّل سات روپے آٹھ آنے سیکڑہ کا ہاؤس ٹیکس تجویز ہوا تھا۔ آخر میں تین روپے تین آنہ سیکڑہ

رکھا گیا۔ گر وہی تجویز آج قائم رہتی تو خدا جانے کیا حشر ہوتا۔ اس کے بعد بہت سے ہندو مسلمان عیسائی حضرات نے ریزولیشن ہاؤس ٹیکس سے ناراضگی کے متعلق تقریریں کیں، اور عدم تائید میں ہاتھ اٹھائے گئے۔ دوسرے ریزولیشن میں بذریعہ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ بہادر لوکل گورنمنٹ کی خدمت میں منسوخی ہاؤس ٹیکس کی درخواست مع کارروائی جلسہ بھیجنا منظور ہوا اور ایک ڈیپوٹیشن بھی لیفٹننٹ گورنر بہادر صوبہ متحدہ کی خدمت میں اور اگر وہاں ناکامی ہو تو حضور وائسرائے کے حضور میں پیش ہونا تجویز ہوا۔ مقررین میں قریب قریب تمام تعلیم یافتہ اقوام والے شامل تھے جنہوں نے قحط سالی و گرانی کی شکایت، تجارت، روزگاروں کی کمی، عام فاقہ کشی و مصیبت کا اظہار کرتے ہوئے بیان کیا کہ چنگی بجائے ہاؤس ٹیکس کے کسی دوسری صورت سے کمی پوری کرے اور یہ ٹیکس موقوف فرمائے۔ آخر میں ایس ابن علی کی تحریک بابو گھمی زن صاحبان کی تائید سے یہ ریزولیشن پاس ہوا کہ صاحب چیرمین بہادر سے عرض کیا جائے کہ وہ ایک کمیٹی بجائے ہاؤس ٹیکس دہندہ اشخاص کی مقرر کریں جو یہ تجویز کرے کہ چنگی کے کون سے اصراف ایسے ہیں کہ جو کم ہو کر چنگی کے بار کو کم کر سکیں۔ اس کے لائق تائید کنندہ نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ جناب مولوی عبدالرب صاحب سکریٹری چنگی کی آمدنی قریب ایک چہارم کم تھی مگر یہی صرف تھا۔

وہی سڑکیں ہیں مگر اب کنکر سے چند مقدار کو ڈلوایا جاتا ہے اس طرح ہر زمانے سے بحث کر کے بتایا کہ خواہ مخواہ اصراف زیادہ کئے گئے ہیں، جو کم کرنے چاہئیں۔ مسٹر جارڈن صاحب ایم اے ہیڈ ماسٹر مشن ہائی اسکول نے بھی اپنی تقریر میں اوّل ریزولیشن کی تائید میں فرمایا کہ چنگی کا انتظام خود باشندوں کی خواہش اور ان کی پسند کے مطابق ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ ایسا ہی انتظام ہو۔ قریب پانچ بجے شام جلسہ ختم ہوا۔ اس سے پہلے کبھی مراد آباد میں ایسا عظیم الشان جلسہ متفقہ طور پر نہیں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں ہر شخص بے چین نظر آتا تھا۔ دیکھئے اب ان کی فریاد و زاری کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر امید ہے کہ بیدار مغز لوکل گورنمنٹ ضرور ہمدردانہ توجہ فرمائے گی۔"

(مخبر عالم ۳ فروری ۱۹۱۵ء)

"گذشتہ ہفتہ لکھا جا چکا ہے کہ مراد آباد ہاؤس ٹیکس کے خلاف بغرض عام اظہار ناراضی متفقہ جلسہ باشندگان مراد آباد کا میدان بیرون عیدگاہ میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں ہر قوم و مذہب ملت کے بے شمار آدمیوں کا ہجوم تھا اور ہاؤس ٹیکس سے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے ممبران چنگی مراد آباد

کی بھی کھلی کھلی شکایتیں کی گئی تھیں کہ انھیں کی بدولت اس ناقابل برداشت مصیبت کا سامنا کرنا
پڑا ہے۔ اگر یہ صحیح طور پر ہمارا حق نیابت ادا کرتے تو آج ہمیں اس گرانی و محفظ سالی کے زمانے
میں یہ پریشانی واقع نہ ہوتی۔ اس جلسہ کی مفصل کاروائی ایک ڈیپوٹیشن کے ذریعہ صاحب چیرمین
کی خدمت میں ۵ر فروری کی شام کو پیش کی گئی اور خاص طور پر داد فریاد کی گئی جس کے جواب میں چیرمین
صاحب نے ممبران چنگی کی شکایات کو رد کرتے ہوئے ان کی تمام عرض و معروض کو گورنمنٹ میں
بھیجنے اور تا صدور حکم، سوائے ہاؤس ٹیکس کی بابت جلسہ بورڈ میں رائے پیش فرمانے کا وعدہ فرمایا۔
اس کے دوسرے ہی دن ۶ر فروری کو جلسہ بورڈ تھا جس میں سب سے اول شدید اس گذشتہ
کاروائی سے متاثر ہو کر بجز چار سرکاری ممبران کے اور ایک ہندو منتخب شدہ ممبر کے تقریباً بارہ
تیرہ ممبران نے اپنے اپنے استعفے محض اس عام ناراضگی ہاؤس ٹیکس کی وجہ سے لکھ کر پیش کر دیے۔
نیز مین چار ذیل کے ریزولیشن پاس کئے گئے کہ ہاؤس ٹیکس موقوف فرمایا جائے اور کوئی ڈائرکٹ
ٹیکس قائم نہ ہو بلکہ چنگی وغیرہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ ایک کمیٹی معاملات چنگی پر غور کرنے کے لئے
تجویز ہو۔ وغیرہ وغیرہ اس کے بعد چیرمین صاحب نے تا جواب گورنمنٹ ہاؤس ٹیکس کا استوار
فرمایا۔ اسی تاریخ میں میونسپل ہال میں یہ کاروائی ہو رہی تھی ادھر احاطہ ٹاؤن ہال میں ہزارہا آدمیوں
کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ جو طرح طرح پر داد و فریاد کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اس موقعہ پر بھی ہاؤس ٹیکس
کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔ نظمیں پڑھ رہے تھے۔ بالآخر ایک ممبر صاحب نے باہر نکل
کر اندر کی کاروائی سے لوگوں کو مطلع کیا۔ اور یہ ہجوم کم ہوا۔ مگر ۲۲ر فروری کے بعد ہی جو دوسرے
دن ایک مستقل کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے سرگرم سکریٹری بابو بچھی نرائن صاحب اور بھگوتی پرشاد
وغیرہ ممبران کی جانب سے شہر کے مختلف محلوں میں روزانہ جلسے ہو رہے ہیں اور ہر جگہ ہاؤس
ٹیکس سے ناراضی کا ریزولیشن پاس کیا جاتا ہے اور ڈیپوٹیشن کی تیاری کے لئے چندہ کی تحریک
جاری ہے۔ مسٹر ہو۔ بشمبر سرن جو ممبری سے مستعفی نہیں ہوئے ان کے ووٹر جو ۲۳ ماہ گذشتہ کو
ان کے حق میں ووٹ دے چکے ہیں واپسی کا ریزولیشن پاس کر رہے ہیں۔ شرم شرم شرم کے
نعرے لگائے جاتے ہیں۔ ان روزانہ جلسوں میں باوجود کثرت ہجوم اہل محلہ کی طرف سے حاضرین
کی پان وسگریٹ سے تواضع کی جاتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ابتدا سے اس وقت تک تمام
جلسوں کی کاروائیاں عام طور پر مشتہر نہیں کی گئیں نہ کسی لوکل اخبار کو مفصل حالات سے اطلاعات دی
گئیں۔ جس سے تفصیل وار حالات معلوم ہو سکتے۔ لیکن یہ ضرور سنا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی نہایت

سرگرمی کے ساتھ باقاعدہ کام کر رہی ہے اور شہر میں وصولی چندہ کا کام جاری ہے اور جلد ایک ڈیپوٹیشن تیار ہو کر اوّل لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے حضور میں پیش ہو اور اگر خدا نخواستہ وہاں پہلے کی طرح پھر ناکامی نصیب ہو تو حضور وائسرائے بہادر کی خدمت میں جائے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ ان دونوں درجوں میں کہیں نہ کہیں ضرور کامیابی ہوگی اور یقیناً یہ امید کچھ بے جا نہیں، کیونکہ اب تک یہ کل کارروائی ایک مؤدبانہ طور پر ایسی حالت میں پیش کی گئی ہے اور آئندہ بھی کی جائے گی کہ پبلک کو گرانی اور قحط سالی نے پریشان کر رکھا ہے اور وہ عام کاروبار تجارت کی ابتری سے متفکر ہیں اور واقعی ان کی حالت زار قابل رحم ہو گئی ہے۔"

(مخبر عالم یکم مارچ ۱۹۱۵ء)

"۴ مارچ کو ۸ بجے صبح متصل ریلوے اسٹیشن مراد آباد ایک اور عظیم الشان پبلک جلسہ ہوا جس میں ہندو مسلمان اور ہر فرقہ و مذہب و ملت کے آدمی دس پندرہ ہزار سے کم جمع نہ تھے بالاتفاق ہاؤس ٹیکس کی موقوفی اور قرضہ جنگی میں امداد و خزانہ عامرہ سے دیئے جانے کے متعلق ریزولیشن پاس کئے گئے اور ایس ابن علی ایڈیٹر نیرّ اعظم و لچھمی نرائن دہری جی، بھگوتی پرشاد و مرزا اسحاق بیگ صاحبان نے تقریریں کیں۔ آخر میں مولوی عبدالسلام صاحب مستعفی ممبر چنگی و رئیس مراد آباد جلسہ میں تشریف لائے اور آپ سے نیرّ اعظم کے ایڈیٹر نے تقریر کرنے کی درخواست کی۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں تمہید کے بعد بتایا کہ گذشتہ ممبران چنگی کے سامنے ڈرینج کا کام تجویز ہوا تھا۔ اور ۵ لاکھ روپیہ سرکاری خرچ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ۳۵ ہزار روپیہ سالانہ قسط جو ۲۰ سال کی مدت میں لینا منظور ہوا تھا۔ اب ساڑھے سترہ ہزار روپے سالانہ کی قسط اور چالیس سال کی مدت تک لیا جانا منظور ہو سکتا ہے۔ اس لئے پبلک سے اس کا نیز واپسی استعفوں کا استخراج لینا ضروری ہے۔ یہ تقریر ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ہرگز نہیں ہرگز نہیں کی ہر طرف سے صدائیں آنے لگیں اور لچھمی نرائن کھنہ سکریٹری دہری جی و بھگوتی پرشاد صاحبان نے اس تقریر کے خلاف سخت تقریریں کیں کہ یہ جلسہ اس کام کے لئے ہرگز نہیں ہے عام آواز تھی کہ ہم ہاؤس ٹیکس کی معافی کے خواستگار ہیں نہ کہ تخفیف و کمی کے۔ ہم واپسی استعفے کی رائے نہیں دے سکتے۔ اس وقت جلسہ میں عام جوش اور تلاطم برپا تھا۔ مولوی صاحب نے پھر بھی کچھ کہا مگر اب کون سنتا تھا۔ بالآخر قریب ۱۲ بجے کے جلسہ برخاست ہوا اور وہیں یہ خبر بھی مشہور ہو گئی کہ تمام استعفے منظور ہو گئے پھر یہ کوشش بے کار تھی۔"

(مخبر عالم ۵ مارچ ۱۹۱۵ء)

THE FAUKHRI-I-ALAM
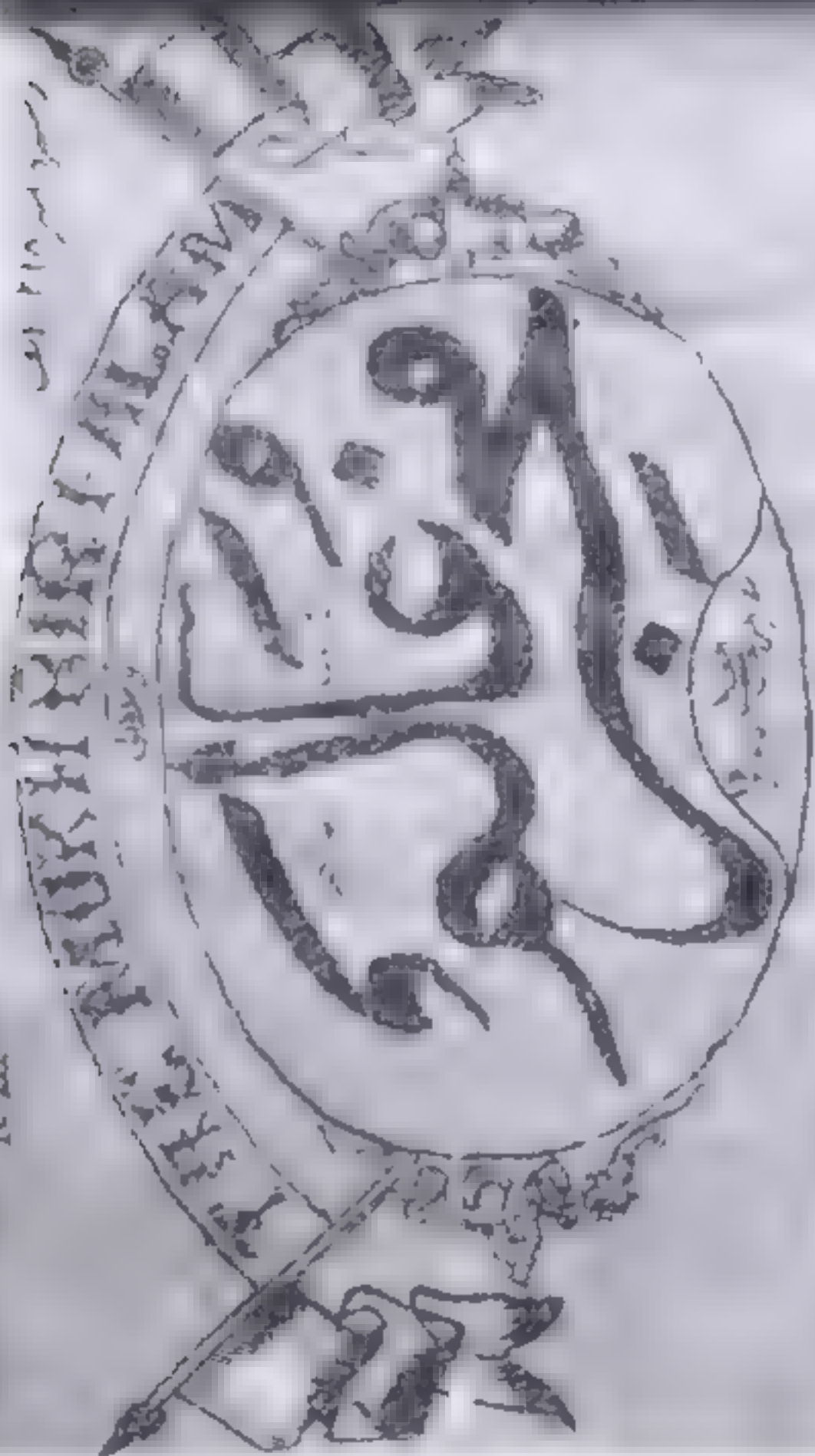
عیسائیت کی تبلیغ

اور

اس کے اثرات

عیسائی مشنری ہندوستانیوں کی غربت سے فائدہ اٹھا کر ان کو عیسائی مذہب میں داخل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے جس سے خوددار و غیرت مند ہندوستانی کڑھتا تھا۔ ایڈیٹر مخبر عالم کو بھی افسوس ہوتا تھا کہ مذہب اسلام میں تبلیغ کرنا انتہائی ضروری کام ہے مسلمان اس سے غافل ہے اور اس پر عمل پیرا نہیں ہے اور عیسائی مشنری اپنے مقاصد میں کامیاب ہورہے ہیں اس کا اظہار انہوں نے ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء کے شمارے میں کیا۔

"ہندوستان میں یورپ کے عیسائی مشنری نے جو مشن قائم کر رکھے ہیں اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے قدم، قلم، سخن اور درم سے جو کوشش کر رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے عیسائیت کی ترقی چنداں تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی۔ ہندوستان میں قحط و وباء کے قدم جمے ہوئے ہیں جس سے غریب ہندوستانی روز بروز تباہ و برباد اور مفلوک الحال بن رہے ہیں۔ ناداری اور کس مپرسی کے باعث وہ عیسائیوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور جو یتیم ہوجاتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح عیسائی مشنریوں کے سایہ میں پہونچ کر اپنے آبائی مذہب کے ظل عاطفت سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ گذشتہ سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے بموجب اس سال کے اندر ہندوستان کی آبادی میں چھ فی صد کا اضافہ ہوا ہے لیکن عیسائی مذہب نے اس عرصہ میں ۳۲ فی صدی کی ترقی کی ہے۔ یعنی سنہ ۱۹۰۱ء میں عیسائیوں کی تعداد ۲۹,۲۳,۲۴۱ تھی جو سنہ ۱۹۱۱ء میں ۳۸,۷۶,۱۹۶ ہوگئی۔ جس طرح عیسائی اپنے مذہب کی ترقی کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی بے پروائی نمایاں ہے۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی اشاعت و حفاظت پر ہمت کے ساتھ کمربستہ ہونا چاہئے کیونکہ اب بے پروائی اور غفلت کا وقت نہیں رہا۔ ہر ایک قوم اپنی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔"

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اس لئے شروع ہوئی کہ ہندوستانیوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ انگریز ہمارا

مذہب و دھرم بدلوانا چاہتے ہیں۔ اتنا بڑا ہنگامہ ہونے کے بعد بھی عیسائی مشنریوں کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ ہندستان کو عیسائی بنانے کی دھن میں لگے رہے جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے نفرت بڑھتی چلی گئی بنارس میں بھی عیسائی مشنریوں نے ایک نابالغ مسلمان لڑکی کو فریب دے کر عیسائی بنالیا تھا۔ جس پر مقدمہ بازی کی نوبت آگئی تھی۔ اس مقدمہ کا ذکر یکم جون ۱۹۱۲ء کے مخبر عالم میں ہوا ہے۔

"عیسائی مشنری لیڈیوں کے ہاتھوں ہندو مسلمان نادان لڑکیوں سے امرت سر وغیرہ میں جس طرح افسوسناک واقعات ہو چکے ہیں اسی طرح آج کل بنارس میں ایک حیرت انگیز مقدمہ قائم ہوا ہے۔ جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ شیخ نثار حسین کی نابالغ دھیوتی رقیہ بی بی جس کی عمر گیارہ سال ہے اپنی والدہ صفیہ بی بی کے ہمراہ بغرض علاج چشم زنانہ اسپتال بنارس میں گئی تھی۔ چند عرصہ کے بعد صفیہ بی بی کے خط اور تار سے معلوم ہوا کہ مس گرے اور دوسری لیڈیاں رقیہ بی بی کو عیسائی بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس کے بعد نثار حسین رقیہ بی بی کو لینے گیا مگر ان لیڈیوں نے رقیہ بی بی کو روک لیا اور صفیہ بی بی کو نکال دیا اور ان پر حملہ بھی کیا۔ جس پر نثار حسین نے صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع بنارس کے اجلاس میں ایک استغاثہ حسب دفعات ۳۶۳، ۳۵۱، ۵۰۶ تعزیرات دائر کیا اور دکھایا کہ زیر دفعہ ضابطہ فوجداری فوراً کارروائی کی جائے مگر مسٹر الڈری فلڈ صاحب ضلع بنارس نے اس نابالغہ کو نہ تو سرپرست کے سپرد کیا نہ ملزمان کو طلب کیا بلکہ ایک نجی چٹھی مس گرے کو لکھی جس کا جواب شامل مثل ہے کہ "وہ مسلمان لڑکی خود مقیم ہے میں نے نہیں روکا۔ اس کے اعزا مناسب وقتوں میں آکر مل سکتے ہیں اور اسے مذہب عیسوی سے پھیرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لڑکی ایسی عمر کی ہے کہ وہ مذہبی خیالات کو سمجھ کر ایک رائے قائم کر سکتی ہے۔" اس پر مسٹر رائل جنٹ مجسٹریٹ کو مقدمہ سپرد ہوا اور انھوں نے بیان لیا اور مدعی نے جو اپنے گواہ آنریری مجسٹریٹ وغیرہ جونپور و اعظم گڑھ سے طلب کرائے ان کے کرایہ آمد و رفت جمع کرنے اور بغرض فراہمی خرچ مقدمہ ملتوی نہ کرنے کا حکم دیا۔

مدعی غریب آدمی تھا اس سے فوراً انتظام نہ ہو سکا۔ جنٹ صاحب نے بھی مس گرے کو ایک چٹھی لکھی کہ وہ مدعی کے تجویز کردہ ڈاکٹر سے، اس لڑکی کا معائنہ کرا سکتے ہیں۔ جس کا مس گرے نے یہ جواب دیا کہ صرف سول سرجن بنارس کا معائنہ کرا سکتے ہیں اور کسی ڈاکٹر کا معائنہ مجھے منظور نہیں۔ اس پر نثار حسین مدعی نے مسٹر عبدالرؤف بیرسٹر کی معرفت مسٹر جسٹس ٹڈبال کے

اجلاس میں انتقال مقدمہ کی درخواست گذاری جس پر جنٹ صاحب کو نوٹس دیا گیا کہ مقدمہ کیوں نہ منتقل کیا جائے۔"

حاجیوں کو کس کس دور سے گذرنا پڑتا ہے اور کن کن حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ دل چسپ داستان ہے۔ ۱۹۱۲ء میں حُجاج کرام کو جدہ بھیجنے کے بعد کیا خرچ کرنا پڑتا۔ اس کی تفصیل ۸ جون ۱۹۱۲ء کے مخبر عالم مرادآباد میں چھپی ہے۔

"حاجیوں کے جدہ پہونچنے پر جو اخراجات ہوتے ہیں اس کی جانب حُجاج کے ذمہ دار حکام نے ایک نرخ معین کیا ہے جس کو ظاہر کرنے کی غرض سے قونصل جنرل ترکی نے ایک مراسلہ گورنمنٹ ہند کی خدمت میں بھیجا ہے اور گورنمنٹ بمبئی نے اس پر ایک یادداشت تحریر کر کے وہ مراسلہ شائع کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جدہ سے مکہ معظمہ پہونچنے کے لئے "فی حاذ" پانچ روپے، مکہ سے عرفات تک چار روپے، مکہ سے مدینہ تک کا کرایہ فی کس آٹھ روپے خرچ ہوتا ہے۔ حج کے درمیان ہر ایک شخص کو خیمہ کرایہ پر لینے پر دو روپے، مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک برائے حفاظت ایک گارڈ آتا ہے۔ جس کے لئے ڈیڑھ روپیہ دینا پڑتا ہے۔ مطوّف کی فیس آٹھ روپے ہوتی ہے۔ زمزم شریف کا پانی لانے والے کو دو روپے دیئے جاتے ہیں۔ کل چالیس روپے خرچ ہوتے ہیں۔ موسم برسات میں اونٹ کے کرایہ کا نرخ کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک ایک اونٹ کا کرایہ ۴۰ مجیدی ہے۔ ایک مجیدی سوا دو روپے کا ہوتا ہے۔"

انگریز جب سے ہندوستان پر قابض ہوا، ہندوستان سے اہل فن اور اہل ہنر لوگوں کی کمی ہو گئی انگریزوں نے ہندوستان میں قلی اور مزدور ہے، اس کا پروپگنڈا کیا جس کی وجہ سے ہندوستان سے مزدوروں اور قلیوں کی مانگ شروع ہو گئی۔ اس خطرناک حالت پر مخبر عالم مورخہ ۳ جون ۱۹۱۲ء نے حسب ذیل تبصرہ کیا۔

"کسی وقت ہندوستان ہر ایک علم و ہنر کی کان سمجھا جاتا تھا اور یہاں کی ہر ایک بات سے ممالک غیر میں دل چسپی لی جاتی تھی۔ صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت، علوم و فنون میں ہندوستان سب سے بڑھا چڑھا تھا۔ لیکن آج وہی ہندوستان سب سے پیچھے گرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ممالک غیر سے جب کوئی مانگ آتی ہے تو قلیوں کی آتی ہے۔ ہندوستانی مزدور تمام دنیا میں پسند کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ افریقہ میں مزدوروں کی قلت کے باعث ہیروں کی

کان کا کام تسلی بخش حالت میں نہیں ہے۔ لہٰذا اب مالکانِ کان نے تجویز پیش کی ہے کہ ہندوستان سے قلی بلوائے جائیں۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان کی تمام چیزوں کی پسندیدگی اب صرف قلیوں میں ہے۔"

ایڈیٹر مخبر عالم ہندوستان کی ذرا سی بھی بے عزتی کو برداشت نہیں کرتے تھے فوراً بلبلا اٹھتے تھے، اور اس پر تبصرہ فرماتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں دہلی میں دربار ہوا۔ اخبار نویسوں کو میڈل دیا جانا طے ہوا جو طریقہ سے نہیں دیا گیا، تو ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں اس کا اس انداز سے ذکر فرمایا۔

"گورنمنٹ اخباروں سے کس قدر نفرت کرتی ہے اس کی ایک مثال ذیل میں درج کی جاتی ہے گذشتہ دہلی دربار میں شہنشاہ معظم، وائسرائے سر جان ہیوٹ ان میں سے کسی ایک نے یہ قرار دیا کہ پریس کیمپ کے ایڈیٹروں کو ایک ایک دربار میڈل دیا جائے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دربار میڈل کس طرح دیے گئے؟ کس طرح کا جلسہ منعقد کیا گیا؟ جیسے اس آدمی کو میڈل دیتے وقت ایک جلسہ کیا گیا تھا جو دربار تک میں شامل نہیں ہوا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ لفافہ جات ڈاک میں اس طرح بھیجے گئے جیسے کوئی کتے کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دیتا ہے۔ بات تو ذرا سی ہے لیکن تنکے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔"

ایڈیٹر مخبر عالم کا دل و دماغ خالص ہندوستانی تھا۔ حکمراں طبقہ کی تو عزت کرتا تھا لیکن انگریزوں کی کوئی چیز لباس وغیرہ پسند نہیں تھا۔ اگر کوئی ہندوستانی کوٹ پتلون پہنتا تھا تو ان کو پسند نہ آتا تھا۔ چنانچہ ایک انگریز نے ہندوستانیوں کے انگریزی لباس پہننے پر چوٹ کی تھی اس کو سامنے رکھ کر ایڈیٹر مخبر عالم نے یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شمارے میں کوٹ پتلون پہننے والے ہندوستانیوں کو خوب لتاڑا۔

"کوٹ پتلون اور بوٹ کی پوشش تو ہندوستان کے قریباً معمولی انگریزی دانوں نے بھی اختیار کر لی ہے جو متوسط طبقہ کے لوگ ہیں۔ انھوں نے ادھورا لباس پہننا شروع کر دیا ہے، اور جو اچھے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز عہدے دار یا پیشہ ور مثلاً وکیل و بیرسٹر ہیں انھوں نے تو قریباً تمام ہی وضع قطع انگریزوں کی سی بنانی شروع کر دی اور یہ شوق ان پر ایسا غالب ہے کہ انھیں اپنے لباس اور اپنی وضع قطع کی وہ برائیاں محسوس نہیں ہوتیں کہ جو خود انھیں آئینہ دیکھ کر نظر آ جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کی انگریزی تقلید پر ایک معزز انگریز نے اپنے دلچسپ قابل قدر خیالات ظاہر کیے تھے جن کو ذرا سی بھی حمیت سے دیکھا جائے تو نہایت ندامت ہوتی ہے۔ صاحب

نے بتایا کہ جو لوگ شوقیہ انگریزی لباس اختیار کر بیٹھتے ہیں، انہیں واضح ہو کہ اس سے ان کی یورپین سوسائٹی میں کوئی عزت و وقعت نہیں۔ کوئی یورپین کسی ہندوستانی شخص کو انگریزی لباس میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا بلکہ اس کی نامناسبت پر دل ہی میں خندہ زنی کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ذی حس لیڈیاں ہندوستانیوں کے ننگے پاؤں اور ٹانگوں سے نفرت کرتی ہوں ...... اگر ہندوستانیوں نے انگریزی لباس صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس سے تعلیم یافتگی کے آثار پائے جاتے ہیں تو یہ ان کی سراسر نادانی ہے۔ کالجوں کی تعلیم اگر انگریزی لباس کا ولولہ پیدا کرتی ہے تو اس ولولہ کو اپنے دلوں میں جگہ دینی ایک قسم کی حماقت ہے۔ صاحب نے ہندوستانیوں کا مردانہ و زنانہ لباس پسند کرتے ہوئے اس کی نہایت تعریف کی ہے اور اسے ہندوستانیوں کے حسب حال بتایا ہے۔ پگڑی یا عمامہ کو صاحب موصوف دنیا بھر کے لباسوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ دھوتی، کرتے اور ہندوستانی جوتے تک کو آپ اچھا بتاتے ہیں اور ہندوستانیوں کی اپنے لباس سے اس قدر بے اعتنائی کرنے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ایسے لوگ جو اپنا ملکی لباس ترک کریں اپنے ہم وطنوں کے لئے جہاں وہ پیدا ہوئے باعث شرم ہیں۔ غرضیکہ ایک معزز انگریز نے ہندوستانیوں کی اس جنس چال کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھ کر صاف کہہ دیا کہ اگر میں ہندوستانی ہوتا تو میرے دیسی لباس میں مجھ سے کوئی یورپین ملنا جلنا گوارا نہ کرتا تو میں اس سے ملنے کی ذرا بھی پروا نہ کرتا۔ اس انگریز کے یہ خیالات ہندوستانیوں کے لئے ضرور قابل غور ہیں۔ خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے جن کا شرعی لباس ایسا موزوں و مناسب ہے کہ اس کی خوبیوں کی تمام اقوام اور تمام ممالک قائل ہیں لیکن افسوس ہے کہ نئے فیشن نے انہیں سب بھلا رکھا ہے!!
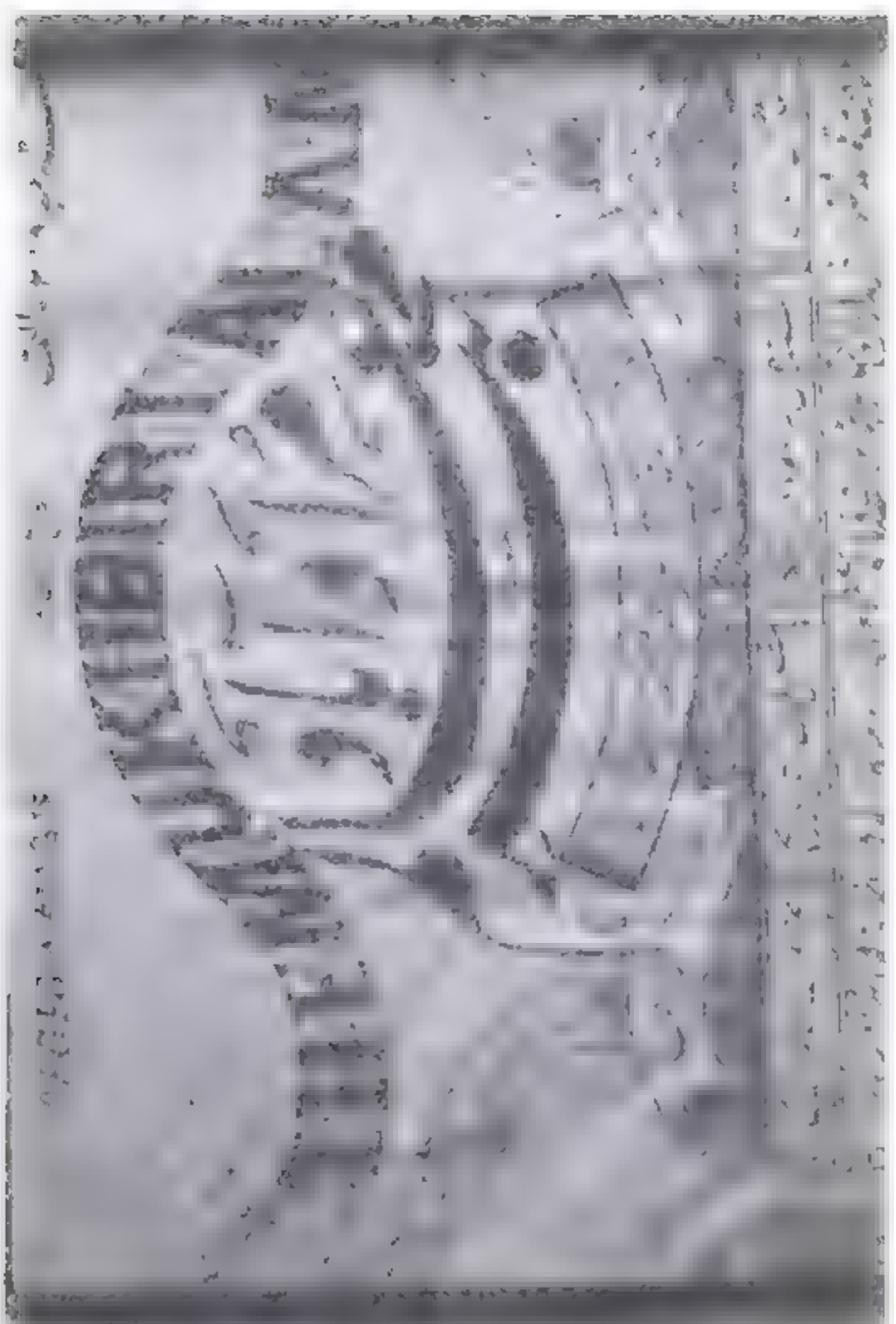
سودیشی تحریک کی حمایت

اخبار مجزعالم مراد آباد قوم پرستی اور غیر ملکی غلامی کے خلاف آواز اٹھانے میں کسی قوم پرست اخبار سے پیچھے نہیں رہا۔ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہندوستانی اخبارات کے حقوق کو پامال کرنے کے لئے انگریز حاکموں نے قانونی شکنجہ میں کسنے کی کوشش کی۔ اس کی مخالفت میں سخت آرٹیکل لکھے اور جب سودیشی تحریک شروع ہوئی تو اس کی زبردست حمایت کی۔ اس کے لئے اداریے اور نوٹس لکھے۔ اس کے ثبوت کے لئے مجزعالم کے متعلقہ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

سودیشی مال کا استعمال کرنے اور بدیشی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوئی تو ہندوستان بھر میں پھیلنے لگی۔ چنانچہ مجزعالم مراد آباد نے اس مقبولیت کے بارے میں ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں اداریہ "دیسی اشیاء کی قدردانی" تحریر کیا۔

"آج کل تقسیم بنگال کی ناراضی سے دیسی ساختہ اشیاء کی قدردانی کا جوش یوماً فیوماً بڑھتا ہی جاتا ہے، گو اس کی بنیاد عارضی جوش و ناراضامندی احکام گورنمنٹ سے واقع ہوئی ہے۔ لیکن کیا تعجب ہے کہ یہ بنگالی جوش عام ہندوستان کو اپنے فائدہ کا اندازہ کرا دے۔ اور غریب دیسی دستکار فاقہ مستی اور مفلسی کے عالم سے باہر قدم نکالیں اور ہماری دولت ہمیں ہی کو فائدہ پہونچائے۔ بنگالہ کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے ہر صوبہ کے باشندوں کے دلوں میں دیسی اشیاء کی قدردانی کا خیال پیدا ہو چلا ہے۔ چنانچہ جے پور، جودھپور، بنارس، راولپنڈی وغیرہ میں دیسی اشیاء کے استعمال کی طرف خاص کوشش کی گئی۔ رنگون میں اس جوش کو پھیلانے کے لئے ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں بنگالی، پنجابی، ہندوستانی، مارواڑی، مرہٹہ، پارسی، گجراتی، مدراسی، ہندو، مسلمان سب کے سب جمع تھے جنہوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ چاہے کیسی ہی کچھ کیوں نہ مصیبتیں اٹھانی پڑیں لیکن بجز دیسی اشیاء کے ہرگز ولایتی ساختہ چیزوں کا استعمال نہ کریں گے۔ اب دیکھئے یہ وعدہ کہاں تک اپنا استقلال ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت تو اہل رنگون کی

روشن خیالی کی جا بجا تعریف ہو رہی ہے۔ لیکن یہ تعریف جب ہی قابل قدر ہو سکتی ہے کہ جس طرح اہل بنگال نے اس وقت اپنے استقلال کا اظہار کیا ہے کہ کلکتہ میں اس وقت تمام ولایتی ساختہ چیزوں کو نہایت حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ولایتی اشیاء کے سوداگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ولایتی جوتے فروش حیران ہیں کہ اس قیمتی مال کا اب کیا کیا جائے۔ کوئی تہائی اور چوتھائی قیمت پر بھی خریدنا نہیں چاہتا۔ سگریٹ جس کا ہر طرف چرچا ہے۔ اب کوئی اس کا نام تک نہیں لیتا۔ بڑی بڑی کمپنیاں جہاں دن رات ایک میلہ لگا رہتا تھا۔ اب کوئی اس طرف رخ نہیں کرتا۔ ولایتی نمک اور شکر اس جوش و خروش کے باعث پانی ہوا جاتا تھا۔ اور بنگالی استقلال نے تمام ہندوستان میں عام طور پر ایک ہلچل ڈال دی ہے۔"

"خدا کرے یہ جوش اپنے ملکی دیسی کاریگروں کے فائدہ پہنچانے اور دیسی اشیاء کی قدر دانی بڑھانے ہی کے متعلق قائم رہے تو کیا اچھا ہو۔ نہ کسی رضامندی سے اور ضد سے! ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بقول انگریزی معاصر انگلشمین کہ اگر اس جوش و خروش سے مجبور کر انگریزی سوداگران بنگال اپنے دیسی ملازمین کو برخاست کر دیں تو لاکھوں بنگالی ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو جائیں۔ اور چار دن میں تارے نظر آجائیں۔" انگلش مین" جو خود اس سے پہلے اس جوش کا موئید تھا لیکن اس کا یہ فقرہ واقعتاً اثر رکھتا ہے اور کوئی رعایا کسی گورنمنٹ کے احکام کے خلاف ایسا نہیں کر سکتی ہے ورنہ ضرور نقصان کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ دیسی اشیاء کے استعمال کا رواج دینا یہ مبارک کام ہے۔ اور اس کو ملکی و وطنی بہبودی کے لحاظ سے اختیار کرنا بجز فائدے کے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔"

کلکتہ میں سودیشی تحریک کا زیادہ زور ہوا تو وہاں کے اخبارات نے اس کی تائید میں آرٹیکل لکھنے شروع کر دیئے تھے اور امریکہ کی مثال دی تھی کہ وہاں کے لوگوں نے بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا۔ چنانچہ کلکتہ کے اخبارات کے ایسے مضامین کا ترجمہ کر کے ۱۶ ستمبر ۱۹۰۵ء کے مخبر عالم مرادآباد میں شائع ہوا تھا۔

> "کلکتہ کے اخبارات میں سودیشی کی طرفداری کا جوش روز بروز گرم پایا جاتا ہے۔ ایک اخبار لکھتا ہے کہ ہم کو اول نشانہ اپنے حملہ کا مانچسٹر کو ہی بنانا چاہیئے۔ کیونکہ انگریزی راج کے پہلے ایام میں پارچہ کا تمام اجارہ اہل ہند کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اسی مانچسٹر نے اس تمام کاروبار کا خصوصاً بنگالہ میں بالکل خون کر دیا تھا۔ جائز ہی نہیں بلکہ سراسر ناجائز اور سراسر خود غرضانہ طریقوں سے یہ کاروبار جس پر لاکھوں آدمیوں کا گذارہ اور کروڑوں کا کاروبار چلتا تھا ملیامیٹ کر ڈالا تھا۔ پس انصاف چاہتا ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے، اور کوشش کی جائے کہ حتی المقدور ہمارے ملک میں وہ کاروبار پھر فروغ حاصل کریں۔ اس

کا ادر ہر ایک فرد و بشر پر ہے جو ہند کو اپنا وطن سمجھتا ہے عام اس کے کہ ہندو ہے مسلمان ہے پارسی ہے سکھ ہے جینی ہے یا کہ عیسائی ہے اس کی کامیابی کی مثال کے طور پر اخبار امرت بازار پتریکا نے امریکہ کی نظیر پیش کی ہے اور چاہا ہے کہ جس طرح اہل امریکہ اس امر خاص میں کامیاب ہوئے۔ وہی کوشش اختیار کی جائے وہ لکھتا ہے کہ ہماری طرح امریکن بھی ایک زمانے میں برٹش کے ماتحت تھے۔ اس پر بھی وہ لوگ برٹش کے تجارتی مال کو طلاق دے کر اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئے تھے اس وقت امریکن کی حالت ہم ہندوستانیوں کی حالت سے بھی گئی گذری تھی۔ ہمارے ہاں تو اب بھی جولاہوں کی ایک بڑی بھاری جماعت باقی ہے کہ جس نے اب تک اپنا آبائی پیشہ ترک نہیں کیا۔ جو کمال غریبی اور افلاس کی حالت میں اپنے پیشہ کو کسی نہ کسی طرح کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں دیسی لوہار اور بڑھئی وغیرہ بھی بفضل تعالیٰ ہیں، جو ہماری ضرورت بہم پہونچا کر محنت سے پیٹ پالتے ہیں۔ لیکن جس وقت امریکن لوگ ان تمام سہولتوں سے بھی محروم تھے۔ لیکن جب انھوں نے اتفاق کیا اور دل میں ٹھانی کہ آج سے انگریزی چیز نہیں خریدیں گے۔ اور کوئی انگریزی چیز استعمال نہیں کریں گے۔ انھوں نے فوراً ایک سوسائٹی نیویارک میں قائم کی جس میں تمام ضروریات کی چیزیں دیسی ذریعے اور محنت سے تیار کی جاتی تھیں اور ادنیٰ سوتی کپڑا بنا جاتا ہے۔ چاقو، پنچے، پھاوڑے اور کدال وغیرہ تیار کئے جاتے تھے اور سب لوگ ان چیزوں کے خریدنے کے عاشق تھے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ایسی ترقی ہوئی کہ آج امریکہ کی چیزیں تمام روئے زمین میں پہونچ رہی ہیں۔ ہندوستان میں سودیشی تحریک بنگال سے شروع ہوئی اور اب پورے ملک میں پھیل رہی ہے یہ آثار عجب نہیں کہ مستقل نتیجہ پیدا کریں۔"

سودیشی تحریک نے اتنا زور پکڑا اور ہندوستانی اس قدر بیدار ہوئے کہ وہ بدیسی کپڑا خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ کوئی دکاندار اگر ان کو بدیسی چیز دیتا تو اس کے لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ بدیسی اشیاء کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ موقعہ ملتا تو بدیسی چیزوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کی خبر ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے مخبر عالم مرادآباد میں چھپی۔

"کلکتہ میں سودیشی کے پرچار کے جوش میں ایک اور بلوہ ہو گیا۔ اپر چیت پور روڈ پر بعض دکانداران پارچہ و طرفداران سودیشی کے درمیان خوب زد و کوب کی نوبت آئی۔ اصل میں پوچھئے تو قصور وار دکاندار مسمی کالی داس ہی تھا۔ اس کی دکان پر ایک دیسی گاہک آیا اور دیسی کپڑا چاہا۔ دکاندار نے دیسی کے عوض میں مانچسٹر کا کپڑا دیا اور کہا یہی دیسی ہے۔ جوں ہی گاہک کو معلوم ہوا

کہ یہ دیسی کپڑا نہیں ہے وہ دکاندار کے پاس واپس آیا اور کہا ہم کو ولایتی کپڑا درکار نہیں ہے پس دام پھیر دو۔ کالی داس نے کپڑا واپس لینے میں پس و پیش کی۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ گاہک کے طرفدار جمع ہو گئے اور ہر دیگر دکانداروں نے کالی داس کی حمایت کی۔ خوب مکا بازی، دھول دھپ ہوئی۔ خلقت کا ہجوم اس قدر بے شمار تھا کہ پولیس کی جرأت نہ پڑی۔ ان میں بہت سے نوجوان طلبہ بھی تھے۔ بہر حال پولیس والوں نے دیگر معززین کی مدد سے تمام ہجوم کو منتشر کر دیا لیکن وہ کسی شخص کو گرفتار نہ کر سکی۔ اس مارکٹ میں کئی آدمیوں کو سخت چوٹیں آئیں اور دکاندار کالی داس اسپتال میں زیر علاج ہے۔ یہ سنیچر کی واردات ہے۔ اگلے روز اتوار کی سنیئے۔ دن چڑھتے ہی اسی بازار اور اسی دکان پر پھر ہجوم جمع ہوا اور مالک دکان کالی داس کے بیٹے سے تیس روپے بطور جرمانہ طلب کیا۔ لڑکے نے مارے ڈر کے تیس روپے حوالے کر دیئے۔ اور انھیں لوگوں کے کہنے سے تمام ولایتی پارچہ جو دکان میں موجود تھا لوگوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر بآواز بلند کہا کہ آئندہ وہ ولایتی پارچہ یا ولایتی کوئی اور چیز نہیں منگوائیں گے یا فروخت کریں گے۔ تب ہجوم خلائق نے اس تمام پارچہ کو بر سر بازار آگ لگا کر سب کے سامنے راکھ کر دیا تھا۔"

سودیشی تحریک کا اثر حیدرآباد دکن میں پہونچا اور پنجاب کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ ایڈیٹر مخزن عالم کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ یہ خبر بھی ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں چھپی۔

"سودیشی دستور پرچارنی سبھا سالہا سال سے ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کی قدر دانی کرنے کی طرف مائل کرنے کی بے حد کوشش میں مصروف ہے اور اس کے معزز ممبران جابجا سودیشی تحریک چلا رہے ہیں۔ لیکن اس طرف اہل ملک کا ایک معمولی سی توجہ اور نہایت سست رفتار خیال تھا۔ بقول ایک پنجابی ہم عصر کے اگرچہ سودیشی پرچار کا خیال ملک کو عرصہ سے تھا مگر یہ کام اپنی معمولی رفتار سے چلا جا رہا تھا اور ہمدردان ملک اس کے لئے حسب موقعہ و حسب ضرورت کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن بنگالیوں کے اس جوش و خروش نے اس مفید ملک تحریک میں ایک روح پھونک دی اور اہل بنگال کی ایک کثیر تعداد کو اس طرف آمادہ دیکھ کر تمام ہندوستان و پنجاب و حیدرآباد کے باشندے ان کی اعانت کے لئے فوراً ہی مستعد ہو گئے۔ جنہوں نے نہ صرف جلسے کئے بلکہ کئی کمپنیاں بھی قائم کر لیں۔"

اس زمانے میں پرنس آف ویلز اور ان کی اہلیہ برطانیہ سے جب ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے تو وہ

فرانس کے سامان کے بجائے حب الوطنی کے جذبہ کے پیش نظر تمام سفری سامان بمعہ پوشاک انگریزی ساخت کا اپنے ساتھ لائے۔ اس خبر کو تحریک کے ایڈیٹر مخبر عالم نے ہندوستانیوں کو غیرت دلائی اور متوجہ کیا کہ وہ بھی سودیشی تحریک پر توجہ دیں۔ یہ ہدایت انھوں نے ۲۳ نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں دی ہے"

"سودیشی تحریک کے مخالفوں کو یہ خبر پڑھ کر نادم اور پشیمان ہونا پڑے گا کہ ہز ہائی نس پرنس آف ویلز صاحب سودیشی تحریک کے زبردست حامی۔ پرنسس صاحبہ ہندوستان تشریف لا رہی ہیں۔ آپ نے حب الوطنی کی یہ مثال پیش کی ہے کہ تمام سفری سامان بمعہ پوشاک انگریزی ساخت کا اپنے ساتھ رکھا ہے۔ حالانکہ اس وقت لندن میں فرانسیسی فیشن کا رواج ہے لندن کی لیڈیاں اپنے نازک بدن کی پوشاکیں زیادہ تر پیرس کے کارخانوں سے سلواتی ہیں لیکن پرنسس صاحبہ نے اپنی پوشاکیں لندن کے کارخانوں سے سلواتی ہیں۔ لندن کے تمام اخبارات پرنسس صاحبہ کی حب الوطنی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ امید ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک مقام کی مستورات اپنی آئندہ ملکہ کی پیروی کر کے اپنے ملک کا کپڑا پہنیں گی۔ اب دیکھئے اس مثال پر سودیشی تحریک کے مخالفین یعنی اینگلو انڈین صاحبان و انگلش مین وغیرہ اخبارات کیا گل کترتے ہیں۔ غالباً شرمندگی تو ضرور حاصل ہوگی"

سودیشی تحریک نے جب مقبولیت حاصل کر لی تو اس نے عملی شکل اختیار کی۔ متمول لوگوں نے بھی حصہ لینا شروع کیا تو مہاراجہ کولہاپور نے ایک کپڑے کا مل قائم کر لیا۔ یہ خبر ۱۹ جنوری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں چھپی۔

"ملک میں سودیشی تحریک کا حلقہ آپ سے آپ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مہاراجہ کولہاپور کا بھی اس طرف خیال ہوا۔ وہاں دس لاکھ روپیہ منظور کیا گیا کہ پارچہ بافی کا ایک دخانی کارخانہ جاری کیا جائے بنگال میں زیادہ تر خیال اس طرف ہے کہ بجائے دخانی کارخانوں کے دستی پیشہ بافندگی کی تقویت کی جائے۔ ضلع گسنہ کے ایک متمول زمیندار راجہ رنگیا اپا راؤ صاحب نے تین ہزار روپیہ منظور کیا تاکہ اس سے ایک دو سالہ وظیفہ کسی ایسے لائق نوجوان کے لئے قرار دیا جائے جو جاپان میں کسی مفید پیشہ صنعت کی تحصیل کا خواہش مند ہو اس کی نظیر جا بجا پسند کی گئی جو ہر آئینہ مبارک بادامر ہے"

سودیشی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے عظیم الشان جلسے شروع کئے گئے تھے جو ایڈیٹر مخبر عالم کے عین منشا کے مطابق تھے۔ اس کی کاروائی مخبر عالم میں نہ چھپتی یہ ناممکن تھا چھپی اور ۱۶ فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے کی زینت بنی۔ عنوان تھا "بنگالیوں کی پر جوش کوششیں"

"جلسہ سودیشی پرچار کی بابت پچھلے ہفتہ کی جمعرات کی شام کو ایک بارونق پیمانہ پر کیا گیا۔ گو بابو سریندر ناتھ بنرجی صاحب کرسی صدارت کو زینت دینے والے تھے لیکن وہ شامل نہ ہو سکے تو بابو کرشن کمار متر نے چیرمین کی کرسی پُر کی۔ انھوں نے اس موقع پر زبردست تقریر میں حکّام کو بزور للکارا کہ وہ لاکھ کوششیں کریں اور کروڑوں بندشیں لگائیں لیکن سودیشی پرچار کی تحریک کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ سودیشی تحریک کا روکنا گورنمنٹ کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ لوگوں کو جیل خانے میں ڈالے۔ لڑکوں کو بیدوں کی سزا دے لیکن اس سے وہ ان کے دلوں کو ہرگز فتح نہ کر سکے گی۔ اور ایسے طریقے سے رعایا کے دل کبھی گرویدہ نہیں ہوں گے۔ بہت بلند آواز سے کہا حکام جتنی سختیاں کریں گے عوام کے شوق کا جوش اتنا ہی تر و تازہ ہوگا۔ حکام جتنا خنز ڈالیں گے عوام کی ثابت قدمی اتنی ہی ترقی کرے گی۔"

اس کے بعد چیرمین صاحب نے پھر تمام حاضرین سے التجا کی کہ سب سودیشی پرچار کی جد و جہد کو بدستور جاری رکھیں اور اس کے خلاف سرکاری حکّام کی کوششوں سے مطلق خوف زدہ نہ ہوں۔ بجائے خوف زدہ ہونے کے حوصلے کو زیادہ تیز کریں اور کوششوں کو سرد نہ پڑنے دیں۔ اس تقریر کا جیسا کچھ بھی اثر ہوگا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ چیرمین صاحب کے بعد منشی دین محمد صاحب نے تقریر کی اور کہا حال میں وہ مشرقی بنگال کے دورے سے واپس آئے ہیں۔ اس دورے میں انھوں نے دیکھا کہ وہاں کی رعایا دل و جان سے سودیشی پرچار کی دل دادہ پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا واقعی چیرمین صاحب نے سچ کہا ہے کہ سرکار اس مبارک تحریک کو معدوم نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے بعد مولوی لیاقت حسین صاحب اٹھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ ایک تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جو سودیشی کی تحریک کے دل دادہ طلبہ ہیں ان کی امداد کے لیے ایک انجمن قائم کی جائے۔ اور چندہ فراہم کیا جائے لیکن چونکہ بابو سریندر ناتھ بنرجی آج موجود نہیں ہیں لہٰذا وہ اس تجویز کو آئندہ موقعے کے لئے ملتوی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد بابو سچندر پرشاد بوس، مولوی دیدار بخش اور مولوی عبد الغفور اور بابو پریم توشش صاحبان نے بھی اس موقعہ پر تقریریں کیں۔ ان سب کا ماحصل یہی تھا کہ سودیشی پرچار کی تحریک مبارک اور متبرک ہے اور سرکاری حکام کی مخالفت سے یہ تحریک ہرگز بند نہیں ہو سکتی۔"

پھر اس کے بعد سودیشی تحریک نے لوگوں کے دلوں میں کافی اثر ڈالا۔ لاؤ مدرسہ یا رچہ بانی بنا ڈالو۔ چنانچہ بنا دیا گیا جس کا ذکر تقریروں میں کیا جانے لگا اور ۶ مارچ ۱۹۰۶ء کے شمارہ مخزن عالم میں ہوا۔

"مقام بھولا میں ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا۔ باریسال کے بنارن بابو اس کے پریسیڈینٹ تھے۔ اس میں تمام حاضرین جلسہ نے سودیشی پرچار کی قسمیں کھائی تھیں جن کے جوش سے صداقت ٹپکتی تھی۔ اسی روز یہاں ایک مدرسہ پارچہ بافی کی تربیت کا جاری کیا گیا۔ اس جلسہ میں بہت سی مستورات بھی اظہار شوق و ہمدردی میں شامل تھیں۔ اس کا فیلنگ قوم کے دلوں میں سرایت کرتا جاتا ہے۔ اسی روز ایک دوسرا بڑا بارونق جلسہ ہندو مسلمانوں کا ان ہی مقاصد سے میمن سنگھ میں بھی کیا گیا۔ یہاں بابو ناتھ بندھو پریسیڈینٹ تھے۔ منشی مجیب الدین صاحب، پنڈت رام شنکر اور بعض صاحبان نے جو کلکتہ سے آئے تھے، دل چسپ اور پُراثر تقریریں کیں۔ جن کا مقصد یہی تھا کہ سودیشی پرچار کو ملکی اور قومی خدمت سمجھ کر تہ دل سے اختیار کیا جائے۔ ولایتی مال کے استعمال سے پرہیز کریں اور ملکی چیزوں سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کریں۔ مقرروں نے حاضرین سے بار بار التجا کی کہ سودیشی پرچار کو ایک مقدس فرض سمجھیں۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر تارا ناتھ بال صاحب کے ساتھ سرگرمی سے ہمدردی ظاہر کی گئی جو محض اس لئے آنریری مجسٹریٹی سے موقوف کئے گئے ہیں کہ سودیشی پرچار کے کھلم کھلا طرفدار تھے اور حکام کے زور دینے سے بھی سودیشی پرچار کے طرفدار ہونے سے باز نہیں آئے۔ ڈاکٹر صاحب کا قومی طور پر شکریہ ادا کیا گیا اور ان کو شہید قوم قرار دیا گیا۔ پریسیڈینٹ کی تقریر میں مقناطیسی طاقت تھی جس کا اثر تمام حاضرین کے دلوں پر طاری ہوگیا تھا کہا جاتا ہے کہ مفصلات بنگالہ میں جو طلبہ سودیشی پرچار کی پاداش میں اسکولوں سے خارج کئے گئے تھے ان کا ہجوم کلکتہ میں آپہونچا ہے۔ اور یہاں کے لیڈران قوم نے یہ کہہ کر کہ ان غریب نوجوانوں کو کوئی مدرسہ یا اسکول قبول نہیں کرے گا۔ ایک قومی اسکول خاص ان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے۔ اس قومی اسکول میں بڑے بڑے لائق ایم اے اور مشہور گریجویٹ مفت تعلیم دینے کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ اور اس کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر بوجہ احسن جاری ہوگیا ہے۔ یہاں محض شوق اور فرائض کے لحاظ سے تعلیم دی جاتی ہے اور اس کام کو خوشی اور دل چسپی سے انجام دیا جاتا ہے۔ یہاں کی پڑھائی ضرور نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہوگی اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے سرکاری مدارس سے بہتر لیاقت اور قابلیت جلد پیدا ہو جائے گی۔ یہ تمام لڑکے علمی تعلیم حاصل کرتے ہی سائنس یا حرفت و صنعت کے فنون کی تکمیل پر لگائے جائیں گے تاکہ فارغ التحصیل ہو کر ساتھ ہی عزت اور آزادی سے اپنی معاش کا

انتظام کر سکیں۔ تمام سرکاری مدارس جو قواعد انٹر اسکول کے پابند ہیں۔ قومی اسکول کی اس کارروائی پر انگشت بدنداں ہیں۔"

سودیشی تحریک اپنا رنگ دکھلانے لگی۔ پنجاب آگرہ اور مرادآباد میں بدیشی شکر کا مستقلاً بائیکاٹ ہو گیا تو اس کا شکریہ ۸ر ستمبر ۱۹۰۶ء کے مخبر عالم میں کیا گیا۔ اس اداریے کا عنوان تھا "سودیشی برکت"۔

"گو ایک عرصہ دراز سے بدیشی تحریک کی برکت سے جابجا حلوائی ولایتی شکر سے متنفر ہوتے جاتے ہیں۔ اور جگہ بجگہ اس کا استعمال بند ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ پنجاب و آگرہ میں تو ولایتی شکر کا عام استعمال بند ہو ہی چکا ہے اور بتدریج ہر جگہ یہ تحریک اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ چنانچہ اب ہمارے ضلع مرادآباد کے قصبات سنبھل اور چندوسی کے حلوائیوں نے بھی عام اتفاق سے آئندہ ولایتی شکر کا قطعی استعمال بند کر دینے کا حلف اٹھایا ہے اور اس وقت تک کی تیار شدہ مٹھائیاں ۹ سیر فی روپیہ نرخ سے ہاتھوں ہاتھ فروخت کر دی گئیں اور آئندہ سے دیسی شکر کا استعمال شروع کر دیا گیا۔"

سودیشی چیزوں کی مانگ جب زیادہ ہونے لگی تو سارے خودغرض دکانداروں نے سودیشی چیزوں کی قیمتیں بے پناہ بڑھا دیں۔ اس پر دکانداروں سے مخبر عالم نے اس لوٹ کھسوٹ کو بند کرنے کی اپیل ۳ر نومبر ۱۹۰۶ء کے پرچہ میں فرمائی۔

"سودیشی تحریک کی وجہ سے جابجا ولایتی شکر کی خرید بند ہوتی جاتی ہے اور ہندوستانی شکر کی طرف ملک کو رغبت دلائی جاتی ہے۔ ہمارے سودیشی سوداگر اس موقعہ کو بھاگتے کی لنگوٹی سمجھ کر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے اکثر دکاندار سودیشی چیزوں میں ولایتی چیزیں ملا کر اپنی بے ایمانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ بعض لوگ گو ایسا نہیں کر رہے ہیں مگر اپنے ملک کی ساختہ اشیاء کو ولایتی چیزیں ملا کر اور ارزاں بنا کر اہل ملک کے سامنے پیش کیا جائے تو ضرور اس مبارک تحریک سے ایک مناسب فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔"

سودیشی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے کتابیں بھی شائع کی گئی تھیں۔ جن میں سودیشی تحریک کے فوائد اور بدیشی مال کے مضر اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک کتاب "سودیشی مکالمہ" بھی شائع ہوئی تھی جس پر ۱۶ر جنوری ۱۹۰۷ء کے مخبر عالم مرادآباد میں ریویو و تبصرہ کیا گیا تھا۔

"بابو بنارسی لال صاحب سوداگر امین آباد لکھنؤ نے سودیشی تحریک کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام "سودیشی مکالمہ" ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ولایتی شکر بیل کے

خون اور ہڈیوں وغیرہ سے صاف کی جاتی ہے اور مذہبی احکامات کی رو سے وہ ہرگز ہرگز استعمال کے قابل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دیسی چیزوں کے استعمال کو ہندوستان میں رواج دینے سے جو فوائد ہیں ان کا اظہار بھی نہایت معقولیت سے کیا گیا ہے۔ اور بتلایا گیا ہے کہ صرف دیسی تجارت و صنعت و حرفت کو ہی ترقی دینے سے ہمارا ملک خوشحال ہو سکتا ہے اور ہمارا افلاس دور ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو، مسلمان اور عیسائی وغیرہ جملہ مذاہب کے تعلیم یافتہ اور لکھے پڑھے باشندوں کو اس رسالہ کی دل و جان سے قدر کرنی چاہئے۔ اور اس کو ہر وقت زیر مطالعہ رکھنا چاہئے اور سودیشی تحریک میں عملی طور پر حصہ لینا چاہئے۔"

مرادآباد کے کچھ قصبوں میں تو سودیشی تحریک پہونچ گئی لیکن مرادآباد شہر بچا ہوا تھا۔ اس میں ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ آخر کار وہ بھی نہ بچ سکا۔ اور حامیان سودیشی تحریک نے وہاں بھی جلسہ کر ڈالا جس کی کارروائی ۸ جنوری ۱۹۰۷ء کے مخبر عالم میں چھپی۔

"ہمارے شہر میں سودیشی تحریک بالکل مردہ تھی مگر حسن اتفاق سے قابل احباب جناب سید گل بادشاہ صاحب منشی فاضل، مسٹر رادھا موہن، گوکل جی آگرہ سے اور جہاتمے بنارسی لعل جی آریہ لکھنؤ سے یہاں تشریف لائے اور انھیں کی تحریک پر ۲۸ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ایک بڑا بھاری جلسہ کیا گیا جو اگروال پاٹھ شالہ میں منعقد ہوا۔ جلسہ ٹھیک چار بجے شروع ہوا۔ سب سے پیشتر بابو جگدمبا پرشاد صاحب نے بدیشی کھانڈ کے متعلق ایک کتاب پڑھی اور کچھ زبانی بھی کہا۔ اس کے بعد مسٹر رادھا موہن گوکل جی نے ایک بہت متانت آمیز اور سنجیدہ تقریر کر کے بتایا کہ عادل گورنمنٹ ہرگز ہرگز سودیشی تحریک کی مخالف نہیں ہے۔ سید گل بادشاہ صاحب منشی فاضل نے پھر ایک موثر اسپیچ دی۔ آپ نے مسلمانوں کو اس تحریک میں ہندوؤں کے ساتھ دل و جان سے شریک ہو کر اس کے فروغ دینے کے وسائل اختیار کرنے کی طرف مائل کر دیا۔ پبلک کے سامنے آپ نے پر جوش الفاظ میں ہندوستان کی موجودہ حالت کا نقشہ کھینچ دیا اور بتایا کہ ہندوستان کو اب اپنے ہی پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اب وہ وقت نہیں ہے کہ لفظوں سے کام لیا جائے۔ ہندوستان کو اصلی ہمدردوں کی ضرورت ہے یہ بھی بتایا کہ گورنمنٹ سودیشی کی مخالف نہیں ہے۔ یہ صرف معدودے چند فرنگی ہیں جو اس تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے تحریک کی کہ جب ہمارے گورے رنگ کے آدمی ہمارے لئے لفظ نیٹو استعمال کرتے ہیں تو ہم کو بھی ان کے لئے لفظ فرنگی استعمال

کرنا واجب ہے۔ مسٹر شنڈنٹ بنارسی لال جی آریہ نے ایک بہت ہی موثر اسپیچ دی۔ حاضرین ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہو گئے۔ جلسہ اس روز ختم ہوا اور معززین ضلع نے اپنے مہمانوں سے مزید ایک روز ٹھہر کر اپنی قابل اسپیچوں سے پبلک کو مستفید کرنے کی درخواست کی جس کو ہمارے لائق مہمانوں نے اپنا ہرج کرکے بصد خوشی منظور کر لیا۔ دوسرے روز پھر چار بجے جلسہ شروع ہوا پنڈت جانکی پرشاد نے تقریر کی۔ پھر بابو جگدمبا پرشاد نے ایک نظم پڑھی۔ جو سودیشی پر تھی۔ اس کے بعد سید گل بادشاہ نے ایک موثر تقریر کی۔ مسلمانوں سے مکرر اپیل کی کہ وہ ہندوؤں سے میل جول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ پھر بنارسی لال آریہ نے پہلے روز سے عمدہ بھاشن دیا۔ جس کے بعد مسٹر رادھا موہن گوکل جی نے لیکچر دیا اور تحریک کی کہ مراد آباد میں بھی مثل لکھنؤ اور آگرہ ایک سودیشی اسٹور پانچ ہزار روپے سے کھولا جائے۔ جس کا فی حصہ دس روپے پر فروخت ہو۔ قریب تین سو کے حصص اسی وقت فروخت ہو گئے اور سودیشی کمیٹی بھی قائم کی گئی۔ قابل لیکچراروں کے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ مسٹر لتا پرشاد صاحب نے اس شب لیکچراروں کو ایک پر تکلف دعوت دی اور کہا، ہم امید کرتے ہیں کہ اب مراد آباد میں عملی طور پر کام کیا جائے گا۔"

سودیشی تحریک میں ہندوستان کے معزز حضرات نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس تحریک کو وہ ملک کے لئے مفید سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار راؤ بہادر مدھوکر صاحب نے مدراس کی صنعتی کانفرنس ۱۹۰۸ء میں اپنی تقریر میں کیا۔ اس تقریر کا کچھ حصہ ۱۶ر جنوری ۱۹۰۹ء کے مخبر عالم مراد آباد میں چھپا۔

"۲۹ر دسمبر کو کانگریس ہال میں بمقام مدراس چہارم انڈسٹریل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ راؤ بہادر مدھوکر صدر جلسہ تجویز ہوئے۔ دوران تقریر سودیشی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو یہ ایک اعلیٰ شئے ہے جس کی بنیاد محبت اور انصاف پر ہے نہ کہ نفرت اور بغض پر۔ یہ لوگوں کو ترغیب دیتی ہے کہ اہل ہند کو مفلسی سے نجات دے کر اعلیٰ پایہ کے ترقی یافتہ ممالک کے برابر کر دیں۔ اس کے طریقے امداد اور اعانت ہیں اور اس کا انحصار فراست اور کوشش پر ہے۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ غیر ملکی صنعتوں سے مقابلہ پڑ گیا ہے۔ سودیشی اشیاء کو فروغ دینا واجبات میں سے ہے۔ اور تمام نیک طبائع کے اشخاص اس کو پسند کریں گے۔ لیکن قبل دیگر معیاروں کے سودیشی کو خطرہ ہے کہ بدعقلوں کی ناشائستہ حرکات سے وہ بدنام نہ ہو

جائے۔ سودیشی کے منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے کمزوری کے راستوں پر قناعت نہ کرنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ اب وقت ہے کہ لوکل سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور صنّاعی اور تجارتی کارخانوں کو ترقی دی جائے اور پورے طور پر صنعتی جدوجہد کی جائے۔"

ہندوستان کی حکومت برطانیہ سودیشی تحریک کو اپنے ملک کی صنعت کے لئے مضر سمجھتی تھی۔ اور اس کے خلاف قانونی کاروائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ انقلاب لاہور کے خلاف قانونی کارروائی اسی بنیاد پر کی گئی۔ جس کی خبر ۳۱ جنوری ۱۹۰۹ء کے مخبر عالم مرادآباد میں ہے۔

"اخبار انقلاب لاہور کے بند کرنے اور قومی پریس کو ضبط کرنے کا جو ناطق حکم ڈپٹی کمشنر لاہور نے صادر کیا تھا۔ کیونکہ اس اخبار میں سودیشی بائیکاٹ اور قومی تعلیم کے متعلق نہایت قابلِ اعتراض زبان میں مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا اپیل چیف کورٹ لاہور میں اب دائر کر دیا گیا ہے۔"

حکومت برطانیہ سودیشی تحریک کے حامیوں کے خلاف قانونی قدم اٹھا رہی تھی تو سودیشی تحریک کے انتہا پسند بھی خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ بھی انتہا پسند انداز میں اس کا جواب دیتے تھے اور سودیشی تحریک کے مخالفوں کو ہر قسم کی زک پہونچانے سے باز نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک انقلابی واقعہ کا ذکر ۲۴ مارچ ۱۹۰۹ء کے مخبر عالم مرادآباد میں ہے۔

"ہگلی میں ایک جلسۂ صنعتی نمائش کا کیا گیا ہے۔ یہ نمائش یہاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ آفس کے مکان میں تھی۔ اس جلسہ کے سکریٹری مسٹر کھیرد بسواس تھے جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر بھی ہیں۔ مسٹر بسواس کے نام ڈاک خانہ کے ذریعہ ایک پارسل آیا۔ جس کے اندر ایک ہانڈی بند تھی اور اس میں بم کا ایک گولہ تھا۔ ایک پرچہ کاغذ بھی ساتھ تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ تحفہ مسٹر بسواس کے لئے ہے۔ جنھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے آفس میں ولایتی کھانڈ کی مٹھائی کی دکان کی اجازت دی ہے۔ شکر ہے کہ یہ گولہ پھٹنے نہیں پایا۔ اس کے اندر بارود بھری تھی اور کئی ایک آہنی کیلیں بھی تھیں۔ پولیس نے تحقیقات کر کے کالی کرشن بنرجی نام کے ایک بنگالی کو اس شہرت کے شبہ میں گرفتار کیا ہے جو سیرامپور کا رہنے والا ہے اور مرشدآباد کے پولیس ٹریننگ اسکول کا طالب علم بھی ہے۔"

سودیشی تحریک کامیابی کی منزل پر پہونچ گئی تھی۔ تقریباً ہر ہندوستانی اس کا عملی طور پر حامی بن گیا تھا۔ بدیشی چیز نہیں خریدتا تھا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ دیسی چیزیں خریدتا تھا۔ چنانچہ ۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء کے مخبر عالم کا شمارہ اس کی تائید کرتا ہے۔

"اخبار بنگالی لکھتا ہے کہ بنگال کے کچھ حصے کے لوگ سودیشی تحریک سے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں کچھ ان کو دھمکایا جائے یا سمجھایا جائے لیکن اس کا نشان کے دلوں سے محو نہیں ہوتا۔ بیوپاری دیسی چیزوں کو فروخت کرتے ہیں اور خریدار ان سے مول لیتے ہیں۔ فرید پور کے جولاہوں نے پہلے کے مقابلے میں دس گنا دیسی کپڑا زیادہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ یہاں کی دکانوں پر عموماً دیسی کپڑا بیچا جاتا ہے۔ دیسی چیزوں سے اس قدر محبت بڑھ گئی ہے کہ سانبھر کا نمک بدیسی نمک کی جگہ دکانوں پر فروخت ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگ دیسی سگریٹ بیڑیوں کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔"

حکومت برطانیہ نے سودیشی تحریک کو پسند نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو باغیانہ تحریک قرار دیا تھا۔ اس کو حکومت نے دبانے کی کوشش کی بہار میں جب اس کا زور پایا اس علاقہ میں تعزیری پولیس نافذ کی۔ اس کا بھی ذکر ۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کے مخبر عالم کے شمارے میں ہے۔

"ضلع باریسال کے موضع بوٹاری پارہ میں سودیشی پرچار کی تحریک کی مخالفت کے خیال سے تعزیری پولیس قائم کی گئی ہے۔ اس کا خرچ یہاں کے صرف ہندوستانی باشندوں پر ڈالا گیا ہے۔ جو پولیس کی سختیوں اور خرچ کے بوجھ سے چیخ اٹھے۔ انھوں نے اپنے لاٹ صاحب سر بمفیلڈ فلر سے فریاد کی۔ لکھا کہ تعزیری پولیس بہت سختیاں کرتی ہے۔ براہ عنایت وہ ہٹالی جائے۔ لیکن لاٹ صاحب نے یہ درخواست نامنظور کی تب اہل بوٹاری پارہ نے ویسرائے کی خدمت میں عرضی بھیجی۔ وہ عرضی بیرنگ واپس کی گئی اور جواب آیا ہے کہ بوساطت لوکل گورنمنٹ آنی چاہیئے۔"

اسی طرح ایک سودیشی تحریک کے حامی اخبار "علی گڑھ گزٹ" کے ایڈیٹر صاحب کو اخبار کی ایڈیٹری سے اس جرم کی پاداش میں علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ خبر بھی مخبر عالم نے ۲ راپریل ۱۹۰۶ء کے شمارے میں چھاپی۔

"اودھ اخبار لکھتا ہے کہ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ اخبار علی گڑھ گزٹ کا ایک ایڈیٹر اس لئے برخاست کر دیا گیا ہے کہ اس نے سودیشی تحریک کی حمایت اور طرفداری میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ بنگال میں تو چند ایسی نظائر قائم ہو گئی ہیں جن میں سودیشی کے حامیوں کو سزا دی گئی ہے مگر ممالک متحدہ میں اس نظیر کے قائم ہونے سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ اس ملک کے لوگوں کے دلوں میں سودیشی تحریک نے کچھ ایسی گرم جوشی پیدا کر دی ہے جو سودیشی کی حمایت اور پابندی میں اپنے نقصان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور حب الوطنی کے جوش میں اس پر بہت کچھ تصدق اور نثار کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔"

اس سودیشی تحریک کو سرکاری اخباروں نے ہندوؤں کی تحریک بنا دیا تھا جو قطعاً غلط تھا۔ اس میں مسلمانوں نے بھی حصہ لیا تھا اور جرأت مندی کے ساتھ تحریک کی حمایت میں پیش پیش رہتے تھے، ۳۰ مارچ ۱۹۰۶ء کے شمارے کی خبر سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ یہ تحریک صرف ہندوؤں کی تھی۔

"۲۱ فروری کو باریسال کے چار مسلمانوں کو سودیشی تحریک میں شمولیت کی سزا ملی کہ ایک مسلمان نے چاروں ہم قوموں پر اس جرم میں دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے ہماری ولایتی نمک کی کشتی ڈبو دی تھی۔ باریسال کے جوائنٹ مجسٹریٹ نے الزام درست پا کر صفدر علی، محمود علی وغیرہ پر پچاس روپیہ جرمانہ کیا۔ یہ لوگ بہت مفلس تھے۔ جرمانہ ادا نہ کر سکے تو جیل جانا پڑا۔ ہندوؤں نے ان کے ساتھ انسانی ہمدردی دکھائی۔ یعنی چندہ کر کے جرمانہ ادا کر دیا اور مفلسوں کو جیل خانہ سے چھڑا لیا۔"

سودیشی تحریک کے حامی سودیشی اشیاء خریدنے اور بدیسی اشیاء کا بائیکاٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے جب بھی ان کو موقعہ ملتا تھا یہی سعی کرتے تھے کہ ہندوستانی ہر صورت سے بدیسی اشیاء کا بائیکاٹ کریں اور سودیشی اشیاء ہی استعمال کریں۔ چنانچہ مخبر عالم نے بھی یہ تلقین دلائل کے ساتھ ۳۰ جولائی ۱۹۰۵ء کے شمارے میں کی ہے۔

"افسوس ہے کہ ہندوستانی غفلت کی میٹھی نیند میں سو کر غیر ممالک کی اشیاء خریدتے ہیں اور انجام بینی پر غور کئے بغیر گاڑھے پسینہ کی کمائی سات سمندر پار بھیج رہے ہیں اور دوسری طرف غیر ممالک کے باشندے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ حتی الامکان ان کے اہل ملک دوسرے ممالک کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہ کریں۔ چنانچہ اہل امریکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں اور جب ممکن ہوتا ہے اپنی ہمت سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ امریکہ ہر سال ۱۰ لاکھ پونڈ کا زہر دیگر ممالک سے دواؤں میں ڈالنے کے لئے منگایا کرتا تھا مگر پچھلے سال سے یک قلم آنا بند ہو گیا ہے۔ اہل امریکہ نے واشنگٹن کے مقام سی پورٹی میں ایک "پوائزن فارم" قائم کیا ہے جہاں سنکھیا اور دوسرے زہروں کے پودے لگاتے ہیں۔ اور اس ترکیب سے ان کا روپیہ دیگر ممالک میں نہ جائے گا۔ اگر ہندوستانی بھی اپنا نیک و بد سمجھ کر بجائے ولایتی کے دیسی اشیاء کا استعمال شروع کر دیں تو ہر سال وہ کروڑوں روپیہ بچا سکتے ہیں۔"

آیت قرآنی - وَقُل رَّبِّ اَدخِلنِی مُدخَلَ صِدقٍ وَّاَخرِجنِی مُخرَجَ صِدقٍ وَّاجعَل لِّی مِن لَّدُنکَ سُلطٰناً نَّصِیراً" (سورۂ بنی اسرائیل) خط دیوانی جلی میں کشتی کی صورت کی کتابت بقلم: محمد البقدادی۔ کتابت ۱۲۷۷ھ سنہ ۱۹۵۷ء

مجاہدینِ آزادی کے انقلابی کارنامے

ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۹۰۳ء میں انتہا پسند انقلابی لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے تشدد سے کام لیا۔ قتل و غارت گری بمباری کی گرم بازاری کی، انگریزوں کی ریلوں وغیرہ کو بموں سے اڑانا شروع کیا۔ انگریزی حکومت نے ان لوگوں پر مقدمات چلائے پھانسیاں دیں جیلوں میں بند کیا ان لوگوں کے اثرات پنجاب یو پی اور دہلی میں بھی پہنچے، سردار بھگت اور ان کے ساتھی پنجاب میں پیدا ہوئے، ماسٹر امی چند اودھ بہاری بال مکند، لالہ ہنونت سہائے وغیرہ دہلی میں نمودار ہوئے جن پر دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کے الزام میں مقدمات چلے ان اثرات کا نتیجہ ریشمی رومال کی تحریک تھی جس کے بانی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور عبید اللہ سندھی تھے۔

درجہ بدرجہ ان انتہا پسند انقلابی لوگوں کی تحریکوں کے حالات، ان پر مقدمات کی کارروائیاں وغیرہ مخبر عالم مراد آباد میں چھپتی تھیں۔ لارڈ ہارڈنگ پر دہلی میں بم پھینکا گیا تھا۔ اس مقدمے کی کچھ کارروائی مخبر عالم مراد آباد کے چند شماروں ۲۲ رمئی ۱۹۱۴ء ۱۵ رستمبر ۱۹۱۴ء اور ۱۵ راکتوبر ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھیں جو ان شماروں سے نقل کی جاتی ہے۔

۱۸ رمئی کی صبح کو مقدمہ سازش بم دہلی کی سماعت کے لیے عدالت سیشن کا اجلاس ہوا مسٹر ایم ایچ ہیریسن انڈین سول سروس نے اجلاس کرتے ہی ان اشخاص کی درخواستوں پر غور کیا جو بطور اسیر طلب کئے گئے تھے دو درخواستیں بوجہ انگریزی نہ جاننے کے عذر سے رد کی گئیں منظور شدہ اسیروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

نواب امراؤ مرزا، رائے صاحب تھورام، بابو بشیر الدین حسن، سرکار کی طرف سے مسٹر سی راس السٹن اور مسٹر اے بی براڈوے پیروکار تھے اور ڈیفنس کی جانب سے متعدد وکلاء موجود تھے۔

کارروائی کے آغاز میں مسٹر راس السٹن نے عدالت کو اطلاع دی کہ استغاثہ کی رائے میں گیارہ علیحدہ علیحدہ الزامات کی ضرورت نہیں۔ کونسل نے جداگانہ الزامات کے بجائے مندرجہ ذیل قرار دیئے جانے کی تحریک کی کہ تم امیر چند، اودھ بہاری، چھوٹے لال عرف رام لال، لالہ ہنومنت سہائے، بلراج، بال مکند، خوشی رام، منولال، چرن داس، بسنت کمار بسواس اور رگھبیر شرما نے اکتوبر ۱۹۱۰ء اور مارچ ۱۹۱۴ء کے مابین دہلی، لاہور اور برٹش ہند کے دیگر مقامات میں نیز دیگر اشخاص دینا ناتھ، سلطان چند سرکاری گواہ، راش بہاری بوس، ہردیال، ارجن لال سیٹھی، ہری رام سیٹھی اور دیگر غیر معلوم اشخاص نے جرم قتل کے ارتکاب دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کی سازش کی جس کا ارتکاب ۱۷ مئی ۱۹۱۳ء کو لاہور میں ہوا۔ اور اس طرح اس جرم کے مرتکب ہوئے جو دفعات ۱۲۰ ب اور ۳۰۲ تعزیرات ہند قابل سزا ہے۔ مسٹر راس السٹن نے کہا فرد جرم سزا مرتب کرنے میں استغاثہ نے اس فرد جرم کو رہنا بنایا جو انہی دفعات کے مطابق بنگال میں مرتب کیے جانے کے بعد ہائی کورٹ کلکتہ کے تین ججوں کے سامنے پیش ہوا تھا۔ استغاثہ کی چارج شیٹ میں اس لیے اس قدر ناموں کا اظہار کیا ہے تاکہ ڈیفنس کو معلوم ہو جائے کہ اس کے بارے میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ دیگر غیر معلوم شخص کے الفاظ دینا ناتھ نامی سرکاری گواہ کے اس بیان پر مبنی ہیں جس نے ظاہر کیا تھا کہ مجھے راش بہاری بوس نے مطلع کیا کہ تمہارے وہم و گمان بھی نہیں آسکتا کہ اس سازش میں کس قدر آدمی شریک ہیں۔ اگر میں صرف اشارہ کر دوں تو ابھی بیس آدمی اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائیں۔

مسٹر رؤف علی نے ڈیفنس کی طرف سے اعتراض کیا کہ زیر دفعہ ۱۲۰ ب مقدمہ دائر کرنے کی غرض سے گورنمنٹ کی منظوری لازمی ہے۔ چیف کمشنر دہلی نے ابتدا میں صرف سات آدمیوں کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی تھی اور ہنومنت سہائے جیسے موکل کا نام ان سات میں داخل نہ تھا۔

استغاثہ نے جواب دیا کہ دفعات مذکورہ کے مطابق مقدمہ دائر کرنے کی غرض سے لوکل گورنمنٹ کی اجازت کی ضرورت نہیں جب کہ ایسے جرائم کے ارتکاب کا امکان ہو جس کی سزا موت یا حبس دوام بعبور دریائے شور ہو۔ مسٹر رؤف نے مباحثہ جاری رکھا اور اپنے بیان کی تائید میں متعدد حوالہ جات پڑھے۔ عدالت نے ریمارک کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں دفعہ مذکور کے مطابق ایسے مقدمے کے لئے گورنمنٹ کی منظوری ضروری ہے لیکن تم تسلیم کرتے ہو کہ یہاں یہ حالات موجود نہیں لیکن اس پر بھی گورنمنٹ کی منظوری کا اصرار کیا جاتا ہے۔ اعتراض نامنظور ہوا۔ چونکہ فرد جرم پر ڈیفنس کے وکلاء کو اعتراض نہ تھا اس لیے عدالت نے ہر ملزم سے کہا کہ متذکرہ صدر جرم

کا اقبال کرے۔ گر سب نے بے قصوری کا اظہار کیا۔ (مخبر عالم مراد آباد ۲۳ مئی ۱۹۱۴ء)

آج دہلی کے مقدمہ سازش میں مسٹر براڈوے نے ہر ایک ملزم کے خلاف فرداً فرداً شہادت پر بحث کی۔ رام لال کے خلاف مقدمہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ارجن لال سیٹھی نے امیر چند کے ساتھ اس کی ملاقات کرائی۔ استغاثہ کا بیان تھا کہ بسنت کمار کو چونکہ لاہور بم میں ناکامی ہوئی ہے۔ اس لیے دوسرے سازش کنندے مایوس ہو گئے اور اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رام لال کو پولیٹکل کام کے لیے سدھایا جائے، متو لال کی بابت کہا کہ وہ سازش کنندگان کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت تھا جس گھر میں رہتا تھا وہاں سے بہت سی کتابیں خانہ تلاشی میں ملیں اور بعض خطرناک تھیں ہنونت سہائے کے خلاف شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہردیال کو کثیر تعداد میں روپیہ بھیجتا تھا اور اس نے فضل کریم کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ پھر وکیل استغاثہ نے بحث ختم کی اور مقدمہ سازش کے دلائل استغاثہ ختم ہو گئے۔ پھر وکیل استغاثہ نے مقدمہ آتشگیر اشیا کی تاریخ مختصر طور پر سنائی اور کہا کہ امیر چند کے پاس آتشگیر چیزیں نکلیں اور اودھ بہاری نے بھی اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

وکیل صفائی کی بحث:۔ مسٹر رگھوناتھ سہائے نے کہا کہ استغاثہ اس بات کو ثابت نہیں کر سکا ہے کہ امیر چند کے پاس کوئی آتش گیر چیز تھی۔

جج:۔ اسیسرز کو مخاطب کرتے ہوئے جج نے کہا کہ میں اس پر بھی تقریر کرنا نہیں چاہتا آپ ذیل کے واقعات پر غور کریں۔ اول کیا کوئی سازش واقعی تھی؟

دوم: کیا اس سازش کا مقصد قتل کرنا تھا اور کیا لاہور میں قتل ہوا۔

سوم: کیا ملزم اس سازش کے ممبر تھے۔ پھر جج صاحب نے ہر ایک ملزم کے حق میں اور مخالف واقعات کا خاکہ کھینچا۔

اسیسروں کا فیصلہ۔ صاحبان اپنے فیصلے پر غور کرنے کے لیے اندر گئے اور واپس آ کر حسب ذیل بیانات دیئے:۔

مسٹر امراؤ مرزا نے کہا بم کی ٹوپی امیر چند کے مکان سے نکلی امیر چند نے دیدہ و دانستہ خلاف قانون کام کرنے کے لیے اس کو اپنے پاس رکھا اور اودھ بہاری بھی اس جرم میں شامل تھا۔ مسٹر بشیر الدین نے امراؤ مرزا کی سب باتوں سے اتفاق کیا مگر یہ کہا کہ اودھ بہاری اس جرم میں شامل نہ تھا۔ رائے صاحب تھورام نے امراؤ مرزا کی رائے سے اتفاق کیا کہ واقعی ایک سازش تھی امراؤ مرزا نے یہ ظاہر کیا کہ یہ ایک ایسی سازش

تھی جس کا ذکر سرکاری گواہ دینا ناتھ نے مفصل طور پر کیا ہے اور اس کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو قتل کے ذریعہ انگریزی حکومت سے آزاد کرائے اور اسی واسطے لاہور میں قتل کیا گیا، تمام ملزموں نے اتفاق کیا مگر ہنومنت سہائے، منولال اور رگھبیر شرما اس میں شامل نہ تھے۔ مسٹر بشیرالدین نے اس رائے سے اتفاق کیا اور رائے صاحب ٹھٹھو رام وغیرہ نے پہلی دو رایوں سے اتفاق کیا مگر شمولیت کے بارے میں یہ کہا کہ بلراج، ہنومنت سہائے، منالال، رگھبیر شرما اور رام لال اس میں شامل نہ تھے باقی بسنت کمار بسواس، امیر چند، اودھ بہاری، بال مکند، چرنداس اور خوشی رام مجرم تھے تاہم چرنداس اور خوشی رام رحم کے مستحق ہیں کیونکہ ان کو اس جرم کی اہمیت معلوم نہ تھی جس کا وہ ارتکاب کر رہے تھے۔ جج صاحب نے اعلان کیا کہ فیصلہ ۵ ار اکتوبر کو سنایا جائے گا۔ (مجزعالم مراد آباد ۵ ار ستمبر ۱۹۱۴ء)

آخر کار مسٹر ہیریسن خاص جج دہلی نے تحقیقات مقدمہ سازش دہلی کا فیصلہ ۵ ار اکتوبر کو سنا دیا۔ ملزمان کو جیل خانہ سے عدالت میں طلب کیا گیا۔ کچہری کی سڑک پر مسلح پولیس متعین تھی اس وقت عدالت میں وہ یورپین یا ہندوستانی موجود تھے جو پہلے داخلے کے ٹکٹ حاصل کر چکے تھے۔ ملزموں کے وکلاء لالہ جگل کشور، لالہ شیو نرائن، لالہ رگھنا تھ سہائے اور بابو ایس این بوس حاضر تھے۔ جج صاحب ٹھیک تین بجے عدالت میں تشریف لائے اور مقدمہ مادہ ہائے آتشگیر کے متعلق پہلے حکم سنایا۔ جیوری کی رائے سے اتفاق کر کے عدالت نے امیر چند کو زیر دفعہ قانون مذکورہ مجرم قرار دیا۔ اور اودھ بہاری کو زیر دفعہ ۱۶ اعانت کا مجرم ٹھیرایا اور دونوں کو بیس بیس سال بعبور دریائے شور کی سزا دی مقدمہ سازش بم کے متعلق عدالت نے بسنت کمار کو مجرم قرار دیا مگر اس کی جوانی پر رحم کھا کر اس کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی مگر بال مکند، امیر چند اور اودھ بہاری کو سازش بم کے مجرم قرار دے کر سزائے موت کا حکم سنایا گیا، بلراج اور ہنومنت سہائے ان دونوں کو بھی عمر قید کی سزا دی گئی۔ ان کے سوا پانچ ملزم یعنی چرنداس، رگھبیر شرما، منولال، خوشی رام اور رام لال بری کئے گئے اور دینا ناتھ و سلطان چند پہلے ہی بطور سرکاری گواہ کے رہا ہو چکے تھے۔

(مجزعالم مراد آباد ۵ ار اکتوبر ۱۹۱۴ء)

علی گڑھ میں بھی آزادی کی لہر پہنچ چکی تھی اور وہاں کے لوگوں میں بھی بیداری پیدا ہونے لگی تھی۔ برطانوی حکومت کی غلامی کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو اس وقت علی گڑھ کی عدالت میں موتی لال اور مولانا حسرت موہانی کے باغیانہ مقدمات چل رہے تھے ان دونوں مقدموں کی کارروائی ۱۷ جولائی ۱۹۰۸ء کے مخبر عالم مراد آباد میں چھپی۔ ضمناً اس خبر میں سوراجیہ الہ آباد کے ایڈیٹر کے مقدمہ کا فیصلہ بھی ابتدا میں درج ہو گیا تھا۔

"بمبئی و کلکتہ کی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بھی دو مقامات الہ آباد اور علی گڑھ میں تین متواتر مقدمات سڈیشن قائم ہوئے تھے جن میں سے صرف ایک مقدمہ سڈیشن الہ آباد میں منشی شانتی نرائن مالک و ایڈیٹر سوراجیہ کو جرائم میں ساڑھے تین سال کی قید سخت اور ایک ہزار روپے جرمانہ کا حکم ہفتہ گذشتہ سنایا گیا ہے۔ لیکن علی گڑھ کے دونوں مقدمات سڈیشن ہنوز زیر تجویز ہیں۔ ان مقدمات میں پہلا مقدمہ موتی لال کا ہے جو آگرہ بورڈنگ ہاؤس سے معہ بہت سے خطوط و کتب و اخبارات انگریزی و جرمنی و روسی وغیرہ کے گرفتار ہوئے جن میں چین اور دیگر ممالک میں گورنمنٹ کے خلاف سڈیشن پھیلایا تھا اور کچھ عرصے سے یہ علی گڑھ میں مقیم تھا جہاں سے اس نے اخبار بندے ماترم کو ایک بدخواہی سرکار پیغام متعلق مقدمہ بم مظفر پور بھیجا تھا۔ چنانچہ یہ مقدمہ محض اس وجہ سے ضلع علی گڑھ منتقل کیا گیا جس کی متواتر پیشیاں بعدالت مسٹر ایف جے برٹ صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی گڑھ ہوئیں جس میں ملزم نے بیان کیا کہ میں ذات کا جاٹ ہوں اور پیشہ کا وقائع نگار، اخبار نویس ہوں۔ میرا وطن ضلع متھرا کے علاقہ ماٹھل کے ایک گاؤں میں ہے۔ اخبار بندے ماترم کے نام پیغام تار کا بھیجنا تسلیم کیا۔ جس کا مضمون باغیانہ تھا۔ کہ جو اسباب میرے پاس پایا گیا وہ سب میرا نہیں ہے بلکہ بذریعہ ڈاک مجھے دھمکانے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ خوف دلا کر کچھ حاصل کیا جائے۔ یہ کاغذات اس وقت پہنچے تھے جب کہ میں مارسیلز میں تھا اور وہ یورپ سے بھیجے گئے تھے۔ مقیاس الحرارت کہ یہ آلہ تھرمامیٹر میرا اپنا ہے۔ اس سے گرمی کا درجہ معلوم کیا کرتا ہوں۔ میں ۲۲ اپریل کو علی گڑھ میں آیا تھا۔ تقریباً چار ہفتے یہاں ٹھہرا ۱۹ مئی کو یہاں سے چل دیا تھا۔ جمعرات کی پیشی میں ثبوت اور ایک تحریری شہادت پیش کی گئی ہے جو ملزم کے خلاف ہے۔ مجسٹریٹ

نے ثابت پایا کہ ملزم نے ۱۱ مئی کو علی گڑھ سے ایک مفسدانہ پیغام تار کلکتہ کے اخبار بندے ماترم کو بھیجا تھا۔ اس میں مظفر پور کی واردات بم پر خوشی ظاہر کی گئی تھی اور جن لوگوں نے اس واردات پر افسوس اور ناراضی کے جلسے کیے تھے ان کو بدخواہ ملک اور قومی نمک حرام بتلایا گیا تھا۔ لہٰذا مجسٹریٹ صاحب نے الزام زیر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند کی فرد عاید کی اور ملزم کو سیشن سپرد کر دیا۔ ملزم نے صرف ایک گواہ پیش کرنا چاہا جو بمبئی کا کوئی ڈاکٹر ہے اور جس کے نام سمن بھیجا گیا ہے۔

دوسرا مقدمہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے پروپرائٹر ہے جو علی گڑھ کے ایک ماہوار رسالہ اردوئے معلیٰ کا ایڈیٹر ہے۔ ۱۵ جون کی پیشی میں سید صاحب نے تسلیم کیا کہ ان کا ایک مطبع بھی ہے جس کا نام اردو پریس ہے اور وہ خود ہی اس رسالہ کے مالک اور ایڈیٹر وغیرہ ہیں۔ ۹ جولائی کی پچھلی پیشی میں استغاثہ کی طرف سے مسٹر وائٹ گورنمنٹ ایڈووکیٹ پیروکار تھے اور ملزم کی طرف سے کمار چندر سنگھ حاضر تھے ملزم کے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجسٹریٹ صاحب اس مقدمہ کو خود سماعت نہ فرمائیں اور اس کو سیشن سپرد فرما دیں۔ کیونکہ اس کی وجوہات سنگین ہیں۔ جس پر مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ وہ وجوہات بیان کی جائیں کہ کیوں وہ خود سماعت نہ کریں کونسل نے کہا کہ وہ ایسی وجوہات ہیں کہ کسی غیر شخص کے سامنے ظاہر نہیں کیے جا سکتے اور ان میں ایک یہ بھی وجہ ہے کہ اس مقدمہ میں مجسٹریٹ صاحب کو بھی بطور گواہ کے شہادت دینا ہوگی مجسٹریٹ صاحب نے کہا کیا ایسی وجوہات ہیں ان کا ظاہر کرنا ضروری ہے کونسل نے کہا کہ اگر مجسٹریٹ صاحب پرائیویٹ طور پر سنیں تو ملزم ظاہر کر سکتا ہے۔ تب مسٹر وائٹ نے کہا کہ ہم بھی ان وجوہات کے سننے کے مجاز ہیں۔ مجسٹریٹ صاحب نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہم ملزم کی نسبت کیا شہادت دے سکتے ہیں ملزم اس مضمون کی اشاعت منظور کر چکا ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیا وہ مضمون مفسدانہ اور بدخواہانہ سازش ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ملزم اور اس کے کونسل نے تھوڑی دیر تک باہم مشورہ کیا تب کہا کہ ہم وہ تمام امور عرض کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ کمرہ اجلاس خالی کرایا جائے اور یہاں کوئی غیر آدمی یا رپورٹر رہنے نہ پائے یہ بات منظور کی گئی اور سب کو کمرہ سے باہر جانے کے لیے کہا گیا۔ صرف چار آدمی اس اجلاس میں رہ گئے ایک مجسٹریٹ صاحب، مسٹر وائٹ ملزم اور ان کا کونسل ایک لمبے وقفے کے بعد پبلک کو پھر اجلاس میں آنے کی اجازت دے دی اور ملزم کی درخواست خارج کر دی، اس کے بعد ضابطے کے ساتھ کارروائی شروع کی۔ استغاثہ کی طرف

سے ایک گواہ سید محمد حسین پیش ہوا۔ اس کی عمر بارہ برس کی تھی۔ اس نے رسالہ اُردوئے معلیٰ کا وہ پرچہ شناخت کیا جس میں مقدمہ سازیشن کی بنیاد کا مضمون شائع کیا گیا ہے یہ ماہ اپریل کا پرچہ ہے یہ مضمون میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میں خوشنویس کاتب ہوں۔ مجھے اس پرچہ کی فی صفحہ کی اُجرت دو آنے ملتی ہے۔ آٹھ صفحے کا ایک روپیہ ملتا ہے اس کے بعد مولانا محمد مشتاق حسین سیکریٹری محمڈن کالج علی گڑھ نے بتایا کہ اُردوئے معلیٰ رسالہ کا وہ خاص پرچہ ہم نے دیکھا ہے جس میں مضامین زیر بحث شائع کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ راقم ان مضامین کا ایک مسلمان طالب علم ہے ہم نے تحقیقات سے معلوم کیا کہ وہ مسلمان طالب علم کون ہے۔ وہ ہمارے اسکول کے انٹرنس کلاس کا ایک اٹھارہ سالہ جوان لڑکا ہے۔ اس نے اقبال کیا کہ وہ مضمون اس نے لکھا تھا، ہماری رائے میں یہ مضمون نہایت خراب ہے۔ اسے پڑھ کر بے شک ایک مسلمان برٹش گورنمنٹ سے بیزار اور بے دل ہو سکتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" ہے۔ اس میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف بہت کچھ سخت سست لکھا ہے جو شدت سے بدخواہانہ اور مفسدانہ ہے جب کہ ہم نے دیکھا کہ راقم اس ناقص اور قابلِ اعتراض مضمون کا ہمارے ہی اسکول کا ایک کمبخت نوجوان ہے۔ ہم نے فوراً اس لڑکے کے والد کو تار کے ذریعے علی گڑھ طلب کیا، پرنسپل علی گڑھ کالج کے سامنے ایک کمیٹی کی اور اس کم بخت لڑکے کو کالج کے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس سے ایک سال کے لیے خارج کر دیا اور قرار دیا کہ وہ دوبارہ داخل نہ کیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اپنے چال چلن اور خیالات کی اصلاح نہیں کرے گا۔ اس لڑکے نے ہمارے سامنے بیان کیا تھا کہ ملزم میرے پاس آیا تھا۔ اور اس نے مجھے اس مضمون کے لکھنے کی تحریک کی تھی، لڑکے نے ملزم کو کہہ دیا تھا کہ جو خیالات اس مضمون میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ ہرگز میرے ذاتی خیالات نہیں ہیں۔ لیکن ملزم نے اس سے کہا تھا۔ کہ وہ خود اس کو درست کرے گا۔ اس شہادت کی ملزم کے کونسل نے جرح ملتوی رکھی ہے اور کہا آئندہ موقع پر جرح کی جائے گی۔ اس کے بعد خاتمۂ اجلاس پر ملزم نے ایک درخواست پیش کی کہ وہ عدالت سے بارہ روز کی مہلت چاہتا ہے کیونکہ وہ اس عرصے میں ہائی کورٹ سے درخواست کرے گا کہ یہ مقدمہ کسی اور حاکم کے اجلاس میں منتقل کیا جائے، چنانچہ مجسٹریٹ نے یہ درخواست منظور فرمائی۔ اور حکم دیا کہ آئندہ پیشی کے لیے ۲۲ ماہ جولائی قرار دی جاتی ہے۔ دیکھیے اس مقدمے کے انتقال کی بابت ہائی کورٹ سے کیا حکم ہوتا ہے۔"

۲۶ اگست ۱۹۰۸ء کے مخبر عالم میں موتی لال اور مولانا حسرت موہانی کے مقدمات کے فیصلے

کی بہت چھوٹی سی خبر شائع ہوئی۔

موتی لال ورما کو بجرم سڈیشن سات سال قید جلاوطنی کی سزا دی گئی اور اردوئے معلیٰ علی گڑھ کے ایڈیٹر فضل الحسن بی اے کو بجرم سڈیشن ڈیڑھ سال قید سخت کی سزا ہوئی، اس کے علاوہ پانچ سو روپے جرمانہ ہوا۔

ہندوستان میں سارگوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے بڑی بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ جانیں قربان کیں اور ہنستے کھیلتے پھانسی کے پھندوں کو چوما۔ ان بہادر ہندوستانیوں میں خودی رام بوس بھی تھے جن کے پھانسی پانے کی خبر ۲۶ اگست ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

خودی رام بوس کو ۱۱ تاریخ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کا چہرہ آخری دم تک ہشاش بشاش اور بے خوف رہا۔ اس کے وکیل کالی داس بوس صاحب نے مجسٹریٹ سے اجازت چاہی تھی کہ اس کی لاش اس کے رشتہ داروں کے حوالے کی جائے تاکہ مناسب طریقہ میں اس کی تجہیز و تکفین کی جا سکے، صاحب مجسٹریٹ نے لاش کا دینا اس شرط پر منظور کیا کہ ان کی لاش کے ہمراہ اٹھانے والے اشخاص کے سوائے چند اشخاص سے زیادہ شامل نہ ہوں اور نہ کوئی جلوس نکالا جائے۔ خودی رام بوس کی آخری خواہش صرف یہ تھی کہ اس کو چنڈی استھان کا پرشاد چکھایا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ میں ان راجپوت عورتوں کے مانند جان دوں گا جو جلتی ہوئی چتا پر جان دیتی تھیں۔ وہ خوشی خوشی ہنسی خوشی پھانسی پر چڑھا اور مردانگی کے ساتھ جان دی۔ اس کی لاش اس کے رشتہ داروں کے حوالے کی گئی پولیس کا کافی انتظام تھا۔ ایک خودی رام بوس کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے کنارۂ دریا سے لے کر جیل خانہ تک دو رویہ پولیس کا پہرہ تھا، گھاٹ پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑی تعداد میں موجود تھے لیکن وہ کسی قسم کی دست اندازی نہیں کرتے تھے، لوگوں کا ہجوم بے اندازہ تھا۔ اگرچہ جلوس نہیں نکالا گیا تھا۔ لیکن بہت سے لوگ گھاٹ پر جمع تھے اور تمام راستے میں لوگ کوٹھوں پر خودی رام بوس کی ارتھی کو مرگھٹ پر جاتی ہوئی دیکھ رہے تھے۔

بال گنگا دھر تلک ہندوستان کے ان رہنماؤں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی حکومت کا خوف ہندوستانیوں کے دلوں سے نکالا اور ان میں بیداری پیدا کی تلک مہاراج جہاں بدیشی حکومت سے نبرد آزما تھے۔ وہاں کانگریس کے ٹھنڈے دل سے بھی مقابلہ کرتے رہتے تھے اور ان کی نرم پالیسی کو بدلنا چاہتے تھے تاکہ ملک کی آزادی کی لڑائی بڑی تیزی سے لڑی جائے۔ مسٹر تلک ایک اچھے مقرر ہونے کے ساتھ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار "کیسری"

میں انگریزوں کے خلاف بڑے سخت آرٹیکل تحریر کیے بڑی بے باکی کے ساتھ مضامین لکھے جن کو انگریزی حکومت برداشت نہیں کر سکی۔ ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا جس میں چھ سال کی سزا ہوئی اس سزا پہ مجرم عالم مراد آبادی نے ایک طویل اداریہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں لکھا۔

"مسٹر بال گنگا دھر تلک جن کا مقدمہ سڈیشن بمبئی ہائیکورٹ میں نہایت شدومد سے چل رہا تھا اور باوجود چند پیروکار قانونی کے خود مسٹر تلک نے پانچ روز برابر دھواں دھار تقریر کی تھی۔ جس میں ترجمہ کی غلطیوں کو ظاہر کر کے اپنی آزاد خیالی کو مفید ملک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخر میں اہل جیوری جس میں سات یوروپین اور دو پارسی تھے، ان کا اور جج کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے انکی تقریر کو غور سے جس کے جواب میں مسٹر نسیمن صاحب ایڈوکیٹ جنرل نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ موقع کو فضول تقریر کا نہ تھا مگر اچھا ہو کہ مسٹر تلک نے ۵ روز تقریر میں دل کا غبار نکالا، اچھا ہو جج صاحب نے ان کو تقریر کرنے سے نہیں روکا ورنہ دیسی اخبار جو مسٹر تلک کے طرف دار ہیں۔ ضرور شور مچاتے کہ انصاف میں رخنہ ڈالا گیا ہے۔ مسٹر تلک نے ترجمے کی غلطیوں پر زور دے کر کہا کہ عمداً ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو اصل مطلب سے مختلف ہے اور جس سے مجھے تباہ کرنے کی کوشش مترشح ہوتی ہے۔ مسٹر تلک نے اپنے مضامین کی نسبت ثابت نہیں کیا کہ ان کا مطلب قانون کی حدود میں ہے، تین دن تک وہ ملکی معاملات پر تقریر کرتے رہے لیکن اس سے مضامین بدل نہیں سکتے۔ اہل جیوری کو ان خاص مضامین پر توجہ کرنی چاہیے جو اس مقدمہ کی بنیاد ہیں، اور غور کرنا ہے کہ کیا ان مضامین سے سڈیشن نہیں ٹپکتی۔ مسٹر تلک نے لمبی تقریر میں خوب ڈھول اڑا کر کوشش کی ہے کہ اصل مضامین سے ہٹ جائیں حالانکہ جیوری کو انھیں مضامین کے مضمون اور مطلب پر رائے دینی ہے۔ مسٹر تلک نے جن اینگلو انڈین اخبارات کے سخت مضامین کا حوالہ دیا ہے، وہ مضامین ان خاص اخبارات سے اخذ کر کے پیش نہیں کیے گئے تاکہ جیوری کو اصل حقیقت معلوم ہوتی بلکہ ان اخبارات کے مضامین جو مرہٹی اخباروں میں دیے گئے تھے وہ پیش کیے ہیں چنانچہ مسٹر برنیسن نے اخبار پانیر مورخہ ، مئی کا لیڈنگ آرٹیکل پڑھ کر سنایا۔ جس کا عنوان "بم کے گولوں کا معاملہ" تھا۔ اور کہا کہ اس مضمون میں کسی پر کوئی شخصی حملہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ عام طور پر رائے زنی کی گئی ہے اور مسٹر تلک کا اس پر نازاں ہونا "چور کی داڑھی میں تنکے" کے مصداق ہے۔ مسٹر تلک نیشنل کانگریس کی اعتدال پسند پالیسی کے حامی نہیں ہیں۔ ....

.... بلکہ وہ انتہا پسند ہیں۔ اسی وجہ سے کانگریس سے معدوم کیے گئے۔ الخ

مضامین میں مسٹر تلک نے سرکار کو دھمکایا ہے کہ اگر منہ مانگے حقوق نہ دے گی تو بم کے گولوں سے خبر

مل جائے گی۔ اس مضمون میں خوشی ظاہر کی گئی ہے کہ بم کے گولے بہت سستے اور آسانی سے تیار ہو سکتے ہیں جن بنگالی قاتلوں نے بم کے گولوں سے کام لیا ان کے افعال مستحسن قرار دیئے گئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ کا طریقہ نہایت خراب ہے اور جب تک حکام کو ایک ایک کر کے دھمکی سے خوفزدہ نہ کیا جائے گا۔ وہ ہرگز رعایتیں نہیں دے گی، ان فقروں کا انہوں نے کچھ بھی جواب نہیں دیا ایسے ہی کو نسلیں اور کئی فقرے سنائے جس کا مطلب اپنے طریقہ پر ظاہر کیا اور کہا کہ اس سے بڑھ کر مفسدانہ جرم اور کیا ہو گا غرض کہ مسٹر برنسین نے اخبار کیسری کے مضامین ایسے رنگ میں پیش کیے کہ جیوری والوں کو معلوم ہو جائے کہ جرائم کے ارتکاب میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ ایڈووکیٹ جنرل کی یہ تقریر پانچ بجے شام کے ختم ہوئی، اور برخواستگی اجلاس کے وقت جج صاحب نے کہا کہ ہم اس مقدمے کا آج ہی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ صرف بیس منٹ کے لیے اجلاس برخاست ہوا تاکہ اس عرصہ میں اہل جیوری آرام کر کے تروتازہ ہو جائیں۔ اس کے بعد مسٹر برنسین نے تقریباً پاؤ گھنٹہ اور بحث کی۔ انہوں نے مسٹر تلک کی طویل تقریر کے بارے میں کہا کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے جرائم کی سختی میں کوئی فرق آیا ہو، ان مضامین کے معنیٰ وہی ہیں جو مضامین پڑھنے سے ظاہر ہوتے ہیں مسٹر تلک کا یہ کہنا فضول ہے کہ اس کی نیت نیک تھی جب کہ خود مضامین بتا رہے ہیں کہ ان میں بڑا زہر بھرا ہوا ہے۔ مسٹر تلک نے لکھا ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کی مردانگی کو نابود کر دیا ہے اس طرح کہا ہندوستانی فوجیوں کو صریحاً ذلیل نہیں کیا گیا ہے، یہ بات انتہائی شرمناک و قابل مذمت ہے۔ ہندوستانی فوجیوں نے میدان جنگ میں اپنے فرائض جس مردانگی اور جاں نثاری سے ادا کیئے ہیں اس پر ایک زمانہ عش عش کرتا ہے، جب کبھی ان کو دشمن کی سرکوبی کا موقع ملا انہوں نے بہادری کے جوہر دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اپنی بحث کے خاتمے سے قبل مسٹر برنسین نے اس کارڈ کا حوالہ دیا جو ملزم کے کاغذات میں برآمد ہوا تھا جس میں بم کے گولوں کی کتابوں کے نام لکھے تھے جس کی منادی میں مسٹر تلک نے بڑے زور سے نیک نیتی ظاہر کی تھی۔ مسٹر برنسین نے بتایا کہ اس کارڈ سے صاف ہوتا ہے کہ ملزم خود بم کی سازش میں حصہ رکھتا تھا۔ اس سے جرم اور خطرناک بن جاتا ہے شام کے چھ بج چکے تھے جب کہ مسٹر برنسین کی تقریر ختم ہوئی اس وقت جج صاحب نے جیوری کے ارکان کو مخاطب کر کے ایک ناصحانہ تقریر کی اور عدل و انصاف کی اہمیت کو سمجھایا اور اخبار کیسری کے پرچوں کے مضامین کے کچھ فقرے پڑھ کر سنائے اور کہا کہ ملزم نے ترجمہ کی غلطیوں پر بہت زور دیا ہے حالانکہ مترجم کی ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ آخر میں اس کارڈ کی نسبت ایک فقرہ کہا یہ مسٹر تلک

کی ٹمبل کی دراز سے ہاتھ آیا تھا۔ اہلِ جیوری کو اس کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ جج صاحب نے دو گھنٹے اپنے خیالات کا اظہار کیا آٹھ بجے شب کے اہلِ جیوری سے مشورہ کے لیے اٹھے اور قریب سوا گھنٹے کے بعد واپس آ کر بتایا کہ نو جیوری کے ممبران میں سے سات ممبران کے نزدیک مسٹر تلک تینوں جرموں کا قصوروار ہے۔ اس وقت قریب ساڑھے نو بجے تھے جب کہ جج صاحب نے یہ درخواست نامنظور کی اور کہا کہ ان قانونی باتوں میں کوئی امر پیچیدہ نہیں ہے جو محتاجِ استفسار ہو۔ جب اہلِ جیوری نے ملزم کو قصوروار ٹھہرایا تو اس موقع پر ایڈوکیٹ جنرل نے یاد دلایا کہ ملزم پہلے بھی اس جرم میں سزا پا چکا ہے اس کو ملزم نے بھی قبول کیا۔ تب جج صاحب نے ملزم کو مخاطب کر کے نہایت پُراثر الفاظ میں آخری حکم سنایا۔

"بال گنگادھر تلک اب ہمارا فرض ہے کہ میں تم کو حکم سناؤں ہم نہیں بتلا سکتے کہ اس فرض کی ادائیگی میں ہم کو کتنا رنج ہے تم بے شک اعلیٰ لیاقت اور بڑی طاقت و تاثیر کے آدمی ہو، یہ لیاقتیں اور یہ تاثیر اگر ملک کی بہبودی اور نفع میں صرف کی جاتیں تو کیا خوش نصیبی اور اچھی بات ہوتی۔ دس برس ہوئے جب کہ تم مجرم پائے گئے تھے اور عدالت نے بہت رحم کر کے تم کو صرف ڈیڑھ سال کی سزا دی تھی سرکار نے بھی تم پر بہت رحم کیا کہ جب تمہاری سزا میں صرف چھ ماہ باقی تھے تم کو چھوڑ دیا تھا اور اس وقت تم نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسے فعل کا ارتکاب نہ کرو گے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دماغ میں فتور ہے ورنہ تمہارے جیسے سمجھ دار شخص کے قلم سے کیوں ایسے آرٹیکل نکلتے جو پولیٹیکل ایجی ٹیشن کے لیے جائز ہتھیار نہیں ٹھہر سکتے۔ ان مضامین میں سڈیشن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ان میں مجرمانہ حرکتوں کو جائز ٹھہرایا گیا ہے اور مجرموں کو جوش دلایا ہے، ان میں قتل کی وارداتوں پر تسلی اور اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے اور ان مضامین میں تم نے بم کے پھینکنے پر خوشی کا اظہار کیا ہے، جس شخص کے اوسان ٹھکانے پر ہوں وہ بم کے گولوں کے استعمال کو ایجی ٹیشن کا جائز طریقہ کیسے مان سکتا ہے اس عرصہ دس سال میں فرمانروا اقوام کی طرف تمہاری نفرت مطلق کم نہیں ہوئی ہے۔ یہ مضامین عمداً جان بوجھ کر علی التواتر لکھے گئے ہیں یہ گھبراہٹ میں نہیں لکھے گئے ہیں۔ بلکہ مظفر پور کی واردات کے دو ہفتے کے بعد شائع کئے گئے ہیں جہاں دو بے گناہ عورتیں کمال بے دردی

سے نقل کی گئی ہیں، تم نے بم کے گولوں کے بارے میں اس طرح لکھا ہے کہ گویا پولیٹیکل جدوجہد کے جائز وسائل سے ہیں، اس قسم کی اخبار نویسی ملک کے لیے باعث لعنت ہے ہمیں تم کو سزا کا حکم سناتے ہوئے حقیقت میں بہت رنج ہے۔ ہم نے پہلے ہی بہت غور سے سوچ لیا تھا کہ اگر جیوری کا فیصلہ تمہارے خلاف ہوگا تو کیا سزا تجویز کی جائے۔ ہم نے ایسی سزا دی ہے جو بعض لوگوں کے نزدیک نرم سمجھی جائے گی۔ ہمارے فرائض کے لحاظ سے اور تمہارے جرائم کو دیکھ کر ہم خیال کرتے ہیں کہ جو سزا ہم نے تجویز کی ہے اس سے نرم تر سزا ناممکن ہے قانون چاہتا ہے کہ انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے اور ہم خیال کرتے ہیں کہ تمہاری حیثیت کے آدمی کے لیے یہ سزا کافی ہوگی اول جرم کی پاداش میں تم حبس دوام بعبور دریائے شور کے سزاوار ہوا تم نے سوچا ہے کہ تمہیں کالے پانی کی سزا دی جائے۔ تمہاری عمر کے خیال سے اور نیز ملک کے امن و انتظام کے لحاظ سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جس ملک کی محبت کا تم دم بھرتے ہو اس ملک سے تم کو کچھ عرصہ کے لیے علیحدہ کر دیا جائے بروئے الزام دفعہ ۱۲۴ الف کے ہم مجاز ہیں کہ تم کو عمر بھر کے لیے یا اس سے کم تر عرصے کے لیے کالے پانی کی سزا دیں یا ہم اس دفعہ کے دونوں الزاموں کے لیے کالے پانی کی سزا دیں اور اس لئے اس دفعہ کے دونوں الزاموں کے لیے تم کو تین تین سال قید کالے پانی کی سزا دیتے ہیں، جو یکے بعد دیگرے بھگتنی ہوگی یعنی تم کو ۶ سال تک کالے پانی رہنا ہوگا۔ تیسرے الزام کی سزا میں قید یا جرمانہ ہے لیکن کالا پانی نہیں ہے ہم سمجھتے ہیں کہ قید کی میعاد میں اضافہ کرنا ضروری نہیں لہٰذا اس جرم کے لیے تم کو ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ تم پر جو چوتھا الزام لگایا گیا ہے وہ واپس لیا جائے اس الزام سے تم کو بری کیا جاتا ہے۔

اس حکم کو ملزم نے خاموشی کے ساتھ سنا۔ اجلاس میں سناٹے کا عالم تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے، مسٹر تلک کو فوراً موٹر گاڑی میں بٹھا کر عدالت سے لے گئے، یہ ایسا وقت تھا جب کہ قیدی کے لے جانے میں کسی قسم کی دقت یا شورش نہیں ہوئی، کیا عجب ہے کہ اب ہائی کورٹ کے فل بنچ میں مکرر قسمت آزمائی کی جائے۔ اس سزایابی کی اطلاع صبح کو بمبئی اور پونہ میں ہوئی بعض

جگہ بلوہ ہوگیا، ملیں بند ہوگئیں، کوئی مزدور کام پر نہیں آیا، مسٹر تلک کے حامیوں نے دکانیں بند کردی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ جمعہ کو بمبئی میں ایک بڑا خونخوار ہنگامہ ہوگیا جس میں تین آدمی مارے گئے اور تین درجن زخمی ہوئے ہیں، یورپینوں پر پتھر پھینکے گئے، گری روڈ اسٹیشن تباہ کرڈالا۔ فسادیوں پر فوج گورا والنٹیرز اور ملٹری پولیس نے فائر کئے۔ تینوں فوجیں برابر گشت کررہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر تلک کی عمر پچاس سے بھی تجاوز کرچکی ہے، ۵۲ سال عمر ہے۔ اس لیے مسٹر جسٹس داور نے صرف چھ سال کی قید پر اکتفا کیا ورنہ تمام عمر کی قید کی سزا دے سکتے تھے، اس حکم کے بعد مسٹر تلک کو پولیس نے گھیر لیا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو ممکن تھا ان کے لے جانے پر کچھ شورش ہوتی لیکن اس وقت عدالت کے باہر بالکل سناٹا اور اندھیرا تھا۔ ان کو فوراً موٹر کار پر سوار کرکے مہابولی اسٹیشن لے گئے۔ وہاں ایک ریل گاڑی درجہ دوم کی پہلے سے تیار تھی۔ اس میں بٹھا کر احمد آباد کی ٹرین میں اس گاڑی کو جوڑ دیا۔ کچھ معلوم نہیں ہے کہ تلک کو کہاں رکھا جائے گا۔ صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ احاطۂ بمبئی کے ملک مہاراشٹر میں نہیں رہنے پائیں گے عام خیال ہے کہ جزائر انڈمان تو نہیں جاسکتے کیونکہ وہاں اب صرف عمر قید کی سزا پانے والے ہی بھیجے جاسکتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ان کو حیدرآباد سندھ کی جیل میں رکھا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں احمد آباد کی جیل میں رکھیں گے، اینگلو انڈین اخبار اس سزا پر خوش ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس کا اثر امن و امان ملک کے لئے خاطر خواہ ہوگا۔

رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی

مخبر عالم مرادآباد جہاں علمی، ادبی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا، وہاں وہ رفاہ عام کے کاموں میں بھی پیش پیش رہتا تھا، شہر مرادآباد کی صفائی ستھرائی کے بارے میں بھی لکھتا تھا اور مرادآباد میونسپل بورڈ کی غفلت پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں آتا تھا اس کی تحریر کا اثر میونسپل بورڈ پر ہوتا تھا مرادآباد سٹی پوسٹ آفس میں ڈلیوری کی اجازت نہیں تھی جب کہ یہ اجازت علی گڑھ کے پوسٹ آفس کو حاصل تھی، چنانچہ اس سلسلے میں مخبر عالم نے اپنے قلم کو جنبش دی تو ہیڈ آفس نے بھی توجہ کی۔ جس کا ذکر ۸ر دسمبر ۱۹۰۸ء کے مخبر عالم میں کیا گیا ہے۔

"ہم نے ۱۴ نومبر کے مجمع عام میں جو صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کو توجہ دلائی تھی کہ وہ براہ مہربانی سٹی پوسٹ آفس کو مثل علیگڑھ کے ڈلیوری کی اجازت مرحمت فرما کر پبلک مراد آباد کو مشکور فرمائیں کیونکہ ہیڈ آفس کو انتظام ڈلیوری بوجہ فصل شہر ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ میں رہتا ہے اور شہر میں ڈاک دیر میں پہنچتی ہے جس سے مراد آباد کی پبلک کو عموماً اور تجارت پیشہ لوگوں کو خصوصاً تکلیف ہوتی ہے اور بہت سے ضرورت مندوں کو اپنا حرج کار کر کے خود ہیڈ آفس تک جانا پڑتا ہے۔ اکثر مقامات پر سیکنڈ ڈلیوری کے وقت فرسٹ ڈلیوری پہونچتی ہے ہر چند کہ پوسٹ مین بڑھا دیئے گئے اور منی آرڈر کو بن جدا کیے گئے مگر کام نہ چل سکا اور پھر بدستور پوسٹ مین تمام ڈاک یکجا تقسیم کرنے لگے چنانچہ حال ہی میں ایسا انتظام دو مرتبہ کیا گیا مگر دیر کی شکایتیں اور زیادہ ہونے لگیں۔ مجبوراً یہ انتظام توڑ دیا گیا لیکن دیر رسی کی قدیم شکایتیں اب تک نہ مٹ سکیں۔ ہم نے ان تمام خرابیوں کو دور کرنے کی غرض سے توجہ دلائی تھی کہ شہر کے ڈاک خانہ کو جو عین وسط شہر میں واقع ہے۔ اور خاص چوک میں روانگی کا کام کرتا ہے اس کو ڈلیوری کی اجازت دی جائے کہ وہ آئندہ سے شہر کی ڈاک بھی تقسیم کیا کرے اور ہیڈ آفس کیمپ اور متعلقات کی ڈاک کی تقسیم کے علاوہ اپنا معمولی کام کیے جائے چونکہ یہ ہیڈ آفس اس وقت کی نشانی ہے جب مراد آباد چھاؤنی تھی اور بڑا حصہ ہی کام کیمپ چھاؤنی کا رہتا تھا، اب عرصہ ہوا کہ مراد آباد چھاؤنی توڑ دی گئی اور زیادہ کام شہر کا رہ گیا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ڈلیوری شہر کا کام اب بھی ڈاک خانہ صدر ہی میں رکھا جائے اور خواہ مخواہ دیر رسی خطوط کی شکایتیں رہنے دی جائیں ہماری اس مفید عام درخواست پر شکر ہے کہ پوسٹ ماسٹر جنرل ممالک متحدہ نے اس طرف توجہ فرمانے کا بذریعہ چھٹی وعدہ کیا ہے۔ جس کے پیش نظر ہم خط موصولہ کی روشنی میں اہالیان شہر کو بہ مسرت یقین دلاتے ہیں کہ اب انشاء اللہ جلد اس شہر کو ڈاک خانہ صدر کا راستہ ناپنے اور دیر سے خطوط کے پہونچنے کی تکلیف نہ ہوگی اور جلد ڈاک خانہ شہر کو ڈلیوری کی اجازت مل جائے گی"

علمی نوک جھونک

اس زمانے میں ادبی رسالوں اور اخباروں کے اپنے ہم عصروں سے مختلف مسائل اور علمی مسئلوں پر نوک جھونک اور جھگڑے ہوتے تھے۔ کلام پر اعتراض کیے جاتے تھے۔ اور اشعار پر اصلاحیں بھی کی جاتی تھیں۔

مخبر عالم کے بھی اپنے ہم عصروں سے اختلاف رہے اور خاص طور پر نیّر اعظم سے مستقل جھگڑے رہے۔ نیّر اعظم کے ایڈیٹر صاحب کی صاحبزادی کی شادی بھی ہوئی تو وہ بھی اختلاف کی نظر ہو گئی۔ نیّر اعظم کے ایڈیٹر صاحب اپنے سمدھی سے لڑ بیٹھے۔ مخبر عالم نے اس اختلاف کو خوب اچھالا۔ اور ۱۵/ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کے شمارے میں یہ قطعہ شائع فرمایا ؎

چال سے خالی نہیں دنیا مگر — ہاتھ آتا ہے بڑی مشکل سے مال
اور وہ بھی ان کا دعویٰ جن کو ہو — چال والوں سے بھی ہم چلتے ہیں چال
حضرتِ قسطاس نے اپنا مکان — بیچ کر ناحق خریدا ہے ملال
خانہ آبادی ہوئی بیٹے کی کیا — خود ہوئے بے خانماں آشفتہ حال
کیسی شادی خانہ بربادی ہوئی — پھنس گیا قرضے میں ان کا بال بال
جو تھی امید سلامی و جہیز — اس کے عوض اور کھویا اپنا لال
نیّر اعظم کی دختر گھر رہی — چوتھی منزل سے نکلنا تھا محال
اس لیے اسباب و سامانِ جہیز — بن گیا جیشِ عرب کی بس مثال
بے لیے ڈولا ہوئی رخصت بارات — نیّر اعظم کا جو دیکھا جلال
پیشتر اس سے کبھی نہ دیکھی نہیں — یہ اولوالعزمی یہ فیاضی کمال
اک انوکھی سب سے یہ شادی ہوئی — اس لیے دل کو ہوئی ہے فکرِ سال

کٹ گیا اُلفت کا سر، آئی بلا
لکھ مبارک عقد شادی بے مثال

(۱۳۲۶ھ)

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ دہلی والوں اور لکھنؤ والوں کی زبانوں کا ۱۳۲۶ھ کا جھگڑا اور تنازعہ کیوں ہوا تھا ہر ایک طبقہ کا اپنی اپنی جگہ پر ایک مقام حاصل ہے۔
منشی مہدی حسن صاحب نے ایک کتاب "واقعات انیس" تالیف فرمائی ہے، اس میں مرزا غالب کے ایک قول سے مرزا انیس کی فوقیت ثابت کی ہے اور لکھنؤ والوں کو دہلی والوں پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ منشی مہدی حسن صاحب یہ بھول گئے کہ مرزا غالب آگرہ کے رہنے والے تھے وہ ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے تھے اور دہلی و لکھنؤ کے لوگوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔
نجم عالم مراد آباد نے منشی مہدی حسن صاحب کی اس حرکت کو پسند نہیں کیا۔ ۸ مارچ ۱۹۰۹ء کے شمارے میں اس کی مخالفت میں ایک اداریہ تحریر کیا۔

"منشی مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی مشہور جوبلی و نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے شاعر و مصنف خونِ ناحق و چندراولی ناٹک وغیرہ وغیرہ نے اپنی ڈرامانویسی و نئے نئے طرز کے راگ اور راگنیوں کے ترتیب کے علاوہ حال میں ایک کتاب موسومہ "واقعاتِ انیس" لکھی ہے۔ اس میں بھی آپ نے ناٹکوں ہی کی اصطلاح و بول چال سے کام لیا ہے۔ اور جس طرح کہ آپ ناٹکوں میں من گھڑت خیالات کو رنگ برنگ کے لباسوں اور طرح طرح کے پردوں میں سچ بنا کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ اسی طرح اس "واقعات انیس" میں بھی آپ نے اپنے دماغی پردوں کو الٹ پلٹ کر ایک نیا کھیل اور نرالا تماشا پبلک کو دکھایا ہے جس میں حضرت غالب پر ایک نہایت بزدلانہ حملہ کیا ہے اور خواہ مخواہ ایک غلط واقعہ لکھ کر لکھنؤ کی زبان والوں پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے اور اس پردہ میں لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان کے مقابلہ میں بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں مرزا غالب، میر انیس کی گفتگو کا ایک واقعہ سراسر غلط لکھا ہے۔
بات یہ تھی کہ جب مرزا غالب لکھنؤ گئے تو آپ سے سید محمد صاحب شیعی مجتہد نے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی تھی جس پر مرزا غالب نے عذر کیا کہ میں مرثیہ گو نہیں

ہوں مگر امتثالِ امر سے مجبور ہو کر انہوں نے دو تین بند کہہ کر تجمّل صاحب کو بھجوا دیئے تھے اب احسنؔ صاحب اس امر پر اڑے ہوئے ہیں کہ میر انیسؔ کی خدمت میں مرزا غالبؔ نے یہ مرثیہ کے بند کہہ کر روانہ کیے اور اپنے عجز کا اعتراف کیا جس سے شاید احسنؔ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ غالبؔ دہلوی پر انیسؔ لکھنوی کو ترجیح ہو اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی صاف طور پر ظاہر ہو جائے کہ مرزا نے میر انیس کے سامنے اظہارِ عجز کیا۔ سبحان اللہ۔ آپ کی یہ عجوبہ کتاب جس طرح کہ بجائے خود ایک بے ترتیب املا و انشاء کی اغلاط سے پُر ہے۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی اپنے پہلو میں بہت سے جھوٹے خیالات کو لیے ہوئے اس کی اردو عبارت میں بھی بہت سے بے معنی انگریزی الفاظ نظر آتے ہیں اور اس برتے پر آپ کو لکھنؤ کی زبان اور اپنی زبان دانی کا دعویٰ ہے۔ اس کتاب میں آپ نے میر زا انیس کے کلام پر تنقید بھی فرمائی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ آپ کے ذہنِ مبارک میں شاید تنقید کے معنے کھرا کھوٹا پرکھنے کے نہیں بلکہ مدح سرائی اور خواہ مخواہ کی تعریف کے ہیں۔ جبرا ناپ شناپ تعریفوں کے پُل باندھ دیئے ہیں۔ ہرچند کہ بعض اشعار معنی و مطلب رکھتے ہیں۔ مگر احسنؔ صاحب مجذوب کی بڑ کی طرح کچھ کا کچھ لکھ گئے ہیں گویا آپ نے اس کتاب کو بھی ناٹکوں کے مسخروں کی گفتگو کی طرح سے مرتب کر دیا ہے چنانچہ اس کی اصلاح کی طرف جناب نواب مرزا سعید الدین احمد خان صاحب طالبؔ رئیس لوہارو و مرزا حیرتؔ صاحب نے توجہ فرمائی ہے۔ صاحب موصوف الصدر نے تو احسنؔ صاحب کو چند خطوط لکھے مگر احسنؔ صاحب اپنا ہی بے سُرا راگ گاتے رہے اور یادگارِ غالبؔ مصنفہ حالیؔ صاحب کے لفظ غالباً کو یقیناً سے بدلنے پر اڑے رہے مگر مرزا حیرتؔ صاحب نے ان کی تنقید کے ٹکڑے اڑانا شروع کر دیئے ہیں۔ اور احسنؔ صاحب کی فاش غلطیوں کو عام طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ طالبؔ صاحب اور حیرتؔ صاحب اس کے متعلق اپنے اپنے خیالات ایک کتابی صورت میں جلد شائع کرا دیں جو ہمیشہ یادگار رہیں اور احسنؔ صاحب کے لیے بھی آشارہ کو وہ سبق ہو سکے کہ وہ بیچارے اپنے ناٹکوں اور ناچ گانے کی کتابوں کی تصنیف کے سوا دوسری طرف اپنا رُخ نہ پھیر

سکیں کیونکہ ان کی ابتدائی عمر کی طرح بقیہ زندگی بھی اسی کام کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے اور اسی میں وہ شہرت دعزت اور دولت حاصل کر چکے ہیں اور آئندہ بھی کر سکیں گے کیونکہ

عادت نہ جائے چاہے قیامت ہی کیوں نہ ہو

آپ کی جبلی عادت جا نہیں سکتی اور لٹریری دنیا ایسی تصانیف سے گندہ ہو گئی ہے۔

شمس العلماء حضرت مولانا الطاف حسین پانی پتی نے جو مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد پر یہ الزام پڑھا تو انہوں نے اس کی تردید فرمائی جو ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کے مخبر عالم میں چھپی۔ اس پر مدیر مخبر عالم نے بھی ابتداء میں اپنا نوٹ تحریر کیا ہے۔

"ہم نے گذشتہ مہینے کے آخر پرچہ مخبر عالم مراد آباد میں جو "واقعات انیس" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر احسن لکھنوی کی ہٹ دھرمی کا اظہار کیا تھا اس کے متعلق بطور قول فیصل خود جناب حالی صاحب نے ایک خط بنام نواب مرزا سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی لکھ کر احسن کی اس بات کو جو وہ حالی صاحب کی کتاب سوانح عمری غالب کو پیچھے ہوئے تھے۔ بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دی اور ان کی یہ تصنیف مع بھی دیگر تصانیف اور ناچ گانے کی ہی کتب کے ساتھ بازاری لوگوں اور تماش بینوں کے لیے رہ گئی اور آپ کی "میر انیس کی مرزا غالب پر ترجیح" آپ ہی کے من گھڑت اور لغو خیالات کی طرح خود بخود درد رہو گئے۔ ہم وہ خط بجنسہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

ایڈیٹر۔۔

جناب نواب صاحب مخدوم و مکرم

تسلیم!

کتاب "واقعات انیس" کے بعض مضامین کے متعلق آپ کے اور مصنف واقعات انیس کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے وہ چھپی ہوئی میرے پاس پہونچی ہیں۔ اس بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب کی ملاقات لکھنؤ میں میر انیس سے ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ مرزا صاحب لکھنؤ اس وقت گئے ہیں جب کہ وہ سپریم گورنمنٹ میں اپنی پنشن کی بابت استغاثہ کرنے کیلئے کلکتہ گئے تھے، اور اثنا راہ میں چند روز لکھنؤ میں ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ جیسا کہ

مرزا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے نصیر الدین حیدر کا تھا۔ چنانچہ وہ خط موسومہ منشی
حبیب اللہ خاں ذکا میں جو اردوئے معلی مطبوعہ ۱۸۹۹ء کے صفحات ۲۷، ۲۹ میں درج
ہے۔ اپنا کلکتہ جانا ۱۸۳۰ء میں لکھتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر جیسا کہ تاریخ اردو میں
مذکور ہے ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا اس سے ظاہر ہے
کہ ۱۸۳۰ء میں عہد نصیر الدین کا آغاز تھا۔ اس وقت تک میر انیس نہ لکھنؤ سے فیض آباد
آئے تھے اور نہ لکھنؤ میں ان کی کچھ شہرت تھی۔ نصیر الدین حیدر دس برس تخت نشین
رہے۔ اور ان کے بعد ۵ برس کے قریب امجد علیشاہ تخت نشین رہے۔ ان دونوں
کے عہد میں میر انیس صاحب جیسا کہ "واقعات انیس" سے ظاہر ہے۔ فیض آباد میں رہے
اور امجد علی شاہ کے زمانہ میں فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں ان کے خاندان نے سکونت
اختیار کی۔ چنانچہ "واقعات انیس" کے صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے زمانۂ
سلطنت تک میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ مرزا رجب علی بیگ
کے فسانہ عجائب کی ابتداء زمانہ غازی الدین حیدر میں ہوئی۔ اور عہد نصیر الدین حیدر
میں وہ تمام ہوا۔ سرور نے اس کتاب میں لکھنؤ اور صاحب کمالات لکھنؤ کا ذکر کیا
ہے۔ اس وقت کی انشاء پردازی کے موافق علماء و فضلا سے لے کر ادنیٰ طبع کے لوگوں
تک کے نام ہیں۔ اس فہرست میں میر انیس کا نام نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد اسی
صفحہ پر لکھا ہے کہ "لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے بھی دریافت ہوا کہ زمانہ امجد
علی شاہ میں انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا ہے۔" جو فہرست مشاہیر لکھنؤ کی فسانہ
عجائب سے مصنف نے نقل کی ہے اس میں مرزا دبیر کا نام تو پایا جاتا ہے۔ لیکن
میر انیس کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ ۲۷ صفحہ پر یہ لکھا ہے کہ میر انیس مرحوم خود
فرماتے تھے کہ "جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ دو صاحب لکھنؤ میں
اس فن کے نامی گرامی تھے ایک میر بدالی صاحب اور دوسرے مرزا سلامت
علی دبیر" اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں مرزا دبیر سے
بہت پیچھے ہوئی۔ مگر مرزا دبیر سے بھی مرزا غالب کا ملنا کسی تحریر یا کسی زبانی روایت
سے ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ شیخ امام بخش ناسخ اور میر ضمیر سے ان کا ملنا بخوبی ثابت
ہے سو اس سے کسی کو انکار نہیں اگر ان یقینی شہادتوں سے قطع نظر کی جائے۔ تو

مصنف ”واقعات انیس“ کی طرز تحریر ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مکالمہ میر صاحب اور مرزا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ دونوں صاحبوں کی شان سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے مرزا صاحب جو گویا کہ اہل لکھنو کے مہمان تھے ان سے میر انیس کا پہلی ملاقات میں یہ کہنا کہ غزل ایک مبتذل صفت کلام ہے اور ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کرنا اور گویا در پردہ یہ کہنا کہ اس میدان میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو۔ کس قدر خلاف انسانیت، خلاف تہذیب و اخلاق باتیں ہیں۔ جن کو کوئی مرد آدمی باور نہیں کر سکتا۔

راقم خاکسار
الطاف حسین حالی از پانی پت

داغ دہلوی کے انتقال کے بعد بڑا سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ ان کے شاگردوں میں کون جانشین ہوگا جن میں محمد حیات بخش صاحب رسا کا نام بھی لیا گیا تھا۔ مخبر عالم کے ایڈیٹر قاضی سید عبد العلی بدر صاحب بھی داغ کے شاگردوں میں تھے۔ یہ بھی اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے گرچہ جانشینی کا دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن جن لوگوں نے جانشین داغ ہونے کا دعویٰ کیا تھا یعنی رسا صاحب نے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی کہ رسا صاحب اس انداز سے شعر نہیں کہتے تھے جیسا ان کے استاد داغ کا طرز تھا یہی اعتراض رسا صاحب کے کلام پر ۲۴ جون ۱۹۰۵ء کے مخبر عالم کے شمارے میں کیا گیا۔ یہ اعتراض داغ کے ایک شاگرد م، ش صاحب نے اپنے خط میں کیا تھا جو مخبر عالم کے ایڈیٹر کے نام تھا۔

”جناب ایڈیٹر صاحب مخبر عالم مراد آباد۔ تسلیم!
اخبار نظام الملک مطبوعہ ۳۰ جون ۱۹۰۵ء میں محمد حیات بخش صاحب رسا کی جانشینی داغ کے متعلق اہل ملک سے رائے طلب کی گئی تھی جس کے جواب میں چار دانگ ہندوستان سے یہ آواز بلند ہو گئی تھی کہ

ہم صدا بلبلوں کا زاغ نہیں
کہ رسا جانشینِ داغ نہیں

داغ جیسا زبان دان شاعر کا جانشین بھی ایسا ہی زبان دان ہونا چاہیے۔ ؎

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

رسا صاحب کا کلام خود قابل اصلاح ہے اور وہ نہ تو متروکات دلّی کے پابند ہیں۔ نہ زبان دہلی سے واقف، بلکہ ان کا کوئی مصرع دہلی کے رنگ میں ہوتا ہے تو کوئی لکھنوی ڈھنگ پر اور نہ وہ میرؔ کے مقلد ہیں اور نہ مرزاؔ کے۔ بلکہ ان کا کلام ایک بے میل اور کھچڑی ہے۔ ہاں سچ یہ ہے کہ ان کی طبیعت ہر رنگ کی طرف چلتی ہے۔ چنانچہ اب مضطرؔ صاحب کی چند ے یکجائی رام پور کی وجہ سے اس رنگ کی طرف بھی آپ چل دیئے ہیں۔ مگر جس طرح کہ آپ کا خزانہ دماغ سرمایۂ شاعری سے تہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح خیریت سے آپ کا غنچۂ کلام بوئے علمی سے بھی خالی ہے کوئی بھی صاحب فہم ہرگز رسا صاحب کے کلام کو مثل کلام داغؔ نہیں سمجھ سکتا چنانچہ رسا صاحب کی تمام مشہور غزلیات پر چاروں طرف سے اعتراض کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی جس کا جواب رسا صاحب سے آج تک نہ بن پڑا۔ افسوس ہے کہ حضرت داغؔ نے جو تمام عیوب زبان اُردو دور کر کے ایک خاص اور محدود راستہ قائم کر دیا ہے۔ رسا اس کو خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں اور شاگردانِ داغؔ کو پھر پچاس برس پہلے کی طرف بے قید مرشد کا دیکھنے والا بنا کر ہر راستہ پر چلنے کا اشارہ کر رہے ہیں چنانچہ میری ناقص رائے کا ثبوت خود ان کی وہ غزل دے رہی ہے۔ جو وفادار پنجاب اور نظام الملک مراد آباد اور نیر اعظم مراد آباد میں بطور نمونہ چھپ چکی ہے اور اس نچہ غزل کو خاص کر داغؔ کے مقبول عام کلام کے مقابل بنایا گیا تھا۔ لہٰذا میں بحیثیت شاگردِ داغؔ اس غزل کو اصلاح کر کے حضرات ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور ہمیشہ اس قسم کی برادرانہ خدمت کو موجود رہونگا تاکہ منجملہ دیگر حضرات کے اعتراضات شروع کر دوں۔ سخن فہم حضرات خود سمجھ لیں گے۔ کہ رسا کی مختلف رنگ ڈھنگ والی غزل کو میں نے داغؔ کی طرح سے اصلاح دیکر اُستاد کے تیار کردہ سانچہ میں ڈھالا ہے اور ان کے رنگ میں کھینچ لیا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ اصلاح ہے اعتراض نہیں۔ بھائی کے کلام پر کوئی بھائی اعتراض نہیں کر سکتا اور نہ کرنا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ مجھے یہ منظور ہوتا تو پھر نسخہ نہ لگا رہتا گر پھر بھی جملہ خرابیاں اور اصلاحی خوبیاں سب پر روشن ہو جائیں گی۔ منشی رساؔ فرماتے ہیں ؎

رسا   وہ مجرم ہوں گے اور ساری خدائی مدعی ہوگی
قیامت کی گھڑی بھی کیا قیامت کی گھڑی ہوگی

اصلاح   وہ مجرم ہوگا اور ساری خدائی مدعی ہوگی
قیامت میں الٰہی وہ قیامت کی گھڑی ہوگی

خود صاحب فہم حضرات سمجھ لیں گے کہ قیامت میں قیامت ہوتی ہے یا گھڑی میں گھڑی ہے

رسا   نہ پوچھو حالِ محشر تم وہاں ہل چل پڑی ہوگی
خدا گو ایک ہے لیکن خدائی دوسری ہوگی

اصلاح   نہ نالہ حشر پہ سر وعدہ وہاں ہل چل پڑی ہوگی
خدا کا سامنا ہوگا خدائی دوسری ہوگی

رسا   یہی بت ہیں تو کیا کعبہ میں جا کر ہاتھ آئے گا
یہی دل ہے تو کیا ہم سے خدا کی بندگی ہوگی

اصلاح   رہے کعبہ میں بھی جا کر یونہی کافر کے ہم کافر
یہی بت ہیں تو کیا ہم سے خدا کی بندگی ہوگی

رسا   ہمارے منہ سے شکوے بھی دعائیں بن کے نکلیں گے
ہم ایسے ہیں ہماری دشمنی بھی دوستی ہوگی

اصلاح   تم ایسے ہو کہ دل لے کر بنو گے جان کے دشمن
ہم ایسے ہیں ہماری دشمنی بھی دوستی ہوگی

رسا   جو تم آئینہ دیکھو گے تو غش آ جائے گا تم کو
خودی سے دو قدم آگے تمہاری بیخودی ہوگی

اصلاح   کہیں حیراں نہ رہ جاؤ نہ دیکھو آئینہ دیکھو
خودی سو بار غش تم پر تمہاری بیخودی ہوگی

رسا   ہمارا مدعا کس طرح ان کے کان تک پہنچے
زبانِ نامہ بر کیونکر زبانِ مدعی ہوگی

اصلاح سلامت ہیں یہی بے تابیاں دل کی تو سن لینا
کسی سے درد دل کہتی زبان مدعی ہوگی

رسا مئے اطہار وعدہ اور پھر وعدہ بھی زاہد کا
وہ کیا پلوائے گا اوروں کو جس نے خود نہ پی ہوگی

اصلاح شعر پلائے گا وہ کیا اوروں کو جس نے خود نہ پی ہوگی

رسا وہ مرنا بھی اگر چاہیں کسی پہ مر نہیں سکتے!
جناب خضر کی بھی زندگی کچھ زندگی ہوگی

اصلاح جناب خضر یہ کچھ آپ کا جینے میں جینا ہے
حسینوں پر مروگے وہ تمہاری زندگی ہوگی

اب لطف یہ ہے کہ اس برتے پہ تتا پانی حضرت رسا یاوری قسمت سے دربار رام پور تک رسائی پا گئی اور حضور ہز ہائنس نواب صاحب بہادر کی فیاضی کی بدولت پچاس ساٹھ روپے ماہوار پانے لگے۔ اس قدر کی عنایتوں اور مہربانیوں سے آپ مشکور ہو کر عجز و انکسار کا اظہار کرتے نہ کہ ریاستی روٹیوں نے یہ زور مارا کہ آپ جانشین بنتے بنتے اب استاد بھی بن بیٹھے اور چند ابراغیر حج کلیاں شاگرد بنائے ہیں منجملہ ان کے ایک حضور احمد حضور مراد آبادی بھی ہیں۔ جو اپنے آپ کو ابوالمظفر لکھتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کو اہل مراد آباد ابوالشکست بھی نہیں کہتے ہاں یہ ایک خنخنا بے ریشہ لونڈا ضرور ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے استاد رسا صاحب کی استادی کا فخریہ اظہار کر کے ۱۹ر جون کے نیر اعظم میں اپنی ایک غزل درج کرائی ہے۔ تعجب ہے رسا استاد بن گئے اور اپنے اس شاگرد کی غزل کے عیوب دور نہ کر سکے۔ اور جس طرح کہ ان کا کلام خود پر عیوب ہے۔ اسی طرح شاگرد کے کلام کو بھی پر عیب ہی رہا جس سے ناحق شائقین شعر علم شعر کی ریڑھ مارے جانے لگی ہے۔ لہٰذا مناسب سمجھ کر ہم ان کے شاگرد کی پانچ شعر والی غزل کی بھی اصلاح کیے دیتے ہیں تاکہ ان کو اور ان کے استاد کو آئندہ سبق ملے اور رسا صاحب کو بھی خیال رہے کہ کہیں اس شاگرد سازی و استادگری کی بدولت وہ روٹیوں سے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ حضور پرنور نواب صاحب بہادر ایک صاحب علم و بیدار مغز رئیس ہیں۔ انھیں اس ذریعہ سے رسا صاحب کا مبلغ علم و معلومات کھل جائے گا۔ اور جب ایسا ہو تو پھر رسا صرف رسا ہی رہ جائیں گے نہ کہ جانشین داغ

غزل حضور احمد مع اصلاح

حضور — وعدہ کی شب پاس دشمن کے جا کر وہ سو گیا
اس کی قسمت جاگ اٹھی مرا مقدر سو گیا

اصلاح — مرے دھوکے میں وہ گھر دشمن کے جا کر سو گیا
جاگی قسمت غیر کی میرا مقدر سو گیا

حضور — اس طرح پہلو میں مرا دل تڑپ کر رہ گیا
کوئی طفلِ نازنیں گویا مچل کر سو گیا

اصلاح — وہ نہ آئے جب تو پہلو میں تڑپ کر دل مرا
ایک کمسن طفل کی صورت مچل کر سو گیا

حضور — ہاتھ ہی ٹوٹیں لگائے ہاتھ ہم کو جو کوئی
کس ادا سے وہ شبِ وعدہ یہ کہہ کر سو گیا

اصلاح — ہاتھ ہی ٹوٹے لگائے ہاتھ ہم کو جو کوئی
وہ ستم گر وصل کی شب بھی یہ کہہ کر سو گیا

حضور — یا الٰہی میری قسمت پر یہ پتھر پڑ گئے
پاس دشمن کے جو وہ بت بن کے پتھر سو گیا

اصلاح — میری قسمت، وصل کی شب میں بھی پتھر پڑ گئے
میرے پہلو میں جو وہ بت بن کے پتھر سو گیا

حضور — ہم نے انگاروں پہ کاٹی لوٹ کر رات اے حضورؔ
سیج پر پھولوں کے جب وہ غیر کے گھر سو گیا

اصلاح — رات کاٹی ہم نے کانٹوں پر تڑپ کر اے حضورؔ
سیج پر پھولوں کی جب وہ غیر کے گھر سو گیا

آخر میں رسا صاحب کو برادرانہ رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنے تازہ کلام کو ضرور دکھاتے رہیں اور مشورہ باہمی لیتے رہیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے اور میں بطور خود بھی ان کی ہر نئی مشتہرہ غزل پر اپنا خیال ظاہر کرتا رہوں گا اور ان کے ساتھ ہی ان کے شاگردوں کے کلام کو اگر وہ مشتہر کیا گیا، تو

اصلاح دیتا رہوں گا نیز میں دیگر استاد بھائیوں خصوصاً حضرت احسن مارہروی صاحب کو بھی توجہ دلاتا ہوں کہ وہ بھی اپنے نیک خیالات اس اصلاح کے متعلق ظاہر فرمائیں اور خود بھی اسی قسم کی رسا اور ان کے شاگردوں کو مدد دیتے رہیں۔ جیسے کہ مشہور ہے کہ وہ پہلے بھی مدد کرتے تھے۔ راقم ؎

ہم سخن سنج ہیں غالب کے طرفدار نہیں

بقلم م۔ ش

یکے از شاگردان حضرت فصیح الملک بہادر داغ مرحوم

اس مذکورہ خط میں م۔ش صاحب نے حضرت احسن مارہروی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی تھی تو احسن صاحب نے مخبر عالم کو اسی سلسلہ کا ایک خط تحریر فرمایا اور انہوں نے م۔ ش صاحب کے مذکورہ خط کی روش کو پسند نہیں کیا اور شکایت کی کہ استاد بھائی کو استاد بھائی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ احسن مارہروی صاحب کے اس خط کے ساتھ م۔ ش صاحب کا دوسرا خط بھی ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء کے شمارے میں چھپا۔

مارہرہ ضلع ایٹہ دفتر رسالہ فصیح الملک ۹ جولائی ۱۹۰۹ء

مکرم و شفقتم تسلیم!

آپ کے گہربار اخبار میں رسا کے متعلق مضمون دیکھا۔ مجھ سے استفسار فرمایا گیا ہے اس کا مختصراً جواب عرض ہے امید ہے کہ حال کی اشاعت میں شائع فرما کر ممنون کیجیے۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام۔

شعر
اہل زباں کی قدر تو اہل زباں کو ہے
بے سوچے سمجھے ہونے لگے گھر گھر اعتراض

۲۲ جون ۱۹۰۹ء کے اخبار مخبر عالم مراد آباد میں "دو جائے استاد خالیست" کے عنوان سے ایک مراسلت دیکھی جس میں کسی نامعلوم شاگرد داغ نے اپنے بھائی منشی حیات بخش رسا کی ایک غزل پر اعتراض کر کے خود اصلاح دی ہے اور پھر ہم سے ان خیالات کی بابت نیک رائے چاہی ہے افسوس ہے کہ آج کل حاسدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر مسرت ہے کہ رسا ان حاسدوں میں نہیں ہیں بلکہ وہ محسودِ زمانہ بن رہے ہیں ؎

عشرت نہ ہو قلق ہو یہ قسمت کی بات ہے
پھل عاشقی کا داغ نے پایا تو کچھ نہ کچھ

حیرت ہے کہ مضمون نگار صاحب اپنے آپ کو داغ صاحب کا شاگرد بھی بتائے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے ایک استاد بھائی کو برا بھلا بھی کہتے جاتے ہیں کیا گنہ ہے اگر رسا کے چند شاگرد ہو گئے کیا برا ہے۔ اگر رسا اپنی رسائی قسمت سے دربار رام پور تک پہنچ گئے۔ کیا نقصان ہے اگر کچھ لوگ رسا کو جانشین داغ جاننے لگے۔ یہ تو ہم شاگردان داغ کی خوشی کا موقع ہے کہ اتنے بڑے مخالف مجمع میں ایک اپنا خواجہ تاش منتخب کیا گیا ہمیں تو اور زیادہ مسرت ہو اگر مضمون نگار صاحب بھی دربار رام پور کے مقربین میں رسا کی طرح شامل ہو جائیں۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مضمون نگار صاحب کا یہ ارشاد کہ رسا صاحب جانشین بنتے بنتے استاد بھی بن بیٹھے دعویٰ بے دلیل ہے۔ کیا کوئی مضمون کوئی تحریر رسا کی دکھائی جا سکتی ہے کہ انہوں نے دوسرے بھائیوں کی طرح جانشین یا استاد بننے کی خواہش ظاہر کی ہو اور جب ایسا نہیں تو خواہ مخواہ ان کو مدعی جانشینی سمجھنا بے بنیاد بات نہیں ہے تو کیا ہے اب اگر ملک کا کچھ حصہ یا سارا ملک ان کو جانشین داغ مان رہا ہے تو اس میں رسا کا کیا قصور ہے یہ تو کسی بشر کا کام نہیں کہ دنیا تو اس کو عزت کی جگہ دے اور وہ خاک روبوں کا ٹوکرا سر پر اٹھائے پھرے۔ حامد محمود کسی نے اگر رسا کی جانشینی کی بابت لکھا ہے اور اس معاملہ میں زور دیا تو اس میں رسا نے کیا کیا۔ اور اگر کہا جائے کہ رسا ہی کی تحریک سے بعض لوگوں نے ایسا عمل کیا ہے تو یہ خیال بھی غلط ہے اس لیے کہ اگر کسی پہ رسا کا اثر پڑ سکتا ہے تو ان پر جو ان کے دست نگر یا عزیز و اقارب ہوں اور یہاں حالت یہ ہے کہ اگر تحقیق پر کمر باندھی جائے تو عقدہ یہ کھل جائے کہ اراکین ریاست رام پور یا خود ہز ہائینس نواب رام پور کا یہ ارشاد ہے کہ رسا جانشین داغ ہیں۔ اب یا تو مضمون نگار صاحب اپنے ان الفاظ کو واپس لیں کہ حضور پر نور نواب صاحب بہادر ایک صاحب علم اور بیدار مغز رئیس یا رسا کو جانشین داغ مانیں کیونکہ ہز ہائینس کا بیدار مغز اور صاحب علم ماننا ان کو مجبور کرے گا کہ وہ بھی مغز البیہ کے مطیع ہوں۔ ہم رسا کو آج سے نہیں بلکہ پندرہ بیس برس سے جانتے ہیں بلکہ مانتے بھی ہیں کہ وہ ایک سیدھے سادے منکسر المزاج غریب آدمی

ہیں۔ نہ انھیں کبھی اپنی شاعری پر ناز ہوا۔ نہ اپنی معلومات پر فخر، اور نہ اب ہے چونکہ
آج کل وہ محض شاعرانہ حیثیت سے ایک قدردان نامور ریاست میں موجود ہیں
اس لیے ان کے کلام پر اہلِ اخبار کے ذریعے سے پبلک کی نظر پڑتی رہتی ہے
ورنہ انھیں بجز اس بہت بڑی عزت افزائی کے کہ وہ ایک ذی اختیار رئیس کے
مصاحب ہیں اور کوئی معتد بہ مالی فائدہ نہیں۔ وہ اس سلسلہ سے قبل آگرہ،
مین پوری، فرخ آباد، ایٹہ وغیرہ وغیرہ مقامات میں بسلسلۂ ملازمت گورنمنٹ
عدالت ہائے کلکٹری پر رہ چکے ہیں اور اس زمانہ میں کم و بیش سو روپیہ ماہوار سے
ان کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ واقعی رسا کو یکسوئی
اور اس قدر عزت افزائی کے سوا جو اس پرچہ میں بیان کی گئی ہے کوئی ایسی خوشی نصیب
نہیں ہے۔ جو ان کو معمولی بے سامان بنانے سے غرض یہ کہ اب تک ہم رسا کو ویسا ہی رسا
جانتے ہیں جیسے آج سے سالہا سال قبل جانتے تھے ؎

یہ آپ جانتے ہیں زمانہ میں جو ہیں ہرجائیاں
اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ بڑا معاملہ ہے

مضمون نگار صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں ہم سے خطاب فرما کر یہ بیان ظاہر
کیا ہے کہ ہم رسا کے کلام درست کرتے رہیں جیسا کہ افواہاً انھوں نے سنا ہے کہ پہلے بھی
ایسا ہوا کرتا تھا۔ سچ کہا ہے ؎

جس دم رقیب کہنے پہ آتے ہیں جھوٹ سچ
ان کو مری طرف سے لگاتے ہیں جھوٹ سچ

یہ سب افترا پردازی ہے اور جس کسی نے آپ سے کہا غلط کہا ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ اور
کیوں ہونے لگا۔ آپ ابھی اچھی طرح رسا سے واقف نہیں ورنہ کبھی ایسا گمان نہ کرتے ؎

ہو تو اس سے کہ وہ آدمی خراب نہیں

آخر میں اتنا لکھ کر یہ مراسلت ختم کی جاتی ہے کہ اگر حقیقت میں آپ ہمارے خیر خواہ
نکتہ رس بھائی ہیں۔ تو آپ کو اپنے بھائیوں سے ایسا معاملہ نہ رکھنا چاہیے۔ ایک ہی
چشمہ سے پانی پیتے ہیں۔ اگر بشریت سے کوئی سہو و تسامح ہو جائے تو اس کو عالی
ظرفی سے چھپانا چاہیے نہ کہ ایک خوش گو بھائی کو مطعون کیا جائے اس سے کوئی

فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ رسا غریب ابھی کیا ہیں جو استادِ مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے مخالفوں سے کیا کچھ نہیں سنا اور معاندین نے کیا کچھ افترا پردازیاں نہیں کیں مگر واہ رے استاد ے

تری طبیعت اک روشن آفتاب ہے داغ
کبھی چھپائے سے یہ جلوہ گر نہیں چھپتی

یہ مضمون ہم نے آئندہ سلسلہ بڑھانے کے لیے نہیں لکھا ہے اگر ہمارے نابانہ بھائی مضمون نگار صاحب اس سلسلہ کو بڑھائیں گے تو آئندہ خود ہم سے جواب کی امید نہ رکھیں۔ اور ساتھ ہی اس کا لحاظ رکھیں کہ مضمون کے ساتھ اپنا نام نامی ظاہر کریں۔ تاکہ ناواقفوں کو غلط فہمیاں نہ ہونے پائیں۔ یہ بڑی اخلاقی کمزوری ہے اور کھلی ہیں سرمہ سے کر دھوکوں سے کہیں ڈرا جاتا ہے۔

والسلام
خاکسار احسن مارہروی"

"مکرم ایڈیٹر صاحب
مخبر عالم مراد آباد

آداب عرض ہے! آپ کے معزز اخبار مطبوعہ ۸ر جولائی کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ریاست رام پور سے کوئی گم نام رجسٹری شدہ خط میرے مضمون کی تردید میں پہونچا ہے۔ افسوس ہے آپ نے اس کو درج نہ فرمایا ورنہ میں اس کے دندان شکن جواب کے لیے موجود تھا۔ تعجب ہے کہ اس زنانہ طریقہ پر تردید کی گئی اور خاص رام پور سے لکھ کر پردہ پردہ میں خط بھیجا ہے یہ جس کا کام ہے عام طور پر ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ سنا گیا ہے کہ جب سے آپ نے نام کا استفسار فرمایا ہے ہر ایک سے خفیہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ مگر کوئی اس خط کا راقم بننا منظور نہیں کرتا اور باہر کے شناسائوں اور دوستوں کو ایک ڈاک لگ رہی ہے کہ وہ خدا واسطے میرے مضمون کی تردید لکھ کر حضرتِ استادی و جانشینی کی آبرو رکھ لیں۔ لیکن اس وقت بہت افسوس ہوا جب کوئی استاد بھائی زبردستی چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ اور حضرت کے محتاج اصلاح کلام مثل استاد سمجھ لے گا۔ غزل کی اصلاح سے تو حضرتِ ملک پورا پورا لطف اٹھا چکے ہیں۔ اب رسا صاحب نے ہیرا اعظم مراد آباد مطبوعہ ۱۳ر جولائی میں حضور ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رام پور دام اقبالہ کی تہنیت

خطاب پانی پر ایک قطعۂ تاریخ لکھ کر اپنی شاعرانہ اعلیٰ قابلیت کا بالکل ہی اظہار فرما دیا ہے۔ اس قطعہ میں مطلع سے لے کر مقطع تک کسی شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس کو خطاب دیا گیا ہے اور وہ کون صاحب اعزاز شخص ہے اور یہ کس کی مدح ہے۔ کس کی مدح میں یہ قطعہ لکھا گیا ہے۔ البتہ قطعہ مذکور پر حضور پُر نور نواب صاحب بہادر کا نام نامی و اسم گرامی نثر میں ضرور درج ہے۔ رسا صاحب یا ان کے چیلے چانٹے یا ہوا خواہ جواب دیں کہ ایسا کوئی قطعہ تاریخ کسی نے کہیں دیکھا یا سنا ہے کہ جس میں اشارۃً یا کنایتۃً بھی ممدوح کا نام و مقام کا پتہ نہیں واہ ری شاعری تیرا کیا کہنا۔ لہٰذا ہم اس بھاری نقص کے ساتھ اس قطعہ کے شاعرانہ عیوب بھی اصلاح دے کر دور کیے دیتے ہیں۔ امید ہے کہ علم دوست بیدار مغز حضور ہز ہائنس نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ اب اس قطعہ کی آب و تاب ملاحظہ فرما کر خوشنودی مزاج کا ضرور اظہار فرمائیں گے کیونکہ رسا صاحب نے یہ قطعہ درج کرا کر ایک فٹ نوٹ لکھا ہے کہ یہ قطعہ حضور کی خدمت میں پیش ہو کر شرف عزت حاصل کر چکا ہے اس لیے کامل امید ہے کہ اب اچھے اور بُرے اور نقص کلام و خوبی اصلاح کا پورے پورے طور پر اظہار ہو جائے گا۔

قطعۂ تاریخ مع اصلاح

رسا — حضورِ قیصرِ ہندوستاں سے آیا ہے
نیا خطاب ہمارے حضورِ والا کو

اصلاح — خطاب قیصرِ ہندوستاں سے آیا ہے
حضور حامد علی خاں رسا کے آقا کو

رسا — بفضلِ رب وہ ہوئے لفٹنٹ کرنل اب
دیا یہ رتبہ خدا نے ہمارے آقا کو

اصلاح — ہوئے ہیں فوج کے لفٹنٹ کرنل اب کہ دیا
دیا خدا نے یہ رتبہ حضورِ والا کو

رسا رسا یہ نذر کو لایا ہے، ہدیہ تاریخ

خطاب نو یہ مبارک ہو شاہ والا کو

اصلاح رسا بھی نذر یہ تاریخ لیکے آیا ہے

خطاب نو یہ مبارک ہو شاہ والا کو

جن اشعار یا جن مصرعوں میں یا جن الفاظ کو بدلا گیا ہے سخن فہم حضرات عموماً اور استاد بھائی خصوصاً سمجھ لیں گے کہ پہلے کیا کیا خرابیاں واقع تھیں جن کو اس طرح دور کیا گیا ہے۔"

راقم م، ش

شاگرد حضرت داغ مرحوم"

نظام الملک مراد آباد اور نیر اعظم مراد آباد جو مخبر عالم کے مخالف اخبار تھے۔ ان میں رسا صاحب کی حمایت میں مضامین چھپتے تھے۔ جن کی یہ حالت تھی کہ مخبر عالم کی زیادہ مخالفت ہوتی تھی۔ رسا صاحب کی حمایت کا حصہ کم ہوتا تھا۔

اس عرصہ میں م، ش صاحب نے اپنے مخالفوں کے جواب میں اپنا تیسرا خط۔ ۳۰ جولائی ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع کرایا بغور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس شمارے میں پانچ خط ہیں، ان خطوط کے درج ہونے سے پہلے ایک ایڈیٹر صاحب کا نوٹ ہے۔ نوٹ کے ساتھ پانچوں خط نقل کیے جاتے ہیں۔

"حضرت رسا اور م۔ ش صاحب کی شاعرانہ چھیڑ چھاڑ کی بابت اس ہفتہ ہمارے پاس خط پہونچے ہیں۔ تین تردید میں ہیں۔ اور دو تائید میں۔ تردید میں پہلا خط منشی یوسف حسن صاحب تپش مارہروی مشہور شاعر دربار رام پور کا ہے، جو ہم سب سے اوّل درج کرتے ہیں۔ دوسرا خط برق رام پوری کا ہے جس میں ایک عجیب و غریب نظم بھی شامل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ برق صاحب نے اپنا نام ظاہر کیا اور نہ ہم ان سے واقف نہ یہ معلوم کر وہ شاگرد حضرت داغ ہیں کہ نہیں۔ اس حالت میں ہم اس خط کے شائع کرنے سے معذور ہیں۔ تیسرا خط شیخ عنایت حسین صاحب اثر رام پوری تلمیذ حضرت امیر مینائی مدظلہ کا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بحث محض شاگردان داغ تک محدود ہے۔ اس لیے ہم اس خط کو چھاپنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ اگر اس بحث میں عام شعراء کو مود قعہ دیا جائے گا تو ایک بڑی طوالت کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن محض ایک تو اختصار مضمون اور ایک قابل قدر استاد کے شاگرد ہونے کے سبب ہم اس خط کو بھی شائع کیے دیتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائے مشاہیر شعراء آئندہ

کسی غیر شاگرد داغؔ کا کوئی خط شائع نہ کیا جائے گا۔ نہ ہمارے اخبار میں اتنی گنجائش کہ ایسے بے ضرورت مضامین چھاپے جائیں اور سان کی آمد کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ نیز اعظم و نظام الملک دونوں اخبارات میں ایک ہی قسم کے مضامین جو اس ہفتے شائع ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ رساؔ صاحب یا ان کے شناسوں کے ذہن رسا میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم، شش کے پردے میں ہم یہ مضامین لکھ رہے ہیں اور ہمیں رساؔ صاحب کی دربار رامپور کی قدر افزائی پر رشک ہے۔ یہ خیال جس کسی کا بھی ہو محض غلط اور سراسر لغو ہے نہ ہمیں شاعری کا دعویٰ، نہ ہمیں شعر و شاعری کی فرصت، ایک ملکی خدمت گزار اور اخباری مضامین نگار کیا شاعری کر سکتا ہے اور نہ اس کو شاعری جیسی غیر مفید ملک و قوم شے پر فخر ہو سکتا ہے۔ بقول غالبؔ کے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور ہمارا کلام تو خود محتاج اصلاح ہے ہم کیا کسی کو اصلاح دے سکتے ہیں۔ رہا ۲۹۲ صاحب کے خط پر ریمارک وغیرہ کرنے سے ایسا سمجھ لینا یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ ہم نے جب اس مراسلہ کو پڑھا تو اس میں مجنوں، شیطان وغیرہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے جس پر ہم کو ضرور یہ افسوس ہوا۔ کہ یہ بد تہذیب الفاظ علمی بحث و مباحثہ میں استعمال کیے جائیں اور ایک نامعلوم طریقہ پر اس طرح گالیاں دی جائیں۔ اسی وجہ سے ہم اس رائے کے ظاہر کرنے پر مجبور تھے۔ رہا گمنام خطوط کے شائع نہ کرنے سے ہم پر بدگمان ہونا اس سے زیادہ عجیب خیال ہے۔ ہم قانوناً مجبور ہیں کہ بلا نام و اقفیت نام و نشان و ذاتی شناسائی کے کوئی تحریر شائع کریں اور جن تحریروں میں مجنوں و شیطان جیسے لائیبل الفاظ لکھے ہوئے ہوں۔ ہم کیسے بلا نام و نشان لکھ کر خود ذمہ دار بن جاتے اور اگر دوسرا فریق عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو کیا ہم وہ مصیبت اپنے سر لیتے۔ چنانچہ نظام الملک نے جو گمنام خط ہماری نسبت چھاپ کر الفاظ انا الحیثیت عرفی کا استعمال کیا ہے جس پر لائیبل کیس قائم ہو سکتا ہے اب دیکھیے وہ کیا قانوناً جواب دیتا ہے۔ اس لیے ہم اس مضمون کا کچھ جواب نہ دیں گے اور خود ان سے باضابطہ جواب مانگیں گے چونکہ قریباً دو ڈھائی مہینے سے ہم تپ و لرزہ میں مبتلا ہیں اور معمولی مضامین کا ترتیب دینا ہی سخت دشوار ہے۔ ایسی حالت میں ہم پر ایسا گمان کرنا سخت افسوس

کا باعث ہے۔ اور اگر ان کا یہ خواہ مخواہ کا خیال اب بھی دور نہ ہو تو ہمیں اس کی بھی کچھ پرواہ نہیں۔ ایڈیٹر"

"جناب ایڈیٹر صاحب اخبار مخبر عالم مراد آباد، زاد عنایتہ!

تسلیم!

میں بھی بحیثیت شاگردی داغ حضرت م۔ ش کی تحریرات کی بابت کچھ خامہ فرسائی کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنے اخبار میں اس کو چھاپ دیں گے۔"

م۔ ش کی غلطیاں

میں نے اخبار مخبر عالم مورخہ ۲۸ جون و ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء دیکھا جو کچھ م۔ ش کے نام سے چھپا ہے اس کی بابت میں حضرت احسن کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ رسا ایک لائق شاگرد استاد داغ کے ہیں۔ اور ان پر کسی استاد بھائی یا دوسرے شخص کو حسد کرنے سے سوائے حسرت و مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جس کو خدائے کریم عروج دے اس کو کوئی شخص کسی جگہ پر سے مناسب یا نامناسب سے مٹا نہیں سکتا۔ اب رہا ان کے کلام پر اصلاح دینا واضح رہے کہ رسا کو بہت التفات کے ساتھ استاد داغ نے سالہا سال اصلاح دی ہے اور رسا نے بڑے بڑے معرکۂ سخن دیکھے ہیں۔ خلوق ان کے کلام کو پسند کرتی ہے اگر ایک دو آدمی کسی وجہ سے بُرا کہتے ہیں تو یہ ہوتی آئی ہے۔ ع

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

داغ مرحوم نے تمام عمر خود محسود بن کر حاسدوں کے بے جا اعتراض سنے مگر خدا نے ان کو استاد جہاں بنایا اور کوئی کچھ نہ کر سکا۔ م۔ ش نے جو اصلاح دی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ حضور پُر نور کے اسم گرامی میں عین تقطیع سے گرانا یا لفظ صد ابارک باد کی ترکیب کا غلط ہونا وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ اس کے بہت سی لغزشیں موجود ہیں۔ پس ایسے ناواقف شخص کی تحریر پر جو ایک مجذوب کی بڑ ہے "تنقید کرنا لاحاصل ہے۔ مختصراً جو میری رائے تھی لکھ دی۔

والسلام، طپش ماہروی
شاگرد، حضرت فصیح الملک"

"جناب ایڈیٹر صاحب
مخبر عالم مراد آباد۔

تسلیم! مزاج شریف

میں نے آج اخبار مخبر عالم مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء دیکھا جس میں من جانب

م، ش صاحب کی اصلاح رسا کے قطعہ تاریخ پر دیکھی۔ مجھ کو رسا صاحب سے کچھ غرض یا واسطہ نہیں ہے اور نہ م، ش صاحب سے واقف ہوں کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ اصلاح میں مجھ کو اکثر غلطیاں نظر آئیں۔ مگر میں چند غلطیاں محض شاعرانہ خیال سے ظاہر کرتا ہوں۔ م، ش صاحب کے شعر اوّل کے دوسرے مصرعہ میں حضور پُرنور کے نام نامی سے ایک حروف بروئے تقطیع گرتا ہے خواہ دال یا میم اور یہ غلطی ایسی ہے کہ کسی طرح رفع نہیں ہو سکتی۔ یعنی اس بحر میں حضور پُرنور کا نام نامی و اسمِ گرامی کسی صورت سے نہیں آسکتا اور تیسرے شعر کی اصلاح میں دوسرے مصرعہ میں جناب م، ش صاحب "ہر ایک رعایا کو" فرماتے ہیں۔ یہ لفظ محض غلط ہے۔ رعایا رعیت کی جمع ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ م، ش صاحب نے کتنی قسموں کی رعایا مقرر کی ہیں۔ حضرت م، ش صاحب کا یہ مصرعہ از حد مزہ دے رہا ہے۔ ؎

ہے کوچہ کوچہ میں گھر گھر صدا مبارک باد

اگر صدائے مبارکباد ہوتا تو بجا تھا۔ کہ خالی صدا مبارک باد فقط صدا مبارک باد صاف پتہ دے رہا ہے کہ حضرت م، ش صاحب شاعری سے محض بے بہرہ ہیں۔ ان کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہے اور بھی اکثر غلطیاں ہیں۔ بالفعل اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

شیخ عنایت حسین اختر

"تلمیذ جناب محمد احمد صاحب امیر مینائی"

نوٹ:۔ ان تردیدی مضامین کے لفافے ایک ہی قسم کے اور ایک سیاہی اور ایک ہی قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور بجز رام پور کے اور کہیں کے شاگردانِ داغ کے تردیدی خطوط اب تک نہیں آئے۔ ایڈیٹر

رسا اور رسا کے ہوا خواہوں سے ہمارا پیغام

"رسا صاحب اور ان کے ہوا خواہ حضرات ہماری اصلاحوں سے بے طرح بگڑ گئے ہیں۔ اور جو دل میں آیا اناپ شناپ زبان و قلم سے کہنے اور لکھنے لگے۔ نظام الملک اور نیر اعظم دونوں اخبارات میں ایک ہی قسم کے مضامین کی جگالی کی جا رہی ہے۔ لیکن ان مضامین میں بجز

خرافات اور بیہودہ سرائی کے اور کچھ نہیں۔ کوئی بات ہم سے جواب طلب نہیں، کوئی ہماری اصلاحوں کی تردید نہیں۔ مطلب ان سارے طوماروں کا یہ ہے کہ "ہم نے رسا صاحب کے کلام پر اصلاحیں دے کر شائع کیوں کر دیں۔ انھیں پبلک سے بچا کر اور ان کو خود جا کر یا بذریعہ لفافہ سر بند دیتے" اس وجہ سے کبھی ہم پر اور کبھی ایڈیٹر صاحب مخبر عالم پر چوٹیں ہوتی ہیں اور ہمدہا صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔ گالیوں کا جواب تو گالیاں ہیں مگر یہ اہل علم کا شعار نہیں۔ یہ کام ایسے جاہلوں کندہ ناتراشوں کا ہے جو ایک دیہات کے اس گوشہ میں پیدا ہوئے ہوں جہاں سے تعلیم یافتہ اور شریف الخیال لوگ دو دو چار چار کوس دور رہتے ہوں۔ اور وہ اس کوردہ میں اسی ذلیل صحبت میں پرورش پا کر تھوڑی بہت کسی دیہاتی کسی میاں جی سے اردو کی شد بد حاصل کرے اور دس پندرہ کا کسی سفارش سے نوکر ہو کر کسی دفتر میں کاغذ پیٹنے لگے اور وہاں کسی اچھی سوسائٹی میں رہ کر اپنی گزشتہ غلیظ زندگی کو بھولنا چاہے اور دیہاتی بول چال کو ٹکسالی بنانا چاہے مگر مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ برس نلکی میں کسی نے رکھی تھی مگر جب وہ نکلی تو ٹیڑھی ہی نکلی۔ پھر بھلا وہ سوسائٹی ایسے لوگوں کی آفرینش کیونکر بدل سکتی ہے اور ان کی گالیاں کیوں بند ہو سکتی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم نہ دیہاتی نہ ایسے ذلیل صحبت پرورش یافتہ بلکہ زمانہ حال کی تعلیم نے ہم پر اپنی روشنی ڈالی ہے اور بفضلہ اہل زبان کی آغوش میں اور شریف الخیال صحبت میں پرورش پائے ہیں اور خدا نے ہمیں اپنی عنایت سے یہ قدرت عطا فرمائی ہے

نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

ہم جس کو جواب دیں گے وہ معقولیت کا جواب ہوگا اور سمجھ دار لوگ خود سچے اور جھوٹے کا امتیاز کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک اس گوشۂ ہندوستان سے لے کر اس گوشہ تک کسی بھائی نے ہماری اصلاحوں کو بیجا نہیں بتایا اور کوئی استاد بھائی لب نہ کھول سکا۔

چونکہ رسا صاحب نے رام پور میں دو چار غیر معمولی لوگوں کا جرگہ بنا لیا ہے۔ دریں سے اناپ شناپ نیز اعظم و نظام الملک وغیرہ میں مضامین آ رہے ہیں جن کا سر ہے نہ پیر۔ اب تک صرف احسن صاحب نے اپنی رائے آزادانہ چھپوائی ہے۔ اور اس میں بھی ہماری اصلاحوں کی بابت کوئی خیال ظاہر نہیں کیا صرف ایک مصلح کلی کے طور پر ہمیں کچھ نصیحتیں

کی ہیں جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں اور جواب میں یہ عرض کرتے ہیں کہ ہمیں خدانخواستہ رسا
صاحب سے کچھ دشمنی نہیں ہے۔ صرف ان کا در پردہ جانشین داغ کی کوشش کرنا اور
خواہ مخواہ استاد بننا ان کے ایسے کلام پر یوں برا معلوم ہوا کہ کہیں استاد کے نام کو داغ نہ
لگے۔ اور اگر ہماری اصلاحیں بیجا ہیں تو برائے مہربانی رسا اور ہوا خواہان رسا کم از کم جناب
شرر صاحب بہادر کو ہی حکم بنا دیں۔ وہ اہل علم و فضل اور خاندانی شعراء کے قابل قدر
سخندان ہیں۔ ہم انہی کے قولِ فیصل کو تسلیم کر لیں گے۔ گو ہم جانتے ہیں کہ موصوف صاحب بہادر
ہمیشہ اپنے متوسلین کی امداد اور اعانت فرمایا کرتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ حکمران
خاندان کے ایک باعلم یادگار ہیں۔ کبھی خلافِ انصاف فیصلہ نہیں دیتے گو ہم حضوری سے
دور ہیں اور وہ حضور کے حاضر باش ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ ہماری
ڈگری ہوگی کیونکہ ہم نے کہ بظاہر اعتراضات نہیں کیے ہیں بلکہ کلام رسا سے مکروہ الفاظ اور
کمزور خیالات دور کر دیئے ہیں۔ اور اچھے الفاظ اور عمدہ خیالات دے دیئے ہیں قطعہ
میں جو آج تک بلا نام نہیں ہوتا نام ڈال دیا ہے۔ بلا موقع و محل جو وہ لکھ گئے تھے وہ ٹھیک
کر دیا گیا ہے۔ بس اسی بات پر فیصلہ ہے کہ وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟۔ ایرا غیرا، پنچ کلیان!
گمنام ۲۹۲ اور ارق برق، اسم فرضی شعراء کو کوئی نہ پوچھے گا۔ استاد بھائی ہر جگہ کے خاموش
و ساکت ہیں کسی نے لب نہ کھولا۔ اس لیے ہم اپنی جانب سے حضور شرر مدظلہ، العالی کو
حکم بناتے ہیں اور انہی کا محاکمہ قبول اور منظور کر لیں گے اور مجبوراً رسا کو بھی ماننا پڑے گا۔
ورنہ ہم تو ہر طرح ان کے کلام کی اصلاح کو ہمیشہ موجود ہیں۔ رہا اس موقع پر اخبار نظام الملک
کا رسا کی تعریف میں نامعلوم نامہ نگاروں کا مضمون چھاپنا اب کیا وقعت رکھتا ہے۔
جب وہ خود کسی زمانہ میں چھاپ چکا ہے کہ رسا کل تک یہ دریافت کرتے پھرتے تھے کہ یہ
مصرعہ بحر میں بھی ہے یا نہیں۔ اللہ کی شان آج وہ جانشینِ داغ بنیں وغیرہ وغیرہ۔ اب ایسے
اخبار اور ایسی تعریف کا کیا جواب۔

راقم
م۔ ش۔ ہ

یہ قضیہ آگے نہیں چلا۔ ماہ اگست کے مخبر عالم کے شمارے میں دو بہت ہی مختصر مراسلے ایک م، ش صاحب
اور دوسرے شیدا صاحب شاگرد حضرت فصیح الملک مرحوم شائع ہوتے بعد میں یہ سلسلہ بند ہو گیا اور کوئی

خط کسی کا بھی مخزنِ عالم کے کسی شمارے میں شائع نہیں ہوا۔ بلکہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۹ء کے مخزنِ عالم کے شمارے میں حضرت رسا شاعر و وکیل دربار ریاست کی یہ غزل شائع ہوئی۔ معلوم دیتا ہے داغ کے استاد بھائیوں میں صلح و صفائی ہو گئی

یارب جو تو بھی ان کا طرفدار ہو گیا
ہم اور کس کو داورِ محشر بنائیں گے!

ہے دم میں دم تو راہ پہ لائیں گے ہم تجھے
زندہ رہے تو دل میں ترے گھر بنائیں گے

چاہیں گے ہم جسے اُسے چاہیں گے سینکڑوں
دل دیں گے ہم جسے اسے دلبر بنائینگے

ہم اور ان سے شکوۂ بیداد اے رسا
اتنی سی بات کہہ کے مکدر بنائیں گے

م، ش صاحب خاموش نہیں بیٹھے۔ حضرت شاداں لکھنوی کے کلام پر اصلاح فرمادی جو ۱۳ دسمبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولوی محمد نقی صاحب شاداں لکھنوی کو علمی معاملات سے خاص ذوق ہے اس لیے اپنے ایک نامہ نگار کا مضمون درج کرتے ہیں۔ چونکہ اشعار نمبر ۴، ۱۰، ۱۱، ۱۲ کی ایڈیٹر گلدستہ نیرنگ نے خاص طور پر تعریف و توصیف کی ہے اس لیے ہم بھی اپنی رائے کے لیے مجبور ہیں۔ اور صاف کہتے ہیں کہ انہی اشعار کی ترمیم قابل داد ہے جس نے دراصل ان سادہ شعروں میں ایک رنگ بھر دیا ہے اور شعروں کو شعر بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ شاداں صاحب بھی ان کو دیکھ کر شاد ہوں گے۔"

ایڈیٹر

"نیرنگ مطبوعہ ماہ نومبر میں جناب مولانا سید محمد نقی صاحب شاداں لکھنوی مدرس مدرسہ عالیہ رام پور کی ایک غزل میری نظر سے گزری۔ ہر چند کہ ملاگری اور شاعری میں کوسوں کا فرق ہے۔ شاداں صاحب نے عجب رنگ ڈھنگ کی غزل فرمائی ہے جس کو پڑھتے وقت بے ساختہ میری زبان سے ہر شعر پر کچھ نہ کچھ رد و بدل کے ساتھ مصرعے نکل گئے جن کو اصلاح تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ مولانا شاداں ایک لکھنوی شاعر ہیں اور میں مقلدِ زبانِ دہلی لیکن "جیسے تیری چادل دیسے میرے گیت" اسی رنگ ڈھنگ

اسی بول چال میں یہ اشعار مرتب ہوئے ہیں تاہم میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت شادماں صاحب
کے مستند اصل اشعار بامزہ ہیں یا میرے مصرعے چسپاں ہو کر وہ اشعار قابلِ پسند ہو گئے
چونکہ حضرت شادماں خود ایک انصاف پسند ذی لیاقت شاعر ہیں۔ لہٰذا میں براہِ راست
انھیں سے دریافت کرتا ہوں کہ حضرت شادماں خود ذیل میں اپنے اشعار اور ان کی
ترمیم و تنسیخ ملاحظہ فرما کر بتائیں کہ یہ میری کوشش قابلِ داد ہے یا نہیں ہے۔ اور اس
ترمیم سے کچھ لطفِ سخن بھی بڑھ گیا یا نہیں ؟ اور خیالات بھی وسیع ہو گئے یا نہیں ؟
خدا کرے کہیں سید یوسف مسیح صاحب کی نظر میری اس مفید کوشش پر نہ پڑ جائے
کیونکہ ان کو تنقید کا مرض ہے کہیں شادماں صاحب کی غزل اور مصرعوں کی الٹی ریڑھ
نہ ماری جائے اور اس باہمی لطفِ سخن کو کہیں اعتراضات و اصلاح قرار نہ دیدیں ؎

شادماں — یہی رہ رہ کے دل میں آتا ہے
مجھ کو آخر وہ کیوں ستاتا ہے

ہم — کچھ سمجھ میں نہیں یہ آتا ہے
مجھ کو آخر وہ کیوں ستاتا ہے

دیگر — یہی رہ رہ کے دل میں آتا ہے
یہ تو پوچھو وہ کیوں ستاتا ہے

شادماں — اتفاقاً وہ آ گیا ورنہ
کون آتا ہے کون جاتا ہے

ہم — اتفاقاً تم آ گئے ورنہ
کون آتا ہے کون جاتا ہے

دیگر — تم شبِ ہجر آ گئے ورنہ
کون آتا ہے کون جاتا ہے

شادماں — پہلے آتا تھا رحم بھی مجھ پر
اب تو رہ رہ کے غصہ آتا ہے

ہم — جس پہ آتا تھا پہلے رحم تمہیں
اب اسی پر تو غصہ آتا ہے

شادان — اس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
جب کسی کو کوئی ستاتا ہے

ہم — تیرا حسرت سے منہ میں تکتا ہوں
جب کسی کو کوئی ستاتا ہے

شادان — رکھی ہے اس امید پہ میت
اب وہ آتا ہے اب جلاتا ہے

ہم — مرنے والے مریں وہ رشکِ مسیح
دم میں آتا ہے اور جلاتا ہے

شادان — کب رگڑتا ہے ایڑیاں بیمار
نقشِ ہستی کو وہ مٹاتا ہے

ہم — یوں رگڑتا ہے ایڑیاں بیمار
نقشِ ہستی کو یہ مٹاتا ہے

شادان — حالِ دنیا تو مختصر یہ ہے
ایک آتا ہے ایک جاتا ہے

ہم — اک گھر ہے نمونۂ دنیا
ایک آتا ہے ایک جاتا ہے

شادان — جو مجھے دیکھتا ہے کہتا ہے
یوں کسی کو کوئی ستاتا ہے

ہم — میں ہی کیا ایک سب یہ کہتے ہیں
یوں کسی کو کوئی ستاتا ہے

شادان — اپنا قصہ انھیں سناتا ہوں
اب کوئی دم میں غصہ آتا ہے

ہم — حالِ دل میں انھیں سناتا ہوں
اب کوئی دم میں غصہ آتا ہے

شاداں — کس طرح ہو علاج زخموں کا
اب تو دیکھے سے ہول آتا ہے

ہم — چارہ گر کیا علاجِ زخم کرے
اس کے دیکھے سے ہول آتا ہے

شاداں — ہو رہی ہے مجھے کچھ اُلجھن سی
دل کسی کا کوئی دُکھاتا ہے

ہم — دل کسی کا کوئی دُکھاتا ہے
میرا منہ کو کلیجہ آتا ہے

دیگر — یوں مجھے ہو رہی ہے اُلجھن سی
ان کی زلفیں کوئی بناتا ہے

شاداں — اسی دھڑکے میں کٹ گئی شبِ وصل
اب وہ جاتا ہے اب وہ جاتا ہے

ہم — اسی دھڑکے میں کٹ گئی شبِ وصل
اب ہوئی صبح اب وہ جاتا ہے

شاداں — میں بھی جاتا ہوں طور کی جانب
دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے

ہم — اب تو ہم بت کدے کو جاتے ہیں
دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے

شاداں — لو لگائے خدا سے بیٹھا ہوں
دیکھیے کب مجھے بلاتا ہے

ہم — لو لگائے خدا سے بیٹھا ہوں
کب وہ کافر مجھے بلاتا ہے

شاداں — نظم کرتا ہے سب دلی جذبات
شاداں جب غزل سناتا ہے

ہم اس میں ہوتے ہیں سب دلی جذبات
شادماں جو غزل سناتا ہے

حضرت انصاف سے اس محنت کی داد دیجئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کے اشعار میں جو ضرور تیں تھیں۔ وہ پوری ہو گئیں یا نہیں اور جو اشعار بجز خالی لفافہ کے اور کچھ نہ تھے۔ ان میں مضامین کی چاشنی آگئی یا نہیں؟ اور جو الفاظ دور ہوئے وہ قابلِ دوری تھے یا نہیں۔ زیادہ والسلام

راقم
بندہ
م۔ ش
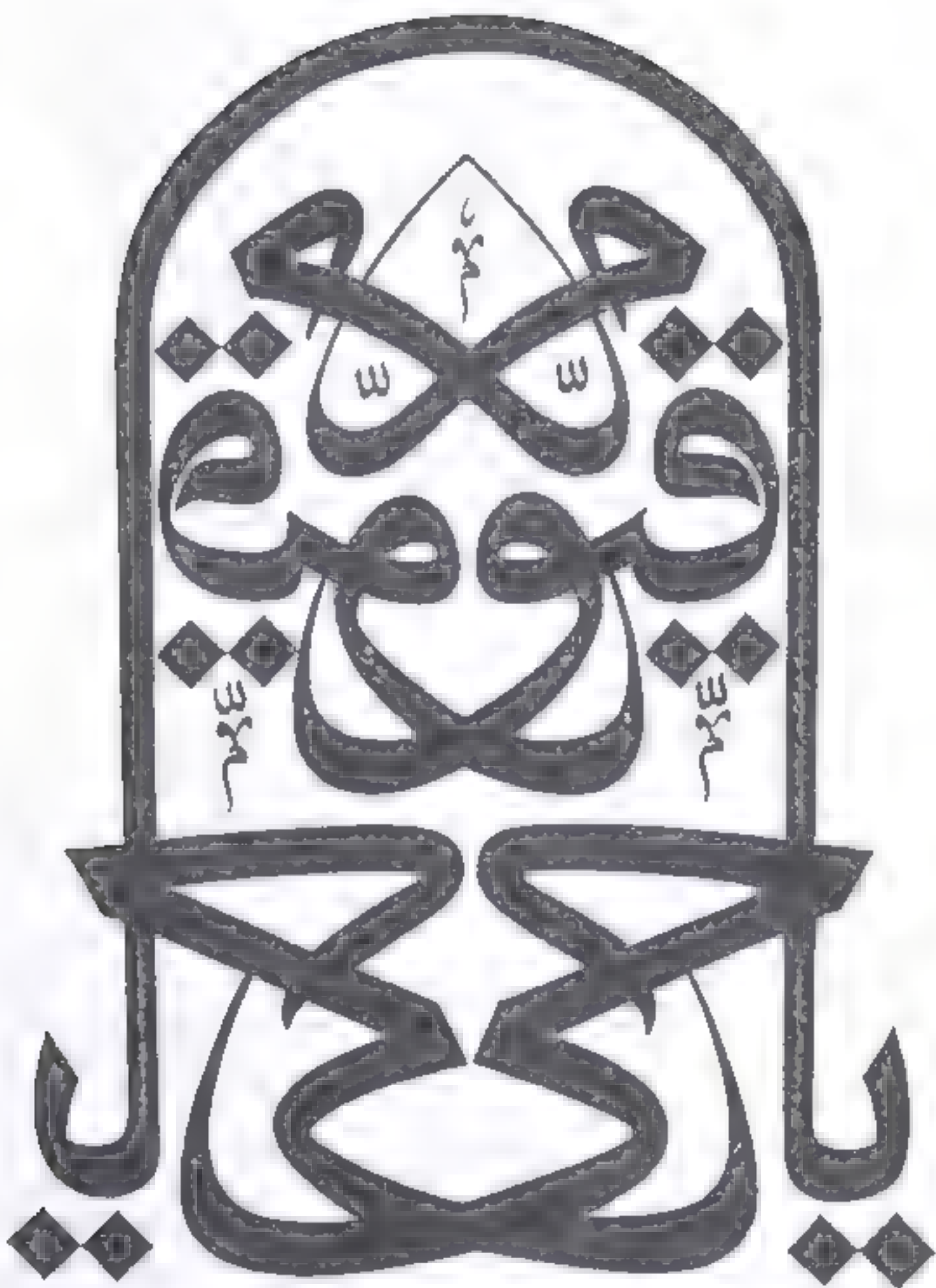
یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ - سیدھی اور الٹی کتابت - خط آئینہ (عکسی) الحاج ابن سری القادری ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۲ء

تعلیمی اداروں مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں سے ہمدردی اور اس کا امتیازی سلوک

مخبر عالم اور اس کے ایڈیٹر ہندوستان کے تعلیمی اداروں مدرسوں سکولوں اور کالجوں سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے، ان کی سالانہ رپورٹیں اور کاروائیاں بڑی فراخ دلی سے شائع کرتے تھے اور ان کو کامیاب کرنے کے لئے درپے بھی رہتے تھے، اس کام کے لئے یہ اخبار وقف تھا۔

چنانچہ مخبر عالم اپنے شروع سال میں ہندوستانیوں کے لئے "علم ضروری شے ہے" اور "تعلیم و تہذیب کی اصلی غرض" جیسے عنوانات کے تحت تعلیم کو پھیلانے کے لئے مضامین ۲۴ نومبر ۱۹۰۳ء اور ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء کے شماروں میں شائع کئے اس کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"طبیعتوں کے مختلف ارادوں اور متعدد خواہشوں سے دریافت ہوتا ہے کہ شائقین علم کو تعلیم و تعلّم کی علت غائی اور غرض اصلی میں اختلاف ہے۔ بعض کو یہ خیال ہے کہ ہم علوم مروجہ میں ترقی کرکے اعلیٰ مناصب حاصل کریں، اور مسند حکومت پر چار زانو تکیہ لگا کر بیٹھیں اور جبراً و قہراً خلق اللہ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وکالت اور مختاری کے ذریعہ قوت لسانی و زور تقریر سے بلا امتیاز حق و باطل عقل مندوں کو بے عقل اور حقداروں کو غیر مستحق ٹھہرا کر دنیا کا تمام مال و دولت سمیٹ لیں اور بہت سے اس خیال میں مگن ہیں کہ میڈیکل کالجوں میں تعلیم پاکر ڈاکٹر یا حکیم حاذق یا زبدۃ الحکماء کی سند حاصل کرکے کسی شفاخانہ و ہسپتال میں ملازم ہوکر اور مریضوں کا علاج کرکے حق الخدمت میں بہت سا روپیہ سرکار سے وصول کریں۔ کوئی اس امید میں پھنس رہا ہے کہ بی اے امتحان میں پاس ہوکر کسی اسکول یا کالج میں پرنسپلی یا ہیڈ ماسٹری کی میز کرسی سجا کر کامرانی کے ارمان نکالے۔ کوئی صاحب انجینئر ہونے کی امید پر رڑکی کالج میں امتحان پاس کر رہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی کسی خیال پر اور کوئی کسی امید پر کہیں نہ کہیں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے خیالات اور ان کے ارادوں سے واضح طور پر

اور صاف صاف پایا جاتا ہے کہ علم سیکھنے سے ان کو مقصود بالذات رہی ہے جس کی امید پر وہ کوشش اور محنت کر رہے ہیں مگر حقیقت میں تعلیم اور تعلّم کی علتِ غائی یہ ہے کہ انسان کمالاتِ انسانی پر فائز ہو اور جو کمال اس میں بالقوۃ موجود ہیں وہ بالفعل نمودار ہو جائیں تاکہ اس کو انسانیت کا کامل مرتبہ حاصل ہو، کیونکہ بدونِ تعلیم انسان اوجِ انسانیت سے درجہ بدرجہ متنزل ہو کر حضیضِ حیوانات کے گڑھے میں گر پڑتا ہے حتیٰ کہ اس قسم کی سمجھ بوجھ اس میں باقی نہیں رہتی۔ کل حرکات وسکنات میں حیوان لایعقل کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ بجز شکل وصورت کے دونوں میں کوئی مابہ الامتیاز باقی نہیں رہ جاتا۔ معاش و معاد کی راہ میں دونوں ایک ہی چال چلتے ہیں۔ تعلیم کے پَروں کے بغیر حضیض حیوانیت سے اوجِ انسانی کی طرف پرواز کرنا ناممکن ہے۔ خلاصہ کمال انسانی کا یہ ہے کہ انسان تہذیبِ اخلاق و طریقِ تمدن سے آگاہی حاصل کر کے اپنے قول و فعل، رسم و رواج میں حکیمانہ چال چلے اور اس کی طبیعت، اخلاقِ حمیدہ اور عاداتِ پسندیدہ کے زیور سے آراستہ ہو اور اوصافِ رذیلہ کے لوث و آلائش سے مبرا و پاکیزہ ہو جائے۔ اور کسی طرح کا نقص باقی نہ رہے اور خواص نوعیہ انسانیہ کامل و مکمل رتبہ کو پہونچیں۔ ایسے ہی مرتبہ کے انسان ہیں، جن کی خدا بھی تعریف کرتا ہے "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ" یعنی اولادِ آدم کو ہم نے ہر چیز پر بزرگی دی۔ صاحبِ تعظیم و تکریم وہی لوگ ہیں، جنھوں نے علم سیکھا۔ اور اپنے چال چلن کو اس کے علتِ غائی یعنی تہذیب و خلاق و طریقِ تمدن میں محصور کر دیا اور اس سے ایک قدم بھی باہر چلنا ان کے نزدیک گویا انسانیت کے احاطہ سے باہر نکلنا ہے۔"

تعلیم دلانے کے مختلف طریقے ایجاد ہو چکے تھے۔ ایک طریقہ کنڈر گارٹن کا تھا جو پسند کیا گیا تھا اور یہی طریقہ زیادہ رائج ہو گیا تھا۔ ۸ مئی ۱۹۰۹ء کے شمارے میں "کنڈر گارٹن اور مذہبی تعلیم" کے عنوان کے تحت ایک جامع مقالہ لکھا گیا تھا، ملاحظہ ہو۔

"عام طریقہ تعلیم جو مسلمانوں میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ چار یا پانچ برس کی عمر تک بچے کی طبیعت پڑھنے لکھنے سے علیحدہ رکھی جاتی ہے، اس کے بعد قاعدہ بغدادی شروع کرایا جاتا ہے جو اوسط درجہ کی قابلیت کا استاد ایک سال میں ختم کراتا ہے۔ اس کے بعد سپارہ عم پھر قرآن شریف شروع سے پڑھایا جاتا ہے۔ جب قرآن شریف میں بچہ چل نکلتا ہے تو اس کے ساتھ تبرکاً گلستاں یا کریما پڑھائی جاتی ہے۔ مگر اب گلستاں کا رواج کم ہو چلا ہے اور اس کی جگہ اردو شروع کرا دی جاتی ہے۔ اگر تعلیم اچھی طرح ہو رہی ہے تو عربی تعلیم

کا سلسلہ آٹھ نو برس کی عمر تک شروع ہو جاتا ہے ورنہ زیادہ تر لڑکوں کو اس کی تعلیم کا موقعہ نہیں ملتا۔ جب لڑکے کی عمر دس یا بارہ برس کی ہوتی ہے تو والدین کو انگریزی تعلیم دلانے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور انگریزی اور حساب نہ جاننے کی وجہ سے لڑکے کو اسکول کے چھ برس والے لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ اس طریقہ سے زیادہ عمر ضائع ہونے کی وجہ سے ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی مدارس میں بھیج دیتے ہیں مگر مذہبی تعلیم مفقود ہونا بعد میں محسوس ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ یہ زور دیا جاتا ہے کہ ہر ایک چیز کی تعلیم کنڈر گارٹن کے طریقہ پر ہو۔ یعنی بچوں کو تجربہ اور مشاہدہ سے ہر ایک چیز ذہن نشین کرائی جائے۔ اور محض زبانی اور ظنی باتوں پر تعلیم کا انحصار نہ ہو۔ تعلیم کا اول مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ بچہ کوئی ایسی چیز نہ پڑھائی جائے جس کو وہ سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ اسی اصول پہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی ایک ریزولیشن پاس کیا ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہئے کیونکہ سوائے اس زبان کے بچہ اور کسی زبان کو نہیں سمجھ سکتا۔ اب یہ سخت اور پیچیدہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم کس وقت شروع کرائی جائے اور اس میں کس قسم کی تعلیم ہو۔ کچھ صاحبوں کا خیال ہے اور چند نے اس پر عمل بھی کیا ہے کہ جب تک لڑکا عربی سے واقفیت نہ رکھتا ہو قرآن شریف نہ پڑھایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو بچہ قرآن شریف سے بالکل محروم اور دوسری طرف مذہب کی معمولی باتوں سے بالکل ناواقف رہتا ہے۔ قرآن شریف اور فقہ کی تعلیم کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کرنا جب کہ بچہ میں علوم عقلیہ کا کتابوں کے ذریعے سے پڑھنے کی قابلیت ہو جائے گو بادی النظر میں نامناسب معلوم نہ ہو۔ مگر عملی نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ مذہبی تعلیم کا سلسلہ بالکل جاتا رہے گا۔ مذہبی تعلیم میں تجربہ تو بالکل ناممکن ہے اور مشاہدہ بھی صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ بچے لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھیں اور دینی فرائض ادا کرتے دیکھیں، جس سے مذہبی تعلیم میں ایک حد تک مدد مل سکتی ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کا عربی زبان میں ہونا لازمی سمجھا گیا ہے اور یہ تعلیم ایسی زبان میں ہوتی ہے جس کو بچہ بالکل نہیں سمجھ سکتا، فقہ کی تعلیم بھی بچہ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آج کل کنڈر گارٹن کی تعلیم کا رواج روز بروز زیادہ پھیلتا جاتا ہے۔ جس میں ہر ایک چیز ایسی دلچسپی سے پڑھائی جاتی ہے کہ بچوں کی طبیعت کھیل کی طرح اس میں لگتی ہے۔ اب اگر استاد کی لکڑی کے دباؤ سے مذہبی تعلیم بھی دی جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔ بچوں کو تو اول مذہب سے اور مذہبی کتابوں سے ڈر پیدا ہو گا اس کے بعد

نفرت تو ضرور ہو جائے گی۔۔۔"

"مصر میں عربی زبان کے رائج ہونے کی وجہ سے سہولتیں ہیں۔ معمولی لکھنا پڑھنا سیکھنے کے بعد استاد قرآن مجید کی آیتوں کو تختی پر لکھ دیتا ہے۔ جن کو بچے بار بار نقل کرنے کے بعد یاد کر لیتے ہیں۔ کنڈر گارٹن کی تعلیم میں بچوں کے سامنے قصے دل چسپ طریقہ سے بیان کرنا، پھر بچوں سے ان کو سننا ایک ضروری امر ہے۔ ان قصوں کو زیادہ کامیاب بنانے کے لیے قصوں کے کسی خاص سین کی تصویر بھی سامنے رہتی ہے۔ مذہبی تعلیم اول قصوں سے شروع ہوتی ہے۔ انجیل کے تمام قصے آسان عبارت میں لکھے گئے ہیں اور ہر ایک قصہ کے متعلق متعدد تصویریں ہیں۔ نصف سے زیادہ انجیل کہانیوں کی صورت میں اس طریقے پر پڑھا دی جاتی ہے اور آٹھ نو برس کی عمر میں عقائد حفظ کرا دیے جاتے ہیں۔ پھر انجیل کی تعلیم جرمن زبان میں ہوتی ہے اور اونچی زبانوں میں تاریخ مذہب اور یونیورسٹی میں فلسفہ مذہب کی تعلیم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک مذہبی تعلیم کا نصاب یہ ہونا چاہیے۔ شروع میں بچوں کو قرآن شریف کے حصے بطور کہانیوں کے زبانی سنائے جائیں۔ اور بار بار ان کا اعادہ کرایا جائے۔ اگر ان کی تشریح کے لئے حسب ضرورت تصویریں استعمال کی جائیں تو مضائقہ نہیں۔ تصویریں خواہ یورپ سے خریدی جائیں یا یہاں تیار کی جائیں انھیں قرآنی قصوں کے ساتھ عملی طور پر وضو کرنا، اور نماز پڑھنا سکھایا جائے۔ جس وقت بچے کنڈر گارٹن کے طریقے پر حرف شناس ہو جائیں، اردو آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں اس وقت ان کو کلام مجید بھی پڑھایا جائے۔ گو وہ معنی نہ سمجھیں۔ دس برس کی عمر کے عہد میں ان کو دینیات کے رسالے اور قرآن مجید کا اردو ترجمہ پڑھایا جائے۔ دینیات کے رسالے کام چلانے کے لئے موجود ہیں۔ انجمن حمایت الاسلام نے بہترین رسالے تیار کئے ہیں۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کی دینیات کی کمیٹی نے بھی زیر نگرانی حبیب الرحمن صاحب کچھ رسالے تیار کئے ہیں۔ البتہ ایسی کوئی کتاب موجود نہیں کہ جس میں نہایت آسان عبارت میں قصے بیان کئے گئے ہوں۔ اس کے لئے کانفرنس اگر انعام تجویز کرے اور کوئی صاحب کتاب تیار کر دیں تو ایک بڑی قومی خدمت ہوگی۔ کتاب لکھنے والے کو غالباً نفع بھی ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین کی زندگی کے دل چسپ حالات بھی جن سے بچوں پر اخلاقی اثر پڑ سکے، نہایت مفید ہوں گے جن کو دس یا بارہ برس کی عمر کے درمیان دینیات کے رسالوں کے ساتھ لڑکوں کو پڑھنا چاہیے۔ اردو زبان میں کوئی اسلامی تاریخ بھی

موجود نہیں ہے، اس کے تیار کرانے کی بھی ضرورت ہے۔"

نصاب تعلیم:- "تین برس کی عمر سے چھ برس کی عمر تک قرآن مجید کے قصے اگر ممکن ہو سکے تو قصوں کی شرح تصویروں سے کرنا، عملی طور پر وضو کرنا، نماز پڑھنا۔"

"چھ برس کی عمر سے دس برس کی عمر تک کلام مجید کی عبارت عربی میں پڑھنا یا ان قصوں کے واقعات کے اسباب و نتائج سے بحث کرنا، نماز میں جو دعائیں آتی ہیں ان کو اچھی طرح یاد کرنا اور پارہ عم کی کچھ صورتوں کو یاد کرنا۔"

دس برس کی عمر سے تیرہ برس کی عمر تک: دینیات کے رسالے قرآن شریف کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ اور خاص کر ان دعاؤں اور سورتوں کا ترجمہ جو نماز میں پڑھائی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین کی زندگی کے حالات قرآن مجید کی تلاوت بعد نماز فجر تربیت کا جزو ہونا چاہیئے۔"

"تیرہ برس کی عمر سے سولہ برس کی عمر تک دینیات کے اور بقیہ رسالے، فقہ کی کوئی کتاب اور اگر ضرورت ہو تو قرآن شریف کے کچھ اور زیادہ حصہ کا ترجمہ تاریخ اسلام، خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء کے زمانے کی تاریخ، سولہ برس کی عمر میں لڑکے کالج میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں مذہبی تعلیم میرے نزدیک بالکل علیحدہ اصول پر ہونی چاہیئے۔"

ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے ادارے قائم ہو چکے تھے مسلمانوں کا بھی محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس ایک ادارہ تھا۔ اس کے مختلف مقامات پر اجلاس ہوتے تھے اور مختلف مقامات پر شاخیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ بمبئی شاخ کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس کی کاروائی ۸ر نومبر ۱۹۰۳ء کے مخبر عالم میں شائع ہوئی۔

" ہماری رائے ہے کہ مختلف لوکل گورنمنٹوں کی خدمت میں کانفرنس کی جانب سے درخواست کی جائے کہ وہ اہل اسلام کو مدرسہ ہائے سرکاری میں اہل اسلام کے خرچ سے اوقات معینہ کے پہلے یا پیچھے اس طور سے کہ کوئی علیحدہ مدرس مقرر کیا جائے یا مدرسہ ہائے سرکاری کا کوئی مدرس بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کی اجازت دیں۔ جیسا کہ گورنمنٹ پنجاب نے اپنے ریزولیشن صیغہ تعلیم نمبر ۳۴ مورخہ ۲۵ر جولائی ۱۸۸۵ء میں منظور فرمایا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ لڑکوں کو مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور اس کے لئے گورنمنٹ بمبئی

سے درخواست کی جائے کہ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے لئے سرکاری اور میونسپل بورڈ کے مدارس میں اپنا انتظام کرنے کی اجازت دی جائے جیسے گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی و پنجاب نے اس سے قبل اجازت دی ہے۔"

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اس امر پر اتفاق کرتی ہے کہ اہل اسلام زکوٰۃ کا روپیہ مسلمان، یتیم، مفلس اور ہونہار بچوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کریں اور صرف اسی صورت سے زکوٰۃ کا روپیہ اپنے مناسب مصرف پر صرف ہوگا۔

چونکہ اب صنعت وحرفت کا نفع کثیر بالاتفاق مانا گیا ہے اور ضرورت شدید سمجھی گئی ہے اس لئے مسلمانوں کی حالت موجودہ کے مناسب صنعت وحرفت کے مدارس قائم کرنے کی ایسی تدبیر اختیار کی جائیں جن سے مسلمان عام طور پر متمتع ہوں۔

اس کانفرنس کی رائے ہے کہ سرکار ہند سے درخواست کی جائے کہ تمام مدارس اضلاع میں کمسن بچوں کی تعلیم کے لئے کنڈرگارٹن کی تعلیم کا طریقہ جاری کیا جائے۔

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ سرکار ہند سے درخواست کی جائے کہ مسلمان شریف خاندانوں کے رسم و رواج کے پورے لحاظ کے ساتھ زنانہ مدرس قائم کئے جائیں۔

گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کافی ہو وہاں کے سرکاری میونسپل کالجوں اور سکولوں میں اردو اور عربی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

کانفرنس اس امر کو ضروری سمجھتی ہے کہ دور دراز کے مسلمان طلبہ کے کھانے پینے اور سکونت کی بے حد دقتیں رفع کرنے کے لئے ہر تعلیمی مرکز میں پرائیویٹ نیز سرکاری امداد سے بورڈنگ ہاؤس قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس جلسے کی یہ رائے ہے کہ حفاظ قرآن شریف کی تعداد بڑھانے اور اس کے وسائل بہم پہونچانے کی کوشش بلیغ کی جائے۔

اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستان کے طلبہ کی اخلاقی ترقی کے لئے یورپ کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نمونے پر اسلامی یونیورسٹی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

ہندوستان کے ہر حصے اور ہر علاقے میں علیحدہ کالج اور اس کے کاروبار میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کانفرنس یہ مناسب سمجھتی ہے کہ علی گڑھ کے ٹرسٹیوں میں ہر علاقہ سے ایک ٹرسٹی ہوا کرے۔

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں میں علمی تعلیم نہ ہونے کے باعث جو محض مذموم و تباہ کن رسمیں رواج پاگئی ہیں اور جن سے مسلمان اور خصوصاً زراعت پیشہ مسلمان دن بدن مفلس، نادار اور خانماں برباد ہوتے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے اپنے بچّوں کی تعلیم کے اخراجات کے متحمّل نہیں ہو سکتے ان رسومات کی بیخ کنی کے لئے ان میں عام تعلیم پھیلائی جائے اور شادی و غمی کے اخراجات کو مناسب طریقہ سے محدود کر دیا جائے۔ اس کانفرنس کی رائے میں وہ وقت آگیا ہے جب کہ تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر مسلمان متحدہ کوشش ان رسوم کے استیصال میں کریں جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہیں اور شرع و شریعت کے بھی خلاف ہیں۔

حاجی محمد سلیمان سیٹھ ملک التجار باشندہ راندھیر نے اپنی جائیداد کا تیسرا حصّہ مبلغ بیس لاکھ روپے از راہ ہمدردی دفیاضی واسطے تعلیم اور قائم کرنے مدارس کے علیحدہ کیا ہے۔ اس بارے میں کانفرنس کی رائے ہے کہ اس رقم سے حسب ضرورت ایک رقم علیحدہ کر کے ایک مدرسہ علوم و فنون کا خاص مسلمانوں کے لئے قائم کیا جائے۔

یہ کانفرنس گورنمنٹ بمبئی سے استدعا کرتی ہے کہ جس شہر یا قصبہ میں تعلیم کا کام لوکل میونسپلٹی کے سپرد ہے وہاں جس قدر روپیہ دوسری قوموں کی تعلیم پر صرف کیا جائے اسی مناسبت سے مسلمانوں کی تعلیم پر حسب ضابطہ صرف کیا جائے۔

ایک ایسا فنڈ جس کا نام "جنوبی ہندوستان قومی فنڈ" ہو کھولا جائے اور کم از کم پانچ سال تک جاری رہے، جس کے واسطے بمبئی اور اضلاع کی کمیٹیاں بالاتفاق کوشش کریں تاکہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے مستقل وظائف مختلف شعبوں میں دیئے جائیں اور وہ فنڈ قوم کی دیگر تعلیمی ضروریات کے لئے بہم پہونچانے اور متعدد اسکول قائم کرنے اور انجمن اسلام اسکول کے کالج بنانے میں کارآمد ہو۔

اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ایک شخص علاقہ بمبئی میں اس غرض سے دورہ کرنے کے لئے مقرر کیا جائے کہ مدرسہ جانے کے لائق مسلمان لڑکوں کی تعداد نیز مدرسہ جانے والے لڑکوں کی تعداد کی واقفیت حاصل کرے اور ان وجوہات کو دریافت کرے جو ان لڑکوں کو جو کسی مدرسہ میں نہیں پڑھتے ہیں کیوں تعلیم سے گریز کرتے ہیں۔

اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ کو سرکار متفرق محکمہ جات میں جگہ دے۔ کیونکہ مسلمانوں کی موجودہ تعداد کے مطابق اس قدر تعلیم یافتہ مسلمان،

نوکر نہیں جس قدر اس علاقہ بمبئی میں ہونے چاہئیں۔

اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے واسطے ہندوستان میں ایک قومی انگریزی اخبار کی اشد ضرورت ہے اور کانفرنس سینٹرل کمیٹی کو اجازت دے تاکہ وہ پبلک سے بطور شیئر (حصص) یا چندہ کے طور پر روپیہ وصول کرے۔

کانفرنس چاہتی ہے کہ گورنمنٹ بمبئی سے درخواست کی جائے کہ وہ علاقہ بمبئی میں مسلمانوں کے کاروبار کی آسانی اور بالخصوص مسلمان بچوں کی تعلیم کی سہولت کے لئے اردو کو ضلع کی زبان مقرر کرے۔

یہ بات اب تسلیم کر لی گئی ہے کہ منجملہ ان دیگر اسباب کے جو قوم کی ترقی کے لئے لازمی ہیں تعلیم نسواں بھی ایک قوی سبب ہے۔ اس لئے عملی صورت پیدا کرنے کے لئے خاص بمبئی یا نواحِ بمبئی میں ایک زنانہ بورڈنگ اسکول قائم کیا جائے۔

قاضی سید عبدالغنی عابد مدیر مخبر عالم عقائد کے اعتبار سے دیوبندی جماعت اور ان کے عقائد سے مطمئن نہیں تھے۔ بریلوی علماء کے عقائد سے اتفاق کرتے تھے۔ علماء دیوبند کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن تعلیمی معاملات میں یہ اختلاف آڑے نہیں آتا تھا۔ حتی الامکان ہر عقیدے کا پروپگنڈہ اخبار میں کرتے تھے۔ سرجیمس مسٹن لیفٹننٹ گورنر یوپی صوبہ دارالعلوم دیوبند آئے تھے اور مدرسہ کا معائنہ کیا تھا اور آپ نے وہاں تقریر کی جو ۵ مارچ ۱۹۱۵ء کے مخبر عالم کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"متولیان و مویان و علماء مدرسہ عالیہ دیوبند! سالہا سال سے میری یہ تمنا تھی کہ یہاں آکر بچشم خود اس مشہور مدرسہ کو دیکھوں اور اس کے ذی علم مدرسوں اور علماء سے تعارف و ملاقات کا موقع ملے۔ اور میری اس آرزو کی متعدد وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ ایسے علماء متبحرین کی تعظیم و تکریم کروں جو بلا امید نفع دنیوی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے ہیں جو فطرتاً ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں جاگزیں ہونی چاہئے۔ دوم وہ فخر و مباہات جو اس صوبہ کے باشندوں کو اس مدرسہ کے فیضانِ تعلیم سے حاصل ہے جس کی شہرت تمام ملک ایشیا اور اسلامی یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے جس کی میں قدر و منزلت کرتا ہوں کہ آپ لوگ نہایت ثابت قدمی سے محض مذہبی درس و تدریس میں مصروف رہتے ہیں اور سیاسی مباحث سے بالکل احتراز کرتے ہیں۔ وہ جن سے اس ملک کے حکام کو دشواریوں کا احتمال ہو۔ پس جب میرے سچے دوست نواب عبدالصمد خان صاحب کے ذریعہ آپ کی یہ خواہش معلوم ہوئی کہ میں مدرسہ میں آؤں تو دلی مسرت

حاصل ہوئی۔ اور یہ مسرت اس سپاسنامہ کے مضامین سے دوبالا ہوئی جو ابھی میرے خیر مقدم میں پیش کیا گیا ہے۔ میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ دلی محبت اور ایسے اخلاص کا برتاؤ کیا اور اپنا مشہور و معروف مدرسہ مجھ کو دکھلایا اور اپنے مدرسے کے کچھ کچھ اصلی مقاصد کے معلوم کرنے کا موقع دیا۔ آج کل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے۔ اوّل لوگ بلالحاظ عقبیٰ راحتِ دائمی کے لئے رات دن دولتِ دنیا کے حصول کی سعی کرتے ہیں، اور اس کام میں اپنی تمام عقل جو خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، صرف کرتے ہیں۔ دوم لوگ ظاہری زیب و زینت اور نام و نمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی و باطنی ترقیات حاصل کرنے کے لئے جو واقعی نعمتیں ہیں کوئی حصّہ اپنے وقت کا باقی نہیں رکھتے۔ سوم بعض لوگ مذہب کے پردے میں تعصّب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ پند و نصیحت سے کام لیں۔ اور یہ ذہن نشین کریں کہ خداوندِ عالم کے نزدیک سب بندے یکساں ہیں باہمی نفاق پھیلاتے ہیں۔ آپ نے اس عاقلانہ سپاسنامہ کے اس فقرے میں جو سب سے زیادہ موثر ہے یہ تحریر کیا ہے کہ آپ ان تینوں امور سے اجتناب کلّی رکھتے ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ آپ اپنے طلبہ کی ایسی تعلیم و تربیت کر رہے ہیں جس سے دنیا و عقبیٰ میں راحت کی جگہ حاصل ہو۔ اے میرے دوستو! میں آپ کی نسبت لفظِ دوست محض اخلاقی طور پر نہیں کہتا بلکہ میں عام مسلمانانِ ہند کا سچّا اور بہی خواہ دوست ہوں۔ یہ امر میرے لئے نہایت مسرّت کا باعث ہو، کہ آج میں یہاں آپ سے ملا اور مجھ کو یقین دلانے کا موقعہ ملا کہ گورنمنٹ آپ کی اور آپ کے مدرسے کی نہایت وقعت و منزلت کرتی ہے۔ اگرچہ آپ کی قوم پر تکلیف و مایوسی کا زمانہ گذر رہا ہے لیکن آپ اگر ان کو پند و نصائح اور سچّے خیالات سے تسلّی و تشفی دیتے رہیں تو اس طرح ان کی تکلیفیں باقی نہ رہیں گی۔ اے میرے دوستو! میں خود تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں دنیوی طریقہ سے آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں تو آپ کو شاید ناگوار گذرے لیکن اگر کوئی اعانت کی خواہش کی جائے گی تو میں کامل طور پر بکشادہ دل اس کو پورا کرنے کی سعی کروں گا، اور اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ آج تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی مہمان نوازی سے بہت ممنون ہوں اور میرے دل میں بہت ہی قدر و منزلت ہے اور میں جنابِ باری سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ کے مدرسے کو ہر قسم کے امر میں ترقی دینی و دنیاوی حاصل ہو۔"

مدرسہ عالیہ رامپور سنہ ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میں منشی، منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی تھی اور ان تینوں امتحانوں کا اسی مدرسہ میں انتظام کیا جاتا تھا۔ اس مدرسہ کی ۱۹۰۶ء کے سالانہ جلسہ کی کارروائی ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کے مخبر عالم میں درج ہوتی تھی۔

"سرکار عالی تبار جناب مجیر نواب حامد علی خاں صاحب والی ریاست رام پور نے اپنے قدیمی مدرسۂ عالیہ رامپور کی تعلیم کو ۱۹۰۱ء سے مفید اور باقاعدہ بنا دیا جس کا ان کی رعایا کو ممنون ہونا چاہئے۔ چنانچہ تین درجے فارسی کے منشی، منشی عالم اور منشی فاضل ۱۹۰۱ء میں کھولے گئے۔ اور مولوی سید اولاد حسین صاحب کو لکھنؤ سے بلا کر درجہ منشی فاضل کا مدرس مقرر فرمایا۔ مولوی صاحب موصوف پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹی سے نو سرٹی فیکٹ انگریزی، عربی، فارسی کے رکھتے ہیں، اور نہایت سعی و کوشش سے اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ ان تینوں درجات کی کامیابی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہر سال طلبہ پنجاب یونیورسٹی امتحانات علوم مشرقی میں لکھنؤ یا دہلی سینٹر سے شریک ہوتے ہیں اور ہر سال نتیجہ اچھا رہتا ہے۔ محمد طالب حسین خاں جنھوں نے اسی مدرسہ عالیہ سے امتحان منشی فاضل کیا تھا اب وہ سری نگر ضلع گوجرانوالہ کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی ہیں۔ شکر ہے خدا کا کہ ہمارے مدرسے کے طلبہ گورنمنٹ میں ملازم ہونے لگے ہیں۔ عربی کے تین تین درجے مولوی عالم اور مولوی فاضل اس مدرسے میں ہیں۔ درجہ مولوی فاضل بلکہ تینوں درجوں کو مولوی محمد طیب صاحب مکی پرنسپل مدرسہ عالیہ میں تعلیم دیتے ہیں علاوہ ان درجات کے اور بھی درجے فارسی عربی کے ہیں جن میں درس نظامی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور حدیث کا بھی دورہ ہوتا ہے، اس صیغہ میں بدخشاں، کابل، قندھار، بخارا، خیوہ، پشاور، آسام اور کل ملک بنگال سے طلبہ پڑھنے آتے ہیں۔ اس مدرسہ کی وجہ سے رام پور دارالعلوم سمجھا جاتا ہے۔ اس سال مدرسہ عالیہ کے صیغۂ فارسی سے امتحانات علوم مشرقی میں دس طلبہ لکھنؤ سینٹر میں شریک ہوئے۔ منشی فاضل کے چار طالب علم تین پاس اور ایک صرف ترجمہ کے پرچے میں فیل، منشی عالم کے تین میں سے ایک شریک پاس اور دو اوّل پرچے میں فیل، منشی کے پانچوں شریک ہیں پاس۔ ہر نتیجہ قابل تعریف ہے۔ یوں تو ہر سال نتیجہ اچھا رہتا ہے لیکن اس سال کا نتیجہ فیصدی اعلیٰ ہے اور نہایت مدح کے لائق۔ عربی صیغہ سے گیارہ طلبہ امتحان میں شریک ہوئے سات مولوی میں تین پاس اور چار فیل، اور دو مولوی عالم میں ایک پاس ایک فیل، اور دو مولوی فاضل میں ایک پاس ایک فیل۔ ج۔ ن نامہ نگار رامپور۔

مسلم پبلک اسکول مراد آباد غالباً ۱۹۰۵ء میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت سے اس کا ہر سال سالانہ اجلاس ہوتا تھا اور اخباروں میں کاروائی شائع ہوتی تھی۔ ۱۹۰۸ء کے سال کی سالانہ اجلاس کی کاروائی ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء کے مخبرِ عالم مراد آباد میں درج ہوئی، جو یہ ہے ۔

"یہ اسکول تقریباً تین سال سے قائم ہے۔ اگرچہ یہ اپنا ہر سال سالانہ جلسہ کرتا رہتا تھا مگر اس مرتبہ اس کا سالانہ جلسہ بصدارت عالی جناب ٹی کے جانسٹن صاحب جنٹ مجسٹریٹ مراد آباد ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء کو پانچ بجے شام کے منعقد ہوا۔ چونکہ اشتہارات اور خطوط بکثرت تقسیم کئے گئے تھے اس لئے چار سو یا پانچ سو آدمی شریک ہوئے۔ سب سے پہلے ایک طالب علم نے خوش الحانی سے قرآن مجید پڑھ کر اس جلسہ کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد حمد و نعت میں طلبہ نے نظمیں پڑھیں۔ پھر مسائل نماز بیان کرکے ایک کمسن طالب علم نے نظم پڑھی۔ ایسے ہی ایک دوسرے بچے نے عربی کی ایک نظم سنائی۔ اس کے بعد مکالمہ شروع ہوا، جو مسلم پبلک اسکول سے متعلق تھا۔ تقریباً ایک درجن بچوں نے مختلف قسم کی نظمیں پڑھیں۔ جس سے سامعین محظوظ ہوئے مسلم پبلک اسکول نے ابتدار تعلیم سے ہی سخن گوئی و سخن فہمی کا مادہ پیدا کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جناب مولوی محمد یعقوب علی خاں صاحب وکیل جج نے صاحب چیرمین کے اخلاقِ حسنہ اور تعلیمی دلچسپی کے متعلق ایک مختصر تقریر کی۔ جس کے بعد ابرار حسن صاحب سکریٹری مسلم پبلک اسکول نے خود کھڑے ہوکر ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ اگر اس پبلک اسکول کو آپ حضرات مفید سمجھیں تو اس کو قائم رکھا جائے۔ اس کے بعد اس اسکول کی سالانہ رپورٹ انگریزی میں پڑھی گئی جس میں بتایا کہ اس سال اس اسکول میں دو سو طالب علم ہیں، نو کلاسیں ہیں اور کس قدر ٹیچر ہیں۔ چونکہ اب تک اس اسکول کا تمام دار و مدار قومی چندے پر ہے۔ آمد و خرچ کی رقوم جلسے میں بتائی گئیں۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ہمارے کلکٹر صاحب و مجسٹریٹ مراد آباد نے صاحب انسپکٹر سررشتۂ تعلیم جناب جنٹ مجسٹریٹ سے رائے طلب کی ہے کہ صیغۂ چنگی سے اس اسکول میں کیا مدد کی جائے جس کے بارے میں دونوں نے اچھی رائے ظاہر کی ہے اور عنقریب ایک معقول چندہ ماہوار مرحمت کیا جائے گا۔

جانسٹن صاحب نے کھڑے ہوکر اردو میں ایک جامع تقریر فرمائی۔ سب سے اوّل آپ نے اردو سے ناواقفیت کا اعتراف فرما کر کہا: یورپ میں اگرچہ ایسے اسکولوں کو سرکار سے کوئی امداد نہیں ملتی۔ مگر ان کو پبلک چندوں و خیراتی مددوں سے امداد ملتی ہے۔ اس اسکول کی حالت پر

آپ نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ کہ مجھے امید ہے کہ یہ اسکول پوری ترقی کرے گا۔ آخر میں مولوی محمد یعقوب علی خاں وکیل کی طرف اشارہ کر کے ان کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔"

غیر ممالک میں علم کے حصول کے لیئے ایک علمی و صنعتی ایسوسی ایشن کلکتہ میں قائم ہوئی جو ہندوستانیوں کو تربیت دے کر غیر ممالک روانہ کرتے تھے یہ ایسوسی ایشن بھی ہر سال اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرتی تھی، چنانچہ اس ایسوسی ایشن نے ۱۹۱۶ء کو بھی اجلاس منعقد کیا۔ جس کی کاروائی ۸ مئی ۱۹۱۶ء کے مخبر عالم مرادآباد میں شائع ہوئی۔

"بنگال میں سائینٹفک و انڈسٹریل ایسوسی ایشن کے نام سے ہندوستانی نوجوانوں کو تحصیل علم و فن کی غرض سے بیرون جات کو بھیجنے کے لیئے جو ایسوسی ایشن قائم ہے وہ تا حال مہتم بالشان کام انجام دے چکی ہے۔ چنانچہ اس کے سالانہ جلسہ میں آنریبل رائے تیناناتھ رائے پریسیڈینٹ نے اثنائے تقریر ظاہر کیا کہ ایسوسی ایشن اس وقت تک تین سو ہندوستانیوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں تحصیل صنعت و حرفت کی غرض سے بھیج چکی ہے جن میں سے ایک سو چالیس مختلف فنون سیکھ کر واپس آ گئے ہیں۔ ایسوسی ایشن کے طلبہ نے ۳۲ صنعتیں جاری کی ہیں اور ایک سو تیس طلبہ گورنمنٹ و ہندوستانی ریاستوں میں اور کارخانوں میں ملازم ہیں۔ یہاں تک اس کے نتائج کے گراں قدر ہونے میں شک نہیں لیکن ایسے بھی طلبہ ہیں جو تحصیل علم و فن کے بعد ہندوستان آنے کے بعد بھی اپنی قابلیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ قبل ازیں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ ہندوستان میں صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی میں ایسوسی ایشن کا نوجوانوں کو صنعتی تعلیم و تربیت کی غرض سے بھیجنا ایسا ہی ہے جیسا کہ گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتا جائے۔ گو یہ خیال مبالغہ سے خالی نہیں تاہم اگر ایسوسی ایشن ان کی خدمات سے بخوبی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تو اسے خود یا اوروں کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ طلبہ تحصیل علم و فن کے بعد مراجعت وطن پر بے کار نہ رہنے پائیں اور صرف اس بھروسے پر ان کو بیرون جات میں بھیجنا کہ بعد از مراجعت، انہیں اتفاقاً کوئی سرکاری ملازمت مل جائے گی، اس سرمایہ کا جو ایسوسی ایشن کے پاس ہے موزوں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ابھی یہ جوہر ناپید ہے کہ خود ابتدائی حالت میں کارخانے قائم کر کے انہیں ترقی دیں اور دوسروں کو قابل بنائیں۔ دہلی کے شریفی خاندان کے چشم و چراغ حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی میں طبی کانفرنس قائم کر رکھی تھی۔ آپ کے نواب صاحب رامپور سے گہرے تعلقات تھے جس کی بنا پر ۱۹۱۶ء کی سالانہ طبی کانفرنس رام پور میں نواب صاحب رامپور کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کی روئیداد ۱۵ مارچ ۱۹۱۶ء کے

مجرعالم کے شمارے میں چھپی۔ یہ طبی کانفرنس کا چھٹا اجلاس تھا۔

"اس ہفتہ ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ مارچ تک آل انڈیا آیوویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس دہلی کا چھٹا اجلاس نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ زیر صدارت ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور منعقد ہوا جس میں قریب قریب ہندوستان کے تمام مشاہیر حکماء اور وید صاحبان شریک تھے اور نواب صاحب کی شاہانہ فیاضی سے ایک اعلیٰ پیمانہ پر سب کی مہمانی منجانب ریاست فرمائی گئی تھی جس سے تمام مہمان مسرور نظر آتے تھے۔

پہلے دن کی کارروائی میں نواب صاحب نے باوجود علالت طبع خود حصہ لیا اور کرسیٔ صدارت کو زینت بخشی۔ ایک قابل قدر پریسیڈنشل ایڈریس فرمایا جس میں نہایت قیمتی مشورہ دیا گیا۔ نواب صاحب نے کانفرنس کی مالی کمزوری کو رفع کرنے کے لئے دو ہزار روپے کا ماہانہ چندہ مرحمت فرما کر عام چندے کی تحریک فرمائی، جس پر قریب قریب اسی قدر اور چندہ ہوا۔ نواب صاحب طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اجلاس سے تشریف لے گئے۔ بقیہ اجلاس ریونیو سکریٹری جوڈیشیل کی صدارت میں ہوا۔ جس میں بہت سے ریزولیشن ادویات کی عمدگی و صفائی و مرکبات کی خاص نگرانی کے متعلق پاس ہوئے۔ میڈیکل ایکٹ سے عام اظہار ناراضگی کیا گیا۔ طبی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اکثر نظمیں پڑھی گئیں۔ جڑی بوٹیوں کے متعلق عام معلومات کا اظہار کیا گیا۔

نواب صاحب کی تقریر:- وید و طبیب صاحبان! میں آج آپ صاحبوں کی ان کوششوں کو جو آپ اپنے شریف و عزیز علوم و فنون کی ترقی کے لئے کر رہے ہیں بچشم خود دیکھ کر نہایت مسرور ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ روز بروز ترقی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور سابق کی نسبت عام ہمدردی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ صاحبوں سے اکثر حضرات واقف ہوں گے اور میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان علوم کے ساتھ نہایت دلچسپی ہے اور ہمیشہ اس ریاست نے ان علوم و فنون کی قدر شناسی کی ہے، حاذق الملک سے میرے تعلقات بالکل عزیزانہ ہیں۔ میں ان کو اپنا پرانا دوست ہی نہیں بلکہ عزیز سمجھتا ہوں سب سے پہلے میں نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مدرسہ طبیہ اسکول سے کالج کی حد تک پہونچنا چاہئے اور میں دل سے اس کام میں شریک ہوں۔ جو کوشش آپ نے شروع کی ہے انشاء اللہ تعالےٰ اس کے عمدہ نتائج جلد آپ حضرات دیکھیں گے۔ دنیا میں کوشش و استقلال ہی کی بدولت کامیابی کا چہرہ نظر آیا کرتا ہے۔ بالخصوص مجھے اس بات سے بے حد

مسرت ہوئی کہ میں اس کانفرنس میں ویدوں وطبیبوں کو ایک ساتھ اپنے ملک کی بہتر یادگار کو محفوظ رکھنے کی طرف بڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ ہندوستان میں یہ فخر صرف اسی کانفرنس کو حاصل ہے کہ دونوں ملکی بھائی ہندو و مسلمان مل کر ملک کی بہتری کے لئے خاموشی اور خلوص سے علم و فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں خود بھی یونانی علاج کرتا ہوں۔ پنڈت ٹھاکر دت شرما نے جو کہا تھا وہ ایک حد تک درست ہے اور لوگ بھی اب ضرور رجوع کریں گے۔ سرجری بھی انشاء اللہ تعالیٰ کامل ہو جائے گی جب ہمارا کالج کھلے گا۔ لیکن مجھے آپ صاحبوں سے التماس کرنا ہے کہ پہلے جو یہ خیالات تھے کہ عمدہ نسخے مخفی رکھے جاتے تھے۔ گر کوئی اولاد نہیں ہوتی تھی تو نسخے گم ہو جاتے تھے امید ہے کہ ایسے خیالات کی آپ سب صاحبان اصلاح کریں گے کہ عام منفعت کے واسطے ایسے نسخوں کو ضرور ظاہر کیا جائے۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مجھے اس بات میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہمیشہ گورنمنٹ انگلشیہ پبلک خیالات کی قدر کرتی ہے اور علوم و فنون کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرے گی۔ ہندوستان کے دونوں بڑے گروہ گورنمنٹ کی کامل وفاداری کے ساتھ خاموشی سے اپنے ملک کی بھلائی کے لئے اپنے علم و فن کی حفاظت میں ساعی ہیں۔ یہ جب اپنی خواہشیں اور تکلیفیں مؤدبانہ طور پر باقاعدہ گورنمنٹ تک پہونچائیں گے تو وہ آپ کے علوم و فنون کی حفاظت و ترقی کے لئے کسی ممکن امداد سے ہرگز دریغ نہ کرے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ کانفرنس کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ میں تمام ویدوں اور طبیبوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ آپ کا کام نہایت عظیم الشان کام ہے۔ یہی وقت ہے کہ آپ سب صاحب اپنے فرض سے غفلت نہ کریں ورنہ یہ ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اب مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ آپ کو اس مفید کانفرنس کے چھٹے سالانہ جلاس کی کارروائی شروع کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

اس شاہانہ تقریر میں جس دلچسپی کا اظہار فرمایا گیا ہے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ نواب رامپور سید محمد حامد علی خاں کے عہد میں ہی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ جس کے بکثرت شرکا کو علاوہ مہمانی علیٰ قدر مراتب کافی وافی زادِ راہ بھی مرحمت فرمایا گیا۔ ایک اعلیٰ پیمانہ پر ترقی اردو زبان کے لحاظ سے مشاعرہ ہوا جس میں ہندوستان بھر کے شعراء شریک ہوئے نیز ہندوستان کے مدعیٔ اور علمائے قادیان کا مناظرہ بھی ہوا۔ شرکاء کو علاوہ مہمانی رخصت نہ زادِ رہ بھی دیا گیا۔

ایڈیٹر مخبر عالم جناب قاضی عبد العلی صاحب عابد تعلیم نسواں کے حامی تھے لیکن بے پردگی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ کے مقالے اور نوٹس نکلتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک نوٹ ۸ ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں تحریر کیا۔

"علاوہ ان فوائد کے جو کہ تعلیم نسواں کی بدولت ملک کو پہونچ سکتے ہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری کئی سوشل اصلاحوں میں کامیابی ہو سکتی ہے کیونکہ ہندوستان میں بہت سے سوشل رفارم ایسے ہیں جو عورتوں کی ذات سے وابستہ ہیں مثلاً لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی شادی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے عورتوں کی مدد اور ہمدردی لازم ہے۔ یہ سوشل رفارم کی ایسی گتھیاں ہیں جنھیں سلجھانے کے لئے عورتوں ہی کو تحریک کی ضرورت ہے۔ آج قریب پچاس سال سے ہندوستان میں سوشل رفارم کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور لوگوں نے صغرسنی کی شادی وغیرہ کی اصلاح کے لئے بہت کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ مسائل قابل اطمینان طور سے حل نہیں ہوئے۔ گو کہ یہ ضرور ہے کہ آج کل ایسی عورتیں ہندوستان میں ہیں جو صغرسنی کی شادی سے محفوظ ہیں جنھوں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے یا جو کہ آزاد ہیں اور جن کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کہ انگریزوں کی عورتوں کو۔ مگر یہ تعداد میں بہت قلیل ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر بنگال یا بمبئی میں نظر آتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں لوگ تعلیم اپنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اس طرف کے صوبہ جات یعنی پنجاب و ممالک متحدہ وغیرہ میں بھی لوگ تعلیم نسواں کے فائدے کو سمجھنے لگے ہیں اور اس کی ضرورت کو بھی محسوس کر چکے ہیں جس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ابھی حال میں ممالک متحدہ کی لوکل گورنمنٹ نے جب اس مسئلہ پر عوام سے رائے مانگی تو لوگوں نے بہت خوشی کے ساتھ اس کے موافق اپنی رائیں ظاہر کیں۔ اگر اس مسئلہ کے کسی پہلو پر اختلاف رائے تھا تو صرف اس امر پر کہ عورتوں کو کس قسم کی تعلیم دینا چاہیئے۔ آیا ان کو عربی و سنسکرت کی تعلیم دی جائے یا کہ انگریزی کی۔ یہ مسئلہ واقعی غور طلب ہے۔ میرے نزدیک آج کل زیادہ تر عورتوں میں مذہبی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم فائدہ مند ہوگی۔ اس سے آپ سب صاحبان یہ نہ سمجھ لیں کہ میں کسی طرح سے سنسکرت یا عربی کے خلاف ہوں۔ میرا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے اور نہ میں محض انگریزی زبان کو اہل ہند کے لئے کافی سمجھتا ہوں۔ میں صدق دل سے سنسکرت و عربی کی ترقی چاہتا ہوں۔"

مدرسہ امدادیہ مراد آباد:- ڈپٹی امداد علی صاحب اکبر آبادی نے بزمانہ تعیناتی اس عربیہ مدرسہ کی بنیاد ڈال کر اس کو ایک موزوں مقام پر قائم کیا تھا اور اپنے قیام مراد آباد تک خود اس کے نگراں و سرپرست رہے۔ اس کے بعد مولوی محمد گل صاحب کابلی کو اہتمام سپرد کر کے آگرہ چلے گئے اور یہ مدرسہ جو عام چندہ و امداد سے قائم کیا گیا تھا وقف کر دیا گیا۔ ڈپٹی صاحب کے زمانۂ حیات میں یہ مسئلہ عرصہ تک زیر غور رہا کہ مدرسہ شاہی مسجد اور امدادیہ کا الحاق ہو جائے۔ چنانچہ مدرسہ شاہی مسجد کے اور مدرسہ امدادیہ کے درمیانی دروازے بھی کھولے گئے لیکن جب کہ اختلاف عقائد مذہب دور نہ ہوا تو پھر بند کر دیئے گئے اور ہمیشہ کے لئے مدرسہ جدا ہو گیا۔ یہ امر عام طور پر مشہور ہے کہ مدرسہ شاہی مسجد قاسم العلوم دیوبند کے طریقۂ تعلیم کا ہے اور مدرسہ امدادیہ کے عقائد دوسرے ہیں۔ چنانچہ عام سنی المذہب مقلدین مدرسہ امدادیہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد گل صاحب کی متعدد تصانیف اس امر کے اظہار کے لئے کافی ہیں۔ اب کہ ہفتہ گذشتہ مولوی محمد گل صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور آپ کا کوئی قائم مقام و جانشین ہنوز تجویز نہیں ہوا ہے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ دونوں مدرسے ایک کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ہم عصر "نیّرِ اعظم" نے بھی اپنی "نوٹ" میں یہ آرزو کی ہے لیکن یہ خواہش بالکل بے جا اور غلط ہے۔ یہ دونوں مدرسے اپنے اپنے عقائد کی جداگانہ تعلیم دیتے ہیں۔ پھر کس طرح ایک ہو سکتے ہیں۔ نہ اصل بانیٔ مدرسہ نے ایسا کیا جانا منظور کیا، نہ اس کے جانشین نے یہ امر گوارا کیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مدرسہ اہل سنّت والجماعت جو کرایہ کے مکانوں میں قائم ہے اور جس میں بہت سے طلبہ مدرسہ شاہی مسجد سے اپنا نام خارج کرا کر داخل ہو گئے ہیں امدادیہ مدرسہ میں ملحق کر دیا جائے کیونکہ اس مدرسہ اور امدادیہ کے مدرسہ کے طریقۂ تعلیم و عقائد ایک ہیں اور مولوی حافظ محمد نعیم الدین صاحب جس طرح مولوی محمد گل صاحب جانشین مدرسہ امدادیہ کے مدرسہ امدادیہ میں تعلیم دیتے تھے اور کل انتظام کرتے تھے۔ اسی طرح وہ مدرسہ اہل سنّت والجماعت کے نگراں و مہتمم ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمد نعیم الدین صاحب مدرسہ امدادیہ کے مہتمم قرار دیئے جائیں اور یہ دونوں مدرسے ایک کر دیئے جائیں اور شاہی مسجد والا مدرسہ قاسم العلوم جس طرح جداگانہ قائم ہے وہ اپنے طریقہ پر قائم رہے چونکہ شہر میں عام سنی الجماعت گروہ ہے اور ان کی بھی یہی دلی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ اس طرف جلد توجہ کی جائے گی۔"

(دبدبۂ سکندری رامپور، ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء)

حُرّیت پرور اور طنزیہ کلام

انگریزوں نے اپنے دور میں ہندوستانیوں پر ظلم توڑنے اور ان کو ذلیل کرنے کی انتہا کر رکھی تھی چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑا ذمہ دار حاکم بھی ہندوستانیوں کو ذلیل و رسوا کرنے میں اپنی شان سمجھتا تھا۔ لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے بھی ۱۹۰۵ء میں اپنی ایک تقریر میں جی بھر کے ہندوستانیوں کی تضحیک کی جس سے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اس تقریر کے خلاف جلسے ہوئے، تجاویز پاس ہوئیں۔ اخبارات نے بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ شعراء نے بھی مذمّت کی۔ چنانچہ اس صف میں مخبر عالم بھی آیا' اس نے اپنے ۸ جولائی ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ایک طنزیہ طویل نظم لارڈ کرزن کے خلاف چھاپی۔ جس کا عنوان تھا "لارڈ کرزن سے جھپٹ"

وہ شب تارمیں تاروں کا فلک پر جھمگٹ ۔۔۔ چھپ گیا آنکھ سے بدلی جو قمر نے کروٹ

دیکھا مشرق میں وہ صبح کا تارا چمکا! ۔۔۔ وہ عروس سحر نور نے الٹ گھونگھٹ

بڑھ کے رضواں نے وہ جنّت کے دریچے کھولے ۔۔۔ آئی وہ گلشن فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اٹھا پیر فلک بانگ لگائی ایسی ۔۔۔ مرغ نے گریۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ

گدگدایا جو نسیم سحری نے آکر ۔۔۔ ناز سے سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ

نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں ۔۔۔ گل کھلے ہیں کہ ہیں پریوں کا چمن میں جھمگٹ

یہ بہار چمنستاں، یہ سحر کا عالم ۔۔۔ ہاں ذرا بادۂ گلرنگ تو لانا جھٹ پٹ

ہاں وہ مے ہو جو مل جائے کہیں تھوڑی سی ۔۔۔ شیر مادر کی طرح شیخ بھی پی لے غٹ غٹ

لیجیے سے کے صراحی مرا ساقی آیا ۔۔۔ جام میں بادۂ گلرنگ دیا اس نے الٹ

اب میں پیتا ہوں لبوں تک مرے ساغر آیا ۔۔۔ ختم مے ہو گئی تو حلق سے اتری تلچھٹ

آگیا جوش طبیعت میں بڑھی گردش خوں ۔۔۔ ڈورے آنکھوں کے ہوئے لال بھری گرماہٹ

نشہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی اب ۔۔۔ جس قدر عقل ہے گدّی میں سب آئی ہے سمٹ

یہ ترنگ آئی ہے ہاں لاٹ گورنر ہوں میں
ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ

لیجئے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

سرخ غصّہ سے کہیں زرد کہیں صدمہ سے
خوف کے مارے کہیں رنگ میں ہے نیلاہٹ

آئے ہیں آپ تو کچھ حضرت کرزن سنئے
آپ گر منھ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منھ پھٹ

آ گیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار
صاف کہتا ہوں نہیں بات میں میری بنوٹ

مانئے گا نہ برا آدمی ہیں آپ شریف
عالم نشّہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ

ہائے کیا آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس
کنووکیشن میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلّاہٹ

گلفشانی کے عوض دور کیا دل کا غبار
خوب پھینکا سر اجباب پہ کوڑا کرکٹ

دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ
خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹکھٹ

گالیاں کس لئے در پردہ سنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر منھ پہ یہ کیسا گھونگھٹ

یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی
توسن طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ

اہل بنگال نے کیا خوب کہا ہے جبلہ
کیا تری فوج مضامیں نے ہے کھایا گھونگھٹ

منھ دکھانا تجھے واجب نہیں کلکتہ میں
اب مناسب ترے رہنے کے لئے ہے پنگھٹ

خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر
پائنیر تک کو نہ خوش آئی تری ژیٹ ژیٹ

کانگریس والے تو کیا خوش نہیں دل میں تجھ سے
دشمن بلکہ علی گڑھ کے پرانے کھوسٹ

بادۂ عیش بہت تو نے اڑایا اب تک
آخری دور میں قسمت میں یہی تھی تلچھٹ

تاج احساں کا اٹھا سر سے ترے چلتے وقت
بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے ڈیوٹ

اب مناسب ہے یہی کیجئے پنجرا خالی
ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجٹ

تو جو جانے پہ ہو راضی تو قسم سر کی ترے
کر کے چندہ تجھے لے دیں گے ولایت کا ٹکٹ

تیرے ہی وقت میں زوروں پہ تھے قحط و طاعون
شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

چیمبرلین سے استاد کا شاگرد ہے تو
یاد ہیں ماں کے مقولے نہ اصول بیچیٹ

یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا
اے سخن ساز زباں ساز فسوں گر نٹکھٹ

پھونک ڈالے تری اسپیچوں کے بنڈل ہم نے
اب کے ہولی میں جلائے نہیں جیسے پنکٹ

یا الٰہی! یہ چلی بادِ مخالف کیسی
آ گیا اڑ کے جو لنڈن سے یہ کوڑا کرکٹ

ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی
آستیں تیرے مقابل ہیں جو لیتے ہیں الٹ

یاد رکھ حشر تک بھی نہ تجھے بھولے گی
گو کھلے کی وہ چپقاش اور وہ جہتا کی ڈپٹ

چل یہاں سے تو ولایت میں خبریں گے تیری
چین سے رات کو سوئے گا نہ تو اک کروٹ

داد خواہوں کا پولس ہے وہیں دربارِ عظیم
پارلیمنٹ میں لکھوائیں گے ہم تیری رپٹ

بچ گیا وہں بھی تو پھر حشر میں ہوگا انصاف
کام آئے گی خدا سے نہ تیری زیٹ زپٹ

تالیاں بیٹھیں گے رسوائی پہ تیری مظلوم
دیدنی ہوگی قیامت میں تیری گھبراہٹ

سوچ انجام کو اک روز ہے سب کو مرنا
ہے نمک خوار ہمارا تو نہ کر ہم سے کپٹ

اب بھی آ ہوش میں انداز حکومت کو بدل
مرد ہو کے تجھے واجب نہیں یہ ترپاہٹ

بیٹھ کرسیِ وزارت پہ سنبھل کر پیارے
آہِ مظلوم نے شاہوں کے دیئے تخت الٹ

اب مرا نشہ اترتا ہے میں ہوتا ہوں خموش
بس ترے واسطے کافی ہے یہی سرٹی فیکٹ

آ گیا ہوش مجھے کھل گئیں آنکھیں لیکن
اب وہ کرزن نظر آتے ہیں نہ وہ ان کا جرٹ

میرے مولا مری بگڑی کے بنانے والے
تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ

بس زباں اب نہ ہو تو معرکہ آرائے سخن
رشک سے مرقد سودا نہ کہیں جائے الٹ

اے عروسِ سخن اللہ رے جوبن تیرا
لٹ صاحب کو بھی بھاتی ہے تری زلف کی لٹ

(مخبر عام ۸ جولائی ۱۹۰۶ء)

نوحۂ قومی

کرتا ہے صاف ظاہر طوفانِ بے تمیزی
اے اہل ملک اپنا ڈوبا ہوا ہے تارا

نااتفاقیوں سے ناگفتہ بہ ہے حالت
دشمن ہوئی محبت اور ہے نفاق پیارا

افسوس کوڑیوں کے مول اس کو کھو دیا ہے
کرتا ہے زر تصدق جس پر جہان سارا

خشکی میں جس کی خاطر بہتی ہیں خوں کی نہریں
پانی میں تشنہ لب ہے مرتا کوئی بچارا

صدہا ہیں ملکی مالی کاموں میں محوِ کوشش
صدہا جہاز رانی پر کرتے ہیں گذارا

کوئی کیے ہوئے ہے صحرا پہ اپنا قبضہ
کوئی سنبھالے بیٹھا ہے صحرا کا کنارا

دیکھنے سوا یہ صورت آتی نظر ہے سارے
پیچھے ہٹا نہ پاؤں بڑھ کر ہے ہاتھ مارا

بحر جہاں میں اپنی ہر طرح آبرو تھی
الیاس سے بھی بڑھ کر اقبال تھا ہمارا

یارب مدد، اسیر گرداب رنج و غم ہیں
بحر جہاں میں اپنا کوئی نہیں سہارا
منجدھار میں ہے کشتی، اور زور پر تلاطم
طوفان کی ترقی اور دور ہے کنارا
اس درجہ ہوئے ہستی میں ہم ہیں بے حقیقت
جس طرح ایک تنکا پھرتا ہو مارا مارا
کیا پھر وہی میسر اقبال ہم کو ہوگا
کیا دستگیر بن کر دے گا ہمیں سہارا
بحر جہاں میں غرقِ حسرت سے ہر گھڑی ہے
فرزند یہ شعر حافظ ورد زباں ہمارا

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

(مخزن عالم ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء)

ایک ناکام مسافرِ لندن کا خیال

ثنا تی خوب ہے بادا کی دولت ہم نے لندن میں
گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں
نظر آیا یہاں پریوں کا مجھ کو جھمگھٹا ایسا
لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں
کبھی گرجا میں جا کر ہم نے جھانکا ماہرویوں کو
کبھی تاک آئے ہم جا کر کسی گلرو کو گلشن میں
کبھی پہونچے جو تھیٹر میں تو چھنوا آئے دل ان سے
ہے جادو جن کی باتوں میں ہے شوخی جن کی چتون میں
کبھی پکنک کے جلسے میں ہوئے شامل تو دن بھر
حمائل ہاتھ تھے سیمیں کی تو تن کی گردن میں
کبھی گھوڑ دوڑ میں جا کر لگائیں بازیاں ہم نے
کہ اس میں جیتنا اور ہارنا داخل ہے فیشن میں
مٹن اور چاپ کٹلٹ کھا کے ہم ہنستے تھے تو اپنے
مگن رہتے ہیں جو دال اور چپاتی اور سالن میں
پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت
بسر ہوتی تھی کیونکر پاجامے اور اچکن میں
خطا آتا تھا جو بادا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا!
تو کہہ دیتے تھے ہم محنت سے خوں بھی خشک ہے تن میں
مگر کب تک گلچھڑے جو ہوتا گنج قاروں بھی
تو ایندھن کے لئے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں
اٹھے جب صبح کو اک دن تو جیبوں میں نہ کچھ پایا
ہوئی خالی بھری تھی جس قدر اسٹیم انجن میں
شراب و مطرب و ساقی چھٹے یک لخت سب ہم سے
سکھایا بے زری نے فلسفہ آخر کو لندن میں

ہوئے جب ہم نشیں پرسانِ حال ان سے کہا ہم نے
میں دامن ہی نہیں رکھتا جو الجھے خار دامن میں

(مخزن عالم مارچ ۱۹۰۵ء)

نیا زمانہ

اے انقلابِ زمانہ نہیں خدا کی قسم
کسی صنم کے تلوّن سے کم ترے انداز

عجیب صیغے میں ڈالا بدل کے تو نے رنگ
رہی نہ طائرِ حکمت کو طاقتِ پرواز

ہم اپنے رنگ میں خوش تھے ہم اپنے حال میں مست
نہ عیب چین تھا کوئی نہ تھا کوئی غمّاز

عبا عمامہ پہنتے تھے جو آبا و اجداد
اسی سے ہم کو توسّل اسی سے ہم کو ساز

ہماری چلتی اگر کچھ تو دوستانِ قدیم
نئے فیشن کو کسی طرح ہم نہ دیتے جواز

مگر نہ چرخ سے راحت نہ اس زمیں پہ قرار
فلک کی طرح سے دنیا ہے عربدہ پرداز

پرانے رستے چلیں گر تو ہیں نئے رہزن
جو پکڑیں راہ نئی تو پرانے ہوں ناساز

سناتے اپنے مقاصد کی کس کو دشواری
نہ کوئی یار تھا اپنا نہ کوئی محرمِ راز

(مخبر عالم ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء)

سودیشی تحریک

ہم نے مانا کہ مناسب ہے سودیشی تحریک
بابو صاحب! مگر اس وقت بہت برہم ہیں

آپ غصّہ سے ہوئے جاتے ہیں نیلے پیلے
دل بھی بے چین ہے آنکھیں بھی ذرا پر نم ہیں

رونا آتا ہے کہ دولت یہ چلی جاتی ہے
غیر کھا جاتے ہیں پر بھوک سے ہم بیدم ہیں

قحط سالی ہمیں گھیرے ہے تو دشمن افلاس
ہم تو مغموم ہیں پر غیر بہت خرّم ہیں

دکھ ہے فاقہ کشی اب ہے نصیبِ اعدا
غیر کھا جاتے ہیں دولت جو کماتے ہم ہیں

صنعتیں سیکھیں سب اپنی ضرورت کے لئے
جس قدر دل ہیں وہ سب غیرتِ جامِ جم ہیں

اپنے آئینہ میں منھ آپ ہی ہم دیکھیں گے
آج سے متفق اللفظ یہی باہم ہیں

کرسیاں ہند سے ہو جائیں روانہ فی الحال
ٹاٹ کے فرش پہ قالین ہیں یا جاجم ہیں

(مخبرِ عالم ۱۳ مارچ ۱۹۰۶ء)

لو کھل گئیں گھٹائیں اب صاف آسماں ہے   وہ زور و شور بیلا طوفان کا کہاں ہے
آئی ہوا موافق تیار بادباں ہے   چپّو چلاؤ یارو گر تم میں کچھ تواں ہے

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

کیسا ہی پُر فضا ہے وہ سامنے کنارا   باغِ عدن کھلا ہے جنّت ہے آشکارا
طوفاں سے بچ گئے ہو ہمّت کرو دوبارا   جاں لے گئے سلامت دل کو گرا بھارا

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

بے فکر کیوں پڑے ہو کچھ ہاتھ بھی ہلاؤ   گرداب سے نکل کر چاہو مزے اڑاؤ
ساحل بھی سامنے ہے پھر بھی نہ ہو بچاؤ   غیرت ہے اپنی ہستی گر اس طرح مٹاؤ

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

ڈوبے اگر یہاں تم یہ لوگ کیا کہیں گے   ہاں تم کو ننگِ غیرت سب برملا کہیں گے
ناکارہ سست ہمّت گذرا گیا کہیں گے   اس سے بھی بڑھ کے شاید تم کو برا کہیں گے

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

غفلت سے باز آؤ فرصت ہے کوئی دم کی   ایسا نہ ہو کہ دیکھو پھر راہ سب عدم کی
چھا جائیں ہو کے سر پہ طوفاں گھٹائیں غم کی   گر جائے آسماں سے بجلی کوئی ستم کی

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

کشتی بھنور سے نکلے کوشش سے گر تمہاری   خوش ہو کے خلق دے گی شاباش تم کو ساری
اپنی ہی جاں بچے گی عزّت بھی ہو گی بھاری   درکار ہے دلیرو! اک دم کی ہوشیاری

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

ہمّت کرو جوانو، ہمّت کے آسمانو!   گر کچھ دلاوری ہے، دکھلاؤ پہلوانو
ہاں جوشِ نوجوانی ظاہر کرو جوانو!   زور آزماؤ دیرو، میدان کے یگانو

ہمّت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

کشتی جو قوم کی ہے منجدھار میں پھنسی ہے   کشتی سوار حیراں حسرت سے بے کسی ہے
مایوس ہو رہے ہیں اور دل کبیدگی ہے   ہے آسرا خدا کا امید اک یہی ہے

ہمت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

کامِ نہنگ طاعون چاروں طرف کھلا ہے   منڈلا رہی پھرتی ہر سو افلاس کی بلا ہے
غفلت کی کالی کالی چھائی ہوئی گھٹا ہے   بہرے اگر نہیں ہو، محشر دم کی صدا ہے

ہمت کرو جوانو، کشتی بھنور سے نکلے

(مخزن عالم ۱۱ جولائی ۱۹۰۲ء)

ساغرِ اندوہ

حالِ وطن کو دیکھ کر کون نہ اشکبار ہے — جامۂ صبر غیر بھی درد سے تار تار ہے

جلوۂ موجِ گل کہاں کچھ تو زباں سے کہہ چمن — بلبلِ خانہ خراب سخت جگر فگار ہے

ہم سے تمیزِ نیک و بد یک قلم اٹھ گئی ہے آہ — دشت جو دیکھتے ہو تم قوم کا مرغزار ہے

بلبل و گل بہم دگر برسرِ ترک تاز ہیں — اب کہ چمن میں ہائے ہائے گریہ کناں بہار ہے

رازِ نشاط کی کلید ہاتھ نہ آئے گی کبھی — سینہ و دل پہ گر یونہی سایۂ غمگن غبار ہے

چشم زدن میں آسماں جور و ستم سے باز آئے — جہدِ حیات میں اگر ہمتِ استوار ہے

کاش یہ تجھ سے بن پڑے ہند میں پھر تو دیکھنا — پھول سا نجم کام بخش سر پہ ترے نثار ہے

اہلِ کنشت ہو گئے درپئے جیشِ مصطفےٰ — یہ بھی خدا کی شان ہے قدرتِ کردگار ہے

غیر کے ہاتھ سے گئے مایۂ نازشش شکوہ — ہم سے جہاں میں آج کون بڑھ کے ذلیل و خوار ہے

لذتِ خواب نے مجھے مست کیا ہے ساقیا — اب تو شرابِ ناب بھی جرعۂ ناگوار ہے

بانگِ نویدِ عید سے سیرِ چمن کی دھوم ہے — قوم کو خود خزاں ہو جب دیدِ بہار خار ہے

کیوں نہ ہوں ناشکیب ہم قفلِ زباں نہ وا ہو کیوں
فطرتِ سست تجھ کو بھی جب کہ وہی خمار ہے

(مخبر عام ۸ مئی ۱۹۰۷ء)

مخالفینِ پردہ سے ایک پردہ نشین کی فریاد

میں رہبر ہوں پردے کی رہزن نہیں ہوں — ستمگارِ بے باک پردہ فگن نہیں ہوں میں

ہوں مردوں سے دو چار وہ زن نہیں ہوں — میں خوبانِ یورپ کا فیشن نہیں ہوں

حسینانِ لندن کا جوبن نہیں ہوں

میں تہذیبِ مغرب کی سالگن نہیں ہوں — کسی میم کی میں پڑوسن نہیں ہوں

ہوا خواہِ خوبانِ لندن نہیں ہوں — میں بھوری سی زلفِ فرنگن نہیں ہوں

ولایت کے چہروں کا روغن نہیں ہوں

نہ پتلی کمر ہے نہ اس میں لچک ہے | نہ رخسار پر ناز پرور جھلک ہے
نہ سایہ نہ پوشاک نوق ابھڑک ہے | مری چاشنی میرے پردے تلک ہے

مجھے تیر چکھیں وہ کھرچن نہیں ہوں

حسینوں کے جھمگٹ، جوانوں کی چہل پہل | ولایت کے بسکٹ، برانڈی کی بوتل
رہوں کورٹ شپ کی تمنا میں بے کل | میسر ہو کس طرح وہ لطفِ ہوٹل

میں دمساز لیڈریز پڑ فن نہیں ہوں

جوانوں کا سودا نہیں میرے سر میں | کہ ڈالے کوئی ہاتھ میری کمر میں
میں رہتی نہیں ہر کسی کی نظر میں | مری گڑیاں وقف ہیں یک گھر میں

تڑپتی ہوئی برق خرمن نہیں ہوں

زمانے کی بے پردگی کا گلا ہے | زمانہ اسی فکر میں مبتلا ہے
مگر مجھ کو عصمت کا حصہ ملا ہے | گلِ آرزو میرا گھر میں کھلا ہے

کھلاؤں کوئی گل تو مالن نہیں ہوں

یہ شیوے ہیں یورپ کے زندہ دلوں کے | کہ مردوں میں جھمگٹ رہیں عورتوں کے
نظر میں ہیں سارے مزے ہوٹلوں کے | سمجھتی ہوں معنے ہوا خوریوں کے

مگر اے خدا میں فرنگن نہیں ہوں

سنور کر نکلنا نہیں میرا شیوہ | طریقہ نہیں جانتی دلبری کا
کسی کو کروں گی میں کیا اپنا شیدا | بناؤں گی کیونکر پہاڑوں میں بنگلا

کسی مست لیڈی کی سوتن نہیں ہوں

سمائی ہے کیا جی میں آخر کہو تو | بہو بیٹیاں گھر سے باہر نکالو
جنوں ہو گیا ہے کہ سودا ہے تم کو | مخالف تو ہو میرے پردے کے لوگو

مگر کیا کروں میں فرنگن نہیں ہوں

نہ میں دلربا ہوں نہ میں نازنیں ہوں | نہ غیرت دہ حسنِ خوبانِ چیں ہوں
حسیں ہوں مگر میں فرنگن نہیں ہوں | شریفوں کی بیٹی ہوں پردہ نشیں ہوں

خدا سے ڈرو کوئی کسبن نہیں ہوں

(مخبر عالم ۴ جون ۱۹۰۹ء)

حُبِّ وطن

اے نسیمِ صبح اے پیکِ وفادارِ وطن
ہو اگر تیرا گذر سوئے چمن، زارِ وطن

ان سے کہنا مری جانب سے بصد اظہارِ شوق
ساتھ میں کھیلا کئے برسوں جو غمخوارِ وطن

بار ہا کرتے ہیں شب بھر دیدہ اختر شمار
بڑھ گیا ہے آہ حد سے شوقِ دیدارِ وطن

رحم اے صحرا نوردی رخصت اے جوشِ جنوں
پاؤں کے چھالوں کو ہے پھر حسرتِ خارِ وطن

تھے عجب حیرت فزائے شوق وہ لیل و نہار
دیدۂ دل آہ تھے جب آئینہ دارِ وطن

دن کو گلگشتِ چمن کے وہ مزے یاروں کے ساتھ
چاندنی میں شب کو لطفِ سیرِ کہسارِ وطن

وہ فضائے لالہ رنگیں ادا وہ جوشِ گل
اور وہ پھولے پھلے سر سبز اشجارِ وطن

(مخزنِ عالم ۱۳ راگست ۱۹۰۹ء)

زمانۂ حال کا رنگ

پہلی سی زمانے میں کوئی بات نہیں اب
الفت وہ مروّت وہ مدارات نہیں اب

یک بارگی بدلی ہیں زمانے کی ہوائیں
افسوس ہے کچھ لطفِ ملاقات نہیں اب

بدلا نئی تہذیب نے ہر چیز کا نقشہ
پہلی سی بناوٹ کے مکانات نہیں اب

بے پردگیاں لطف دکھاتی ہیں نرالا
فریاد ہے وہ عصمتِ عورات نہیں اب

درویشوں میں باقی نہیں وہ شانِ فقیری
پیروں میں بھی وہ کشف و کرامات نہیں اب

یا مجلسِ میلاد ہو یا جلسۂ افطار
دونوں میں کوئی لطفِ عبادات نہیں اب

باقی نہیں اب بے غرضانہ وہ ملاقات
وہ گفتگو و حرف و حکایات نہیں اب

(مخزنِ عالم ۲۳ راگست ۱۹۱۰ء)

ہندو مسلم منافرت

آج کل ہندو مسلمانوں میں کیسا جوش ہے
بھوک سے بے دم ہیں لیکن دشمنی کا ہوش ہے

ان کی نا چاقی سے چاقو لگ گیا دل پر مرے
کیا کہوں اے دوست تو زخمی مری آغوش ہے

کیوں لڑے مرتے ہیں باہم کیوں ہے ایسی لاگ ڈانٹ
کیا خطا ہے ایک کی کیا دوسرے کا دوش ہے

رات دن چلتی ہیں تلواروں پہ تلواریں یہ ہم
ہے طپنچہ ہاتھ میں بندوق زیب دوش ہے

مادرِ ہندوستاں کے بیٹے ہیں سب اہلِ ہند
لالہ ہے یا شیخ ہے یا بوس ہے یا گھوش ہے

اک جگہ رہتے ہیں جیتے مرتے ہیں سب اک جگہ
اس میں سب شامل ہیں یکساں نیش ہے یا نوش ہے

دل ہے پہلو میں تو اس میں درد بھی پیدا کرو
بار ہمدردی اٹھاؤ تم جو سر ہے دوش ہے

دیکھ لو سُن لو، ترقی کے فسانے غور سے
ورنہ یہ بے فائدہ ہستی چشم و گوش ہے

(مخزن عام ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

تقلیدِ بے جا

ہنر کانِ شرافت کا ہے جوہر
ہنر دریائے عزت کا ہے گوہر

نہیں کچھ اعتبارِ دولت و مال
کوئی دولت نہیں ہے اس سے بڑھ کر

مگر اس کا نہیں ہرگز یہ مطلب
کہ بدلیں وضع ہم اپنی سراسر

بباسِ عزت و غیرت کریں چاک
پہن کر کوٹ بیٹھیں جامہ سے باہر

چرٹ منھ میں رہے اور پاؤں میں بوٹ
عوض دستار کے ہلمٹ ہے سر پر

گرفتارِ مخ ہو دست و گردن
مگر نکٹی بھی ہو، کف ہو اور کالر

ہو حاصل ہم کو ایسی بد دماغی
ملیں ہم عطر کے بدلے لونڈر

بھلا دیں ہم بزرگوں کے سب القاب
پکاریں باپ کو کہہ کر ڈیئر سر

کوئی ٹے کر کے پھیرے گر میم کوٹ تھ
نکالیں ہم بھی گھر والی کو باہر

کھلے بالوں رہے وہ بال میں ساتھ
اتاریں بیبیوں کے سر سے چادر

رہیں پردہ دری کی کوششوں میں
محبِّ قوم ہم در پردہ بن کر

کریں تقلید میں بند اپنی آنکھیں — نظر رکھیں نہ کچھ نفع و ضرر پر
کہ تا ہم کو بھی "جنٹلمین" کہیں لوگ — ہوں ہم یورپ کے لوگوں کے برابر
ہوئے کالے تموزِ مہر سے ہم — نہ ہوں گورے لگا کر منھ کو پوڈر
ہیں بہروپیا وہ جاتے ہیں — بنائیں رنگ روپ ان کا سا بھی گر
نہیں تقلید کورانہ مناسب — کرے ہر کام کو انسان سمجھ کر

نہ بگڑے جس میں اپنا دین و آئین
وہی تقلید ہے اے لمعہ بہتر

(مخبر عالم ۸ فروری ۱۹ء)

دُنیا ساز فقیر

بہت سے راہزنی کر رہے ہیں بن کے پیر — غریب قوم کو ہیں مارتے یہ شاہ مدار
لیا ہے معتقدوں کی نجات کا ٹھیکہ — کہ گویا ہیں یہی باغِ جناں کے ٹھیکیدار
ہزار دانے کی تسبیح، گیروا کپڑے — یہی ہیں ان میں علاماتِ اولیائے کبار
کسی سے نقد، کہیں جنس اور کہیں دعوت — جو بس چلے تو نچوڑیں مرید کا گھربار
یہ مومنوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں — فتوح عیب رکھیں اس کا نام یا ورداد
کریں جو ذکر تو پھر ایسی بولیاں بولیں — کہ شب کو چونک پڑیں ساکنانِ قربِ جوار
جو دعوت ان کی کریں معتقد تو ہے واجب — کہ ان کے کھانے کو ہو شوربا بھی چھلّے دار
اگر ہیں یاد تصوّف کی اصطلاحیں چند — تو پہنچا عرشِ معلّٰی پہ گوشۂ دستار
یہی ہیں آج ابوالوقت اور قطبِ زماں — یہی ہیں شیخ شیوخ اور زاہد و احرار
ملا جو گانجے کا پورا کوئی ارادت مند — تو نقدِ وقت ہیں شغل و وظیفہ و اذکار
کبھی جو عالمِ رؤیا میں دیکھ لی بیری — مقامِ سدرہ کو طے کر چکے زہے پندار

اگر ہیں شرع پہ قائم تو ہیں جنیدِ زماں
جو بھنگ نوش ہے کوئی تو ہے قلندر دار

(مخبر عالم ۵ فروری ۱۹۱۱ء)

فقیری صدا

طرابلس میں ہوئی لڑائی دے اللہ کے نام
اسلام پھنسا زنغے میں مائی دے اللہ کے نام

دین کی عزت رکھ لے مائی دے اللہ کے نام
اسلام بچا مٹنے سے مائی دے اللہ کے نام

قرآن میں ہے یہ آیت مائی دے اللہ کے نام
وماینفقون پڑھ مائی دے اللہ کے نام

دین پہ مر کر سر کٹوا کر بچے ہم پہ چھوڑے ہیں
صدقہ اپنے لال کا مائی دے اللہ کے نام

اللہ نے ان بچوں کا ہم سب کو ولی بنایا ہے
بچا کھچا جو کچھ ہو مائی دے اللہ کے نام

بچوں کا اپنے صدقہ کچھ راہِ خدا میں بھی دے ڈال
بہت دیا دنیا کو مائی دے اللہ کے نام

پوت ترا ہو صاحبِ دولت، عالم فاضل ہو
پروان چڑھے ترا لال مائی دے اللہ کے نام

انور بدل کر بھیس فقیری مانگنے آیا ہے در پر
رحم کر ان بچوں پہ مائی دے اللہ کے نام

(مخبر عالم ۵ جنوری ۱۹۱۲ء)

نئی روشنی

کیا نئی روشن خیالی ہے کہ جل اٹھے کنول
مغربی تہذیب کرتی جاتی ہے اپنا عمل

اب کہاں ہے جبہ، اچکن اور چپکن کا خیال.
شیروانی کوٹ میں بیٹھے ہیں سب اہل دول

شملہ و دستار، عمامہ کی عزت کچھ نہیں
فلٹ کیپ اور ترکی ٹوپی کا پھلا پھولا کنول

پائجامے چوڑیاں اور وہ گھٹنے چوڑی دار
کھو کے سب پتلون نے اپنا دکھایا زور بل

گھیتلی جوتی پہننے والا اب کوئی نہیں
بوٹ ڈاسن نے بنائے گر پڑے سب منہ کے بل

چھوڑ بیٹھے سب کے سب جب مشرقی طرز لباس
مغربی طرز تکلم نے کیا ہم پر عمل

قبلہ گاہی مہربان و مشفق و لختِ جگر
اٹھ گئے القاب سب مائی ڈیئر ہے آج کل

(مخبر عالم یکم جون ۱۹۱۲ء)

شکر ہے احسان ہے منت گذاری ہو چکی
اب عنایت کے عوض ہے تھینک یو سر کا بدل

موم کی بتی چراغ اور شمع گل ہونے لگی
روشنی نے گیس کی گل کر دیئے ہیں سب کنول

دعوتوں کا نام تک ینا نہیں کوئی کہیں، گارڈن پارٹی اور ہے ڈنر ضرب المثل
مشرقی اشجار پیچھے کو کھسکتے جاتے ہیں مغربی تہذیب کے اشجار میں آئے ہیں پھل
ملّت و مذہب پہ بھی ہونے لگا اب ہاتھ صاف فلسفہ نے دوزخ و جنّت میں ڈالا ہے خلل
ہندو اب ہندو مسلماں مسلماں اب نہیں پڑ گیا ہے آج کل دونوں کے ایماں میں خلل

نے غلط گفتم سخن، ایں طرزِ گفتارِ من است
آنچہ فخرِ دیگراں باشد بہ آں عارِ من است

محمد سالم ۱۵ر جولائی ۱۹۱۷ء

ہندوستانی دیہاتی عورتیں

کہا جولیا نے یہ بدرالنساء سے کہ موجودہ تہذیب سے تم ہو عاری
نیا کوئی انداز تم میں نہیں ہے پرانی ہیں ساری ادائیں تمہاری
سمجھتی ہو زیور کو زینت کا ساماں خوشی سے اٹھاتی ہو یہ بوجھ بھاری
بناوٹ سے تم چاہتی ہو چمکنا لگاتی ہو کپڑوں پہ گوٹا کناری
یہ سب کام باہر ہیں شائستگی سے نشانِ جہالت ہیں باتیں یہ ساری
سلیقہ نہیں بات کرنے کا تم کو سرِ بزم حاصل ہو کیونکر نہ خواری
لڑائی میں بڑھ کر ہو بھٹیاریوں سے چلاتی ہو بے ڈھب چھری اور کٹاری
کبھی گھاؤ بھرتا نہیں ہے زباں کا کہ خنجر سے بھی زخم اس کا ہے کاری
نہیں تم میں مغرب کا کوئی قرینہ نئی روشنی میں چلن ہے گنواری
ہو پردے کے زنداں میں تم مقیّد تمہارا نہیں کوئی فعل اختیاری
مصیبت سے دن کاٹتی ہو جہاں میں یہ جینا ہے یا نزع کی دم شماری
رہا کرتی ہو قید گھر میں ہمیشہ نہ سیر و سیاحت نہ شوقِ سواری
تمہیں اس سے کیا تم اسیرِ قفس ہو چلے باغ میں لاکھ بادِ بہاری
تمہیں جیتے جی مار رکھا ہے اس نے پڑے بھاڑ چولہے میں یہ وضعداری

کہا سن کے بی بی نے اے میم صاحب ... بس اب چپ رہو آئی ہے میری باری
نئی روشنی کے نئے گیت گائے ... بہت تم نے بڑھ بڑھ کے شیخی بگھاری
تماشا تو دیکھو کہ پردہ اٹھا کر ... بنی پھرتی ہے میم میری بچاری
نظر پڑتی ہے غیر لوگوں کی ہر دم ... تمہارا یہ چہرہ ہے یا چاند ماری
کیا کرتی ہو غیر مردوں سے باتیں ... پھٹکتی نہیں پاس تک شرمساری
ہوئی ڈولی اور بند گاڑی سے نفرت ... بڑی طرح برباد ہے خانہ داری
نہ اتراؤ میموں کا سایہ پہن کر ... کہ صورت ہے کالی کلوٹی تمہاری
چلا ہنس کی چال اپنی ہی بھولا ... نہ کام آئی کوے کی کچھ ہوشیاری
خطابوں کی شیدا ہوئیں عورتیں بھی ... بیاہی مس ہے تو مس ہے کنواری
ترقی کرو علم و شائستگی میں ... نہ چھوڑو مگر اپنی تم وضعداری
اسے کہتے ہیں لوگ تقلیدِ بے جا ... بناوٹ ہے یہ سادگی بھی تمہاری
کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا ... حکومت کا میموں کی سکّہ ہے جاری
ہے زیبا انھیں کے لئے بے حجابی ... ہے شایاں ہمارے لئے پردہ داری

مبارک انھیں مغربی پورٹ منٹو
ہمیں ایشیا کی پرانی پٹاری

(مخبرِ عالم ۱۵ر اگست ۱۹۱۲ء)

ہنگامۂ بلقان

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک ... چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے ... فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے ... کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے ... اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے ... یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ خستہ جاں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو ... یہ ظلم آرائیاں کب تک یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ... ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گرتم نے نہیں دیکھی — تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں فشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوّبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں

کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

(مخبرِ عالم ۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

ہندوستانی تنزّل

گئی ہاتھ سے جب تجارت ہماری — تو کیوں کر ہو دنیا میں عزّت ہماری

ہر اک سیکھتا تھا ہمیں سے ہر اک فن — جہاں میں تھی مشہور حکمت ہماری

نہ تھا کوئی دنیا میں ثانی کسی کا — وہ ضرب المثل تھی عدالت ہماری

بہت علم و فن میں تھا شہرہ ہمارا — ہر اک جانتا تھا لیاقت ہماری

زراعت سے کھانا ہمیں مل رہا تھا — کھلاتی تھی روٹی زراعت ہماری

مقابل نہ تھا کوئی دنیا میں اپنا — مٹا دیتی تھی سب کو جرأت ہماری

ہم آپس میں اک دوسرے کے تھے بھائی — نہ رکتی تھی دنیا میں حاجت ہماری

وہ صنعت، وہ حرفت، وہ عِلمی لیاقت

گئی ہم سے طرزِ شرافت ہماری

(مخبرِ عالم ۵ر جون ۱۹۱۴ء)

ہمارا ہندوستان

تھا کل جہاں سے برتر ہندوستاں ہمارا — کرتے ادب تھے آکر اہلِ جہاں ہمارا

شہرت تھی شش جہت میں پھیلی ہوئی ہماری — معمور مال و زر سے تھا ہر مکاں ہمارا

علم و ہنر کا منبع، لعل و گہر کا مخزن — مشہور چار سو تھا جنّت نشاں ہمارا

قابض ہوئے کچھ ایسے آکر غرور و نخوت — لوٹا جنہوں نے مل کر کل خانماں ہمارا

یا تھے وہ عیش کے دن یا اب کے رنج و غم ہے — فاقوں سے مر رہا ہے ہر اک جواں ہمارا

جب رزق کی کمی ہو کیوں کر بدن قوی ہو | بچہ ہو کس طرح سے پھر پہلوان ہمارا

مائل ہوں سوئے صنعت اہلِ وطن تو پھر ہو
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(مخزن عالم یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء)

قومی حالت

قوم سے لطف و حمایت کا نشاں جاتا رہا | قوم کی بہبودگی کا اب نشان جاتا رہا
کرتے ہیں جائے ترحم سختیاں نادار پر | ہائے وہ وقتِ ترقی اب کہاں جاتا رہا
بدگمانی نے دلوں پر اپنا سکہ کر دیا | دوستوں کو اعتبارِ دوستاں جاتا رہا
بادۂ غفلت میں ہے مخمور اس درجہ کہ قوم | کچھ خبر اس کو نہیں کیا اور کہاں جاتا رہا
آج وہ دن ہے تنزل اپنے میں پاتے ہیں خود | ہائے وہ وقتِ ترقی اب کہاں جاتا رہا

ڈگری ایم اے کی بھی حاصل کر کے چین آتا نہیں
دین کی تعلیم کا دل سے گماں جاتا رہا

(مخزن عالم ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

علمی، ادبی اور فنّی شخصیتیں

محبر عالم مراد آباد کے مختلف پرچوں میں وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور اہل قلم اور ادیبوں و سیاسی شخصیتوں کے حالات زندگی خاص طور پر اس وقت شائع ہوتے تھے جب وہ فوت ہو جاتے تھے۔ ان کے وہ حالات جو ان پرچوں میں شائع ہوئے ہیں یقیناً قیمتی معلومات رکھتے ہیں' اس لئے ان کو اس کتاب میں نقل کیا جا رہا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

افسوس کہ جناب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی، ایڈیٹر اڈی او ایل، پنجاب نے چند روز نامراد مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۳ رمئی ۱۹۱۲ء کی رات کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ مولانا مرحوم فارسی عربی کے ایک جلیل القدر فاضل اور زبان اردو کے لاثانی زبردست ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی میں بھی مہارت اور علوم قدیمہ اور جدیدہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور ابتدائے سن تمیز سے اپنا وقت ہمیشہ علوم و ابنائے جنس کی خدمت و اعانت میں صرف کرتے تھے۔ مولانا نذیر احمد نے گو قدیم دارالسلطنت دہلی میں ہوش سنبھالا اور پوری زندگی یہیں گذاری اور دہلی کالج میں اس زمانے کے موافق علی درجے کی تعلیم پائی' اور اب آپ کا جسم بھی وہیں پیوند خاک ہوا۔ لیکن آپ کا آبائی وطن ضلع بجنور ہے جہاں موضع بہرہڑ میں آپ کے ننہال کے کچھ لوگ اس وقت تک موجود ہیں۔ مولانا کی ولادت ستمبر ۱۸۳۱ء میں ہوئی۔ آپ کا شجرہ نسب شاہ عبدالغفور، اعظم پوری تک پہونچتا ہے۔ شاہ عبدالغفور کی نسبت شاہ عبدالحق صاحب نے تذکرۃ اولیاء میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہی کے خلفاء میں سے ایک بڑے باکرامت بزرگ تھے۔ اعظم پور ضلع بجنور ہی کا ایک موضع ہے اور وہاں سے خاص بجنور کو آپ کے نقل مکان کرنے کی یہ وجہ ہوئی کہ قاضی عبدالغنی بجنوری نے

اپنی اکلوتی بیٹی کی حضرت شاہ عالم سے شادی کر دی تھی۔ اور اپنے نواسے شیخ ابو الفضل کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ چونکہ شیخ ابو الفضل پیری مریدی کیا کرتے تھے اسی وجہ سے وہ خود پیر فضل اور ان کے بیٹے پیرزادے کہلائے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے نانا قاضی غلام شاہ بڑے آسودہ حال اور خوش گزران تھے اور مولوی سعادت علی کو موضع ریہڑ میں خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ قاضی غلام شاہ کے بعد جائیداد کے اوپر خاندان میں نزاع ہو گیا اور مولوی نذیر احمد صاحب کے والد کو پھر بجنور آنا پڑا۔ اگرچہ مولانا کی ددھیال میں سلطنت دہلی کی طرف سے بڑی بڑی معافیاں تھیں۔ مگر وہ سب ۱۸۳۴ء کے آئین نمبر کی رو سے ضبط ہو گئیں۔ مولوی صاحب اپنے والد کے مجھلے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی اپنے والد ہی سے جو اوسط درجہ کی استعداد رکھتے تھے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور جنہیں مولوی صاحب کے خاندان سے خاص الفت تھی مولوی صاحب کو تعلیم دینے لگے۔ مولوی نصر اللہ صاحب بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہوتے پر بھی وہ انھیں کے ساتھ رہے مگر ابھی تعلیم پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ان کے والد نے انھیں دہلی بلا لیا۔ یہاں جن مولوی صاحب کے درس میں یہ شامل ہوتے وہ انھیں زیادہ تر گھر کے کام کاج میں لگائے رکھتے تھے وہ بہت مفلسی میں زندگی گذار رہے تھے۔ اس لئے عمر کا تنا حصہ مفت ضائع ہوا۔ اور مجبوراً دہلی سے اورینٹل کالج میں داخل ہونا پڑا۔ ان کو علم و ادب سے خاص مناسبت تھی۔ کالج میں انھیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے پڑھنے لکھنے کی طرف خاص توجہ لی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور سر رچرڈ ٹمپل نے گجرات میں سلسلۂ تعلیم قائم کرنے کے لئے جن چھ لوگوں کو منتخب کیا تھا ان میں ایک مولوی نذیر احمد صاحب بھی تھے۔ یہاں سے ایک سو روپے کی تنخواہ پر آپ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے اور کان پور چلے گئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں آپ نے کچھ انگریزوں کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں آپ انعامات سے سرفراز کئے گئے۔ اس کے بعد الہ آباد میں انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کا شوق پیدا ہوا اور ذاتی محنت سے خوب ترقی کی۔ اگرچہ اس وقت انگریزی استعداد بہت زیادہ نہ تھی مگر چونکہ افسران کو ان کی جانب حسن ظن تھا اس لئے ترجمہ تعزیرات ہند میں انھیں بھی شریک کر دیا گیا۔ انھوں نے اس کام کو ایسی خوبی سے انجام دیا کہ بطور انعام ایک قیمتی گھڑی حاصل کرنے کے علاوہ ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہو گئے۔ اول تحصیلدار ہوئے اور اس زمانہ میں ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کر کے ڈپٹی کلکٹری کے

عہدہ پر پہونچ گئے۔ بورڈ آف ریونیو کے حکم سے قانون انکم ٹیکس اور قانون اسٹامپ کا بھی ترجمہ کیا۔ ملازمت کے زمانہ سے تصنیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور اپنی اولاد کی تعلیم انھوں نے اپنی ہی تصانیف سے شروع کی۔ متعدد کتابوں پر آپ کو گورنمنٹ سے بیش قیمت انعامات ملے اور ملک میں ان کو ایسی مقبولیت و ہر دل عزیزی حاصل ہوئی جس کی مثال بہت ہی کم ملتی ہے۔ آپ کی تصنیف کردہ بڑی بڑی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ تعلیم امور خانہ داری، مرات العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، علم ہیئت، منطق مبادی الحکمت، سموات (یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں) صرف بینگلی، صرف نصائح، چند پند، اخلاق صرف فارسی صرف صغیر، قبح کثرت ازدواج محصنات، قباحج و منح انگریزی، ابن الوقت، تطبیق فطرت الاسلام، قواعد املا و رسم، تحفظ مسلمانوں کی تباہی کا مرثیہ، اتمام حجت، منتخب الحکایات، رویائے صادقہ اور علاوہ ازیں حقوق و الفرائض امہات الامۃ وغیرہ۔ آخری کتاب پادری شائق کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں تھی۔ مگر خود مولانائے مرحوم کی طرف سے اس میں بعض ایسی آراء کا اظہار کیا گیا کہ دیگر علماء کو وجہ شکایت و اختلاف پیدا ہوئی اور ان کی حجت و اصرار پر آخر کار مولانا مرحوم نے کتاب مذکور کی ساری جلدیں علماء دہلی کے حوالے کر دیں جو شاید تلف کر ڈالی گئیں۔ ان کتابوں کے علاوہ مولوی نذیر احمد صاحب کا بامحاورہ اردو ترجمہ قرآن مجید بے حد مقبول ہوا۔ اور اس کے مختلف سائز مختلف ہدیوں پر متعدد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ یہ احسان مولانا مرحوم کا زبان اردو کے علاوہ مسلمانانِ ہندوستان کی موجودہ و آئندہ نسلوں پر اتنا بڑا ہے کہ جس کے شکریہ سے وہ کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ سرکاری ملازمت کے زمانے میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں پر بڑی نیک نامی حاصل کرنے کے بعد مولوی نذیر احمد صاحب سرسالار جنگ کے آخری زمانے میں ریاستِ حیدرآباد بھی گئے اور وہاں تعلقہ داری و صوبہ داری کمشنری کے منصب تک آپ نے ترقی فرمائی اور آخر میں حسنِ خدمت کا وظیفہ لے کر ریٹائر ہوئے جو آپ کو مرتے دم تک ملتا رہا۔

(مخبر عالم مراد آباد ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء)

منشی ذکاءاللہ دہلوی

شمس العلماء منشی محمد ذکاءاللہ دہلوی نے ایک عرصہ کی علالت کے بعد دہلی میں انتقال فرمایا۔ جو ایک مشہور و معروف مصنف و ادیب تھے۔ اردو زبان پر باعتبار تصانیف آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ منشی صاحب دہلی کالج کے ان تین طلبہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب، مولانا محمد حسین آزاد، اور خود تین میں سے ایک تھے جنہوں نے لٹریری خدمات میں بڑا نام پایا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء بنائے گئے۔ منشی صاحب کو اپنے دو ہم عصروں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ آپ کو خان بہادر کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں منشی صاحب کے معاصرین میں سے اردو میں کوئی بھی سبقت نہ لے جا سکا۔ اور اس سے پہلے بھی یقیناً اس زبان میں کوئی ایسا کثیر التصانیف شخص نہیں گذرا۔ یوں تو آپ نے ہر علم و فن پر کتابیں لکھیں۔ زیادہ تر اخلاق، ریاضی اور تاریخ کی کتابیں آپ کی آبیاری سے سرسبز و شاداب ہوئیں اور اردو تعلیم یافتہ لوگوں کی کئی نسلوں نے ان سے فیض اٹھایا۔ منشی صاحب سرسید کے اعوان و انصار میں تھے اور تعلیم کی اشاعت میں عمر بھر سرگرم کوشش میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ آخری خدمت انہوں نے ۱۹۰۵ء میں معلمین مدارس اسلامیہ کے جلسہ علی گڑھ میں صدارت فرما کر انجام دی۔ اور باوجود اپنے روشن خیال ہونے کے عادات و اخلاق میں پرانے مسلمانوں کے بزرگوں کا ایک نمونہ تھے اور ہر عمر و ہر مذاق کا شخص آپ کا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سیاحت کا بھی آپ کو اچھا موقعہ ملا۔ شمالی ہند کے اکثر شہروں میں آپ تشریف لے گئے جس سے آپ کے تجربہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا اور جس سے دوسروں کو بے حد نفع پہونچا۔

منشی صاحب ۱۰ سال کی عمر میں دہلی کالج کے صیغہ مشرقی علوم و فنون میں داخل ہوئے چونکہ اس زمانے میں لوگ تعلیم کی طرف کم متوجہ ہوتے تھے اس لئے اس زمانے کی نسبت اس وقت افسرانِ محکمہ تعلیم طلبہ کا حوصلہ بڑھانے کے لئے زیادہ انعام دیا کرتے تھے اور منشی صاحب بوجہ اپنی ذہانت کے ان وظائف کا بہت سا حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ اثنائے تعلیم میں علاوہ متعدد وظائف کے دو تمغے بھی حاصل کئے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں منشی صاحب دہلی کالج میں علوم ریاضیہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ آگرہ کالج میں بھی کچھ عرصہ اردو لٹریچر کی تعلیم دی

سات سال معلّمی کی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۸۵۸ء میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر ہو کر گیارہ سال تک بلند شہر وغیرہ میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں تعلیم نسواں کی خدمات کے صلہ میں آپ کو گورنمنٹ نے ایک خلعت مرحمت فرمایا۔ ۱۸۶۹ء میں نارمل سکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے تھے۔ تین سال اس عہدہ پر رہ کر اورنٹیل کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے لیکن اس عہدہ کا چارج لینے سے پیشتر ہی حیدرآباد کے سرکاری کالج میں ورنیکولر سائنس اینڈ لٹریچر کی پروفیسری پر مامور کیے گئے اور انٹرنس سے لے کر ایم اے کلاس تک عربی و فارسی پڑھانے کا کام سپرد کیا گیا۔ اس عہدے پر منشی صاحب ۱۸۷۲ء سے ۱۸۸۷ء تک یعنی پندرہ سال مامور رہے اور آخری سال اپنی خوشی سے پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے اور ۳ سال تک پنشن لینے کے بعد ابھی چند یوم ہوئے انتقال فرما گئے۔

منشی صاحب نے ملازمت کے ۳۰ سال پنجاب اور آگرہ میں گذارے لیکن آپ کی زندگی کا اہم کام ملازمت نہیں بلکہ تصنیف و تالیف ہے جس کے آپ اردو مصنّفین میں پیش خیمہ تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں آپ کو ترجمہ، تصنیف اور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۸۹ء تک مختلف اخباروں رسالوں میں صدہا مضامین لکھے۔ لیکن کسر نفسی کو دیکھیے کہ اس کے ساتھ اپنا نام کبھی نہ لکھا لیکن جن مضامین کے ساتھ آپ کا نام شائع ہوا وہ ایڈیٹر اخبار و رسالہ کی طرف سے اضافہ سمجھو، جس سے اخبارات و رسالوں کی عزّت افزائی مقصود تھی آپ کی مولّفہ اور مصنّفہ کتب عام مقبولیت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔" (مخبر عالم یکم دسمبر ۱۸۹۰ء)

مولوی عزیز مرزا دہلوی

یہ خبر ملک کے لٹریری حلقوں میں عموماً اور شمالی ہند میں خصوصاً کمال حسرت و اندوہ سے سُنی جائے گی کہ جناب مولوی عزیز مرزا صاحب دہلوی بی اے آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ جو تین سال سے پولٹیکل آرگنائزیشن کی کشتی کو بڑی مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ چلا رہے تھے۔ صرف تین چار روز کی مختصر علالت کے بعد بعارضۂ درد گردہ ۲۰ فروری کو قبل از دوپہر لکھنؤ میں وفات پا گئے۔

آپ کا قدیم دار السلطنت دہلی وطن تھا۔ چغتائی ترکوں کے ایک پرانے معزز خاندان کے چشم و
چراغ تھے جن کے ارکین شاہانِ مغلیہ کے ماتحت اعلیٰ فوجی عہدوں پر سرفراز تھے اور مختلف
معرکوں میں دادِ شجاعت دے کر شاہی قدردانی سے بہرہ ور ہوتے۔ لیکن جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
میں اہلِ اسلام کے دیگر متموّل گھرانوں کی طرح اس خاندان کو بھی موردِ آفات کیا۔ اور جب مولوی
عزیز مرزا صاحب ۱۸۶۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تو ان کے سرپرست مشکل سے ان کی واجبی
تعلیم کا انتظام کر سکے۔ اور اعلیٰ تعلیم انگریزی سے وہ یقیناً محروم رہتے اگر سرسیّد انھیں ہونہار
اور جوہرِ قابل دیکھ کر اپنے مدرسۃ العلوم کے ابتدائی طلبہ میں شامل نہ کر لیتے۔ اس طرح مولوی عزیز مرزا
صاحب کو علی گڑھ کالج کے اشمارِ اولین میں ہونے کا فخر نصیب نہ ہوتا اور اپنے زمانۂ تعلیم میں
ہی انہوں نے اپنے اساتذہ و معاصرین کو اپنی غیر معمولی ذہنی و دماغی قابلیتوں کا یقین نہ دلا دیا ہوتا۔
چنانچہ کالج میں وہ اسٹوڈینٹ یونین کلب کے سکریٹری رہے اور ۱۸۸۷ء میں حضرت قیصرہ کی جوبلی
کی یادگار قائم کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کے پریسیڈینٹ بنائے گئے تھے۔ اسی
سال میں انہوں نے بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اور سرسیّد نے ان کو تھوڑے
ہی عرصہ میں حیدرآباد بھیج دیا جہاں وہ پہلے معین المہام کے پرسنل اسسٹنٹ بنائے گئے تھے۔ اور
۱۸۹۳ء میں لیجسلیٹو کونسل کے سکریٹری، ۱۸۹۵ء میں جوڈیشل ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ سکریٹری
اور ۱۸۹۶ء میں کورٹ آف وارڈ کے سپرنٹنڈنٹ قرار پائے۔ اس آخری عہدے کے فرائض وہ
اپنے مستقل منصب کی ذمّے داری کے ساتھ محض آنریری طور پر ادا کرتے رہے اور چار سو روپے
ماہوار کے پینشن الاؤنس سے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ شرعاً یتیموں کے مال میں سے کچھ لینا
ناجائز ہے۔ اس دیانت داری اور ایثار کی اسپرٹ نے حکّام و رعایا میں انھیں بے حد ہر دل عزیز بنا
دیا تھا اور آخر کار حضور نظام نے ہوم سکریٹری کے معتمد منصب پر ان کا تقرر کیا۔ جس سے ساری
مملکتِ آصفیہ کے اندرونی انتظام کی نگرانی ان سے متعلق تھی۔ اس اہم و نازک فرض کی ادائیگی
سرگرمی کے علاوہ بہت بڑی معاملہ فہمی و مصلحت اندیشی چاہتی تھی۔ لیکن مولوی عزیز مرزا صاحب
نے کئی سال تک اس عہدہ کا کام پوری لیاقت و ہوشیاری سے انجام دیا۔ اور گو آخر میں ان کے
بدباطن و خودغرض مخالفین اپنی رکیک چالوں سے جن کے لئے دیسی ریاستیں عام طور سے بدنام
ہیں۔ حضور نظام مرحوم کو مولوی عزیز مرزا صاحب کی طرف سے بدظن کرنے اور ایک ناقابلِ اعتبار
الزام پر انہیں پنشن دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اس الزام کا فرضی و بے بنیاد ہونا بہت جلد

پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب کا ریاست کی خدمت میں بدیں وجہ نہایت مفید ہوا اور ملازمت کی پابندی سے چھوٹ گئے اور قومی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ اور مسلمانانِ ہند نے جلد انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا سکریٹری منتخب کر کے ان کی ذات پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور مولوی عزیز مرزا صاحب نے اپنی تین سال کی مسلسل محنت سے مسلم لیگ کو ایسا طاقتور اور مفید بنا دیا جیسا مسلمانانِ ہند کے متحدہ پولیٹیکل آرگنائزیشن کو ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اپنی علمی مادر علی گڑھ کالج کی وہ ہمیشہ ایک سعادت مند فرزند کی طرح خدمت بجا لاتے رہے۔ اور بحیثیت ایک ٹرسٹی اور وولنٹیر ہوا تے کے انہوں نے ہر موقعہ پر کالج کو ایسے گراں قدر فائدے پہونچائے کہ مسلمان اہل الرائے کی ایک جماعت نواب وقار الملک کے استعفے پیش کرتے وقت مولوی عزیز مرزا صاحب کو ان کی جانشینی کا اہل سمجھتی تھی اور اس مطلب کی ایک سے زیادہ تحریریں روزانہ پیسہ اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔

اس کے ساتھ مولوی عزیز مرزا صاحب کی زندگی کا ایک لٹریری پہلو بھی نہایت شاندار تھا اور ملک کے بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں کو سالہا سال سے بڑی فراخ دلی کے ساتھ قلمی مدد دیتے رہے۔ ایسے قابلِ قدر ہمدردِ قوم کی وفات درحقیقت قوم کے لئے ایک شدید صدمہ ہے۔ خدا مولوی عزیز مرزا صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ (مخزن عالم ۵ مارچ ۱۹۱۲ء)

نواب مرزا علی اکبر خاں دہلوی

نواب صاحب طہماسپ بیگ خاں رومی و یکہ تاز بیگ خاں رومی کی اولاد میں سے تھے۔ اور ننھیال کے بزرگ نواب لطف اللہ خاں صاحب تھے۔ آپ کے بزرگ مغل شہنشاہوں کے دربار میں بہت اعلیٰ درجے پر ممتاز تھے۔ مثلاً آپ کے جد نواب الہ یار خاں صاحب محمد شاہ یا اسی طرح کسی دوسرے شہنشاہ کے زمانہ میں محافظِ قلعہ جات تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں سرکارِ انگریزی کی طرف سے آپ کے چچا مرزا بہادر علی خاں صاحب کو دفتر شاہی کے معائنہ کی خدمت سپرد ہوئی۔ اسی طرح آپ کے والد مرزا علی خاں سرکارِ انگریزی کی طرف سے جنگِ آزادی ۵۷ء کے بعد ایک اعلیٰ عہدے پر مامور ہوئے تھے۔ آپ کی پیدائش کا کوئی ٹھیک سنہ و مہینہ معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر اتنا ضرور سنا گیا ہے کہ آپ ۱۲۶۶ھ میں اپنے وطن دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اس سنہ ہجری کے

حساب سے آپ کی عمر ۶۲ برس کی ہوئی۔ اور انگریزی سے حساب کیا جائے تو ۶۵ برس کی ہوتی ہے
آپ کی ابتدائی تعلیم اس طریقہ سے ہوئی کہ چھوٹی عمر میں آپ نے کل درسی کتابیں تحصیل کر لی تھیں۔
اس عرصہ میں آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر آپ کے عم بزرگوار مرزا اتہور علی خاں نے ۱۸۶۶ء
میں اپنی نیابت میں لے لیا۔ آپ کے چچا ریاست ٹونک کے معزز وکیل تھے۔ ان کی کارکردگی دیکھ کر
۱۸۷۰ء میں مہاراجہ صاحب بانسواڑے نے آپ کی خدمات حاصل کریں۔ اور آپ کو ریاست کی
طرف سے ریزیڈنسی میں وکیل مقرر کیا۔ مرحوم نے ایسے اہم اور پیچیدہ معاملات کو جو ایک عرصۂ
دراز سے حل نہ ہوتے تھے اس عمدگی سے سلجھایا کہ مہاراجہ صاحب نے یک لخت آپ کو دیوانِ
ریاست مقرر کر دیا اور اس طرح کل کام ریاست کے آپ کے سپرد ہو گئے۔ اس عرصہ میں بعض
ناگہانی واقعات کشت وخون وغیرہ کے ایسے پیش آئے جن سے ریاست کو بڑے خطرے
میں پڑنے کا اندیشہ ہو گیا۔ مگر آپ نے اپنی ذاتی سوجھ بوجھ سے اس طرح وہ معاملات رفع دفع کر
دیئے کہ ریاست خطرے سے نکل گئی اور مہاراجہ کی بھی بڑی نیک نامی ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں آپ
کے عم بزرگوار مرزا اتہور علی خاں سخت علیل ہوئے۔ آپ انھیں وہاں سے لے کر دہلی چلے گئے۔ وہ
ایک عرصہ تک علیل رہے۔ لہٰذا آپ نے ریاست سے قطع تعلق کر لیا۔ مگر اس کے تھوڑے عرصہ
بعد مہاراجہ رتلام نے جب مہاراجہ مدن سنگھ سے آپ کی قابلیت کا حال سنا تو بہت شوق سے
آپ کو دہلی سے رتلام بلا لیا اور فوجداری کا کل کام آپ کے سپرد کر دیا۔ سرلیپل گریفن ایجنٹ
گورنر جنرل نے آپ کی قابلیت کی بڑی قدر کی اور آپ ایک عرصہ تک اس قدردانی کی وجہ سے ریذیڈنسی
میں وکالت کا کام ریاست کی طرف سے انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد کرنل ہنڈرسن جنرل سپرنٹنڈنٹ
ٹھگی ڈپارٹمنٹ کی سفارش سے نواب صاحب ٹونک نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ اوّل انھیں
ریاست کی فوجداری کا کام سپرد کیا۔ اس کے بعد اپنے علاقہ سرونج کا گورنر یعنی ناظم مقرر کیا۔ یہاں جو کچھ نمایاں
کام نجام دیئے وہ کسی سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔

آپ کا ذاتی مذاق اور رجحان ہمیشہ قومی کاموں کی طرف رہا۔ اور اس بات کی آرزو کیا کرتے تھے
جس طرح ہو آپ ایسی قومی خدمات انجام دیں جس سے قوم کو فائدہ پہونچے۔ چنانچہ آپ نے ملازمت
سے استعفیٰ دے دیا۔ قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ کی قومی و ملکی خدمات اس قدر طویل ہیں جن سے ایک
ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ آپ کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ مثلاً ایک تالیف تاریخ دربارِ قیصری اور دوسری

طلسم اکبری ہے۔ باقی مختلف نظمیں اور مضامین ہیں جو طبع ہو چکے ہیں۔

بڑے اعلیٰ حکام انگریزی و دیسی ریاستوں کے رئیس آپ کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ لکھنؤ کے آخری نواب واجد علی شاہ سے جب کلکتہ کے ٹیا برج میں ملنے کا اتفاق ہوا تو شاہ اودھ نے اپنا خاص موزوں کیا ہوا ایک مرثیہ بڑے شوق سے آپ کو سنایا۔ آپ نے ان کو داد دی۔ بے شمار انگریز افسران آپ کے مدح خواں اور دوستوں میں تھے اور والیان ریاست مثلاً نواب بہادر جاورہ، نواب صاحب رامپور، نواب صاحب ٹونک، مہاراجہ ندور، مہاراجہ رتلام، مہاراجہ دربھنگہ، بیگم صاحبہ بھوپال، سابق شاہ اودھ، مہاراجہ بڑودہ اور مہاراجہ گوالیار کی نظر میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

مرزا صاحب کو دیسی صنعت و حرفت کا بڑا ذوق تھا۔ کئی چیزیں آپ نے ایجاد کی تھیں۔ پہلی ایجاد ایک زرہ ہے جو لوہے کی کڑیوں سے بنائی گئی تھی۔ جب سپاہی اسے آگے رکھ کے کھڑا ہو جاتے اور دشمن فائر کرے تو مخالف کی گولی سے لگ نہیں سکتی تھی۔ ورنہ وہ ان کڑیوں میں اٹک کر رہ جاتی تھی۔ اس کا تجربہ کیا گیا تو وہ ایک حد تک کامیاب ہوا۔ اسی طرح مرزا صاحب نے کنویں سے پانی نکالنے کا ایک آلہ بنایا تھا۔ مگر مرحوم کی زندگی میں درجۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

دہلی میں مرزا صاحب کی یادیں، یک یونانی دواخانہ، دوسرا مدرسہ مردانیان جن کے سرپرست حافظ حکیم اجمل خاں تھے۔ ہندوستانی دواخانہ کے بھی آپ بہت دنوں تک مہتمم اور منتظم رہے۔ اس کی روپے پیسے سے بھی مدد کی۔ جب امیر حبیب اللہ خاں سیاحت کے لئے ہندوستان تشریف لائے تو حکومت برطانیہ نے ان کے انتظام کے لیے آپ کو مقرر کیا۔ اس کی نہ صرف حبیب اللہ خاں صاحب نے بلکہ برطانیہ کے حکمرانوں نے بھی تعریف کی۔ مرزا صاحب کو سانس کا مرض تھا اسی میں آپ فروری ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (مخزن عالم، نومبر ۱۹۳۰ء)

مرزا محمد اسمٰعیل طپش دہلوی

تقریباً ۱۱۸۲ھ میں مرزا طپش مرزا یوسف بیگ کے گھر دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا یوسف بیگ دہلی کے شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کا خاندان حضرت سید جلال بخاریؒ سے نسبی نسبت رکھتا ہے۔ مرزا محمد اسمٰعیل جنھیں گھر والے پیار سے مرزا جان کہتے تھے لڑکپن سے تیز طبع اور شوقین تھے۔ مرزا کی فارسی کی

تعلیم بہت اچھی ہوئی تھی اور اس وقت کے شریف زادوں کی طرح فنِ سپہ گری کو بھی حاصل کیا تھا۔ خدا جانے کب اور کہاں طپش نے سنسکرت بھی اچھی طرح پڑھی تھی۔

مسٹر لیف اے فیلن اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں۔ طپش کو سولہ برس کی عمر سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ طپش خواجہ میر درد علیہ رحمتہ کے مشہور شاگرد تھے اور حضرت خواجہ کی رحلت ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ کو ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طپش کو آپ سے استفادہ کا موقع بہت ہی کم ملا ہوگا۔ اور غالباً اس کمی کو انھوں نے مرزا محمد یار بیگ سائل تمیذ سوداو حاتم کی شاگردی سے پورا کیا ہوگا لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی تصنیف "کتب خانہ اودھ" میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۸ھ میں طپش بنارس میں علی ابراہیم خاں خلیل سے بھی ملے تھے اور اس وقت وہ نوجوان اور اچھے شاعر تھے۔

اس وقت دہلی کے اہلِ کمال ایک ایک کرکے لکھنؤ اور مرشد آباد چلے جارہے تھے۔ طپش بھی لکھنؤ پہونچے اور مرزا جواں بخت جہاندار شاہ خلف اکبر شاہ عالم کی سرکار میں نوکر ہوگئے تھے۔ انھیں کے ہمراہ بنارس بھی آئے تھے اور غالباً بنارس سے ترکِ ملازمت کرکے سیدھے مرشد آباد پہونچے ـــ مرشد آباد کے صوبے دار اُن دنوں نواب مبارک الدولہ تھے اور ان کے عزیز نواب شمس الدولہ بھی وہیں مقیم تھے۔ نواب شمس الدولہ اپنے بھائی نواب نصرت جنگ کے بعد خود بھی نائب ناظم بنگالہ مقرر ہوئے تھے اور ڈھاکہ میں آخر تک رہے تھے۔ نواب صاحب نے خواہش کی تھی کہ توضیحِ اصطلاحات دربار کی دہلی اور روزمرہ فصحائے رودئے معلّی کے لئے ایک کتاب لکھی جائے۔ طپش نے ان کی خواہش پوری کی۔ اور ان کے نام پر شمس بیان تصنیف کی۔ شمس البیان ۹۳-۱۶ مطابق ۱۲۰۷ھ میں لکھی گئی۔ اس لحاظ سے یہ اردو قواعد و مصطلحات کی پہلی کتاب تھی جو کسی اہلِ زبان نے لکھی۔ سید انشاء کی "دریائے لطافت" گو اس سے زیادہ ضخیم ہے لیکن شرفِ اولیت شمس بیان ہی کو حاصل ہے۔

طپش مرشد آباد سے کلکتہ آئے اور کچھ دنوں قیدِ فرنگ میں دن گذارے۔ ان کی قید کی وجہ معلوم نہ ہوسکی مگر قیاس چاہتا ہے کہ وہ پولٹیکل قیدی بنائے گئے ہوں گے۔ کیونکہ نواب شمس الدولہ کی رفاقت کا ایک نتیجہ یہ بھی ممکن ہے۔ نواب صاحب نہایت ذی حوصلہ بلند خیال والیٔ ملک تھے۔ وہ خود بھی انگریزوں کے خلاف سازش میں کچھ دنوں تک کلکتہ میں نظربند رہے تھے۔ مرزا علی لطف جس نے اس وقت کے ایک ایک شاعر کا حال لکھا ہے۔ اس نے طپش سے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ حالانکہ ۱۸۰۱ء میں گلشنِ ہند کا سنہ تالیف ہے اور اس وقت کلکتہ میں طپش محبوسِ فرنگ تھے۔ کیونکہ اسی

حالت میں انھوں نے مثنوی یوسف و زلیخا اردو میں لکھی۔ مثنوی کا سنہ تالیف ۱۸۰۴ء ہے۔ علاوہ بریں گلشنِ ہند کی بنیاد گلزارِ ابراہیم پر رکھی ہے۔ علی ابراہیم خود طپش سے مل چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پولٹیکل قید کی وجہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ نے پسند نہیں کیا کہ طپش کا ذکر گلشنِ ہند میں ہو۔ طپش نے ۱۸۰۲ء میں بعد آزادی ترجمہ بہارِ دانش کیا۔ جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ طپش تقریباً ۱۸۰۲ء میں ڈھاکہ چلے گئے اور نواب نصرت جنگ نائب ناظم ڈھاکہ کی رفاقت میں رہے۔ ۱۲۲۱ھ میں جب شاہزادہ علی بخت مرزا محمد ظہیر الدین اظفری دلّی کے لال قلعہ سے بھاگ کر جے پور، جودھپور، اودے پور اور لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد پہنچے اس وقت طپش کو نواب نصرت جنگ نے بطور سفارت شاہزادہ کے پاس بھیجا تھا۔ شاہزادہ نے اپنی سیاحت نامہ میں طپش کی بڑی تعریف کی ہے اور اس ذکر میں تقریباً ایک صفحہ رنگ دیا ہے۔

"کلیاتِ طپش" ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھی۔ وہ درحقیقت مشرقی بنگال اور مرشد آباد کی اردو شاعری کے حق میں باوائے آدم ہیں اور اب تک ان کا خانوادہ شاعری یہاں آباد ہے۔ حضرت طپش نے ۱۸۳۹ء میں کلکتہ میں رحلت کی اور وہیں مدفون ہوئے۔

طپش سپاہی پیشہ، خوش طبع، نیک مزاج اور زبردست شاعر تھے۔ ان کی تصنیفات طبع ہو گئی تھیں مگر اب نہایت کمیاب ہیں۔ برٹش میوزیم کلکتہ کے کتب خانہ میں شمس البیان کا ایک ہی نسخہ تھا جو اب امپریل لائبریری میں منتقل ہو گیا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کا دستخطی اور نواب شمس الدولہ کا مہری ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ زیادہ ضخیم نہیں ہے لیکن بلحاظ فوائد اب بھی وہ اسی قدر نافع اور فائدہ مند ہے جیسا تصنیف کے وقت تھا۔ سوا سو برس کے اندر ایک کتاب بھی اردو کی دنیا میں ایسی نہیں لکھی گئی جو کہ طالبِ فن اور شائقِ نکاتِ زبان کو اس رسالہ سے مستغنی کر دیتی چونکہ اردو اور فارسی محاورات کی تطبیق کی جو لاجواب کوشش اس میں کی گئی ہے اس حیثیت سے یہ رسالہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ (۸؍ دسمبر ۱۹۳۹ء)

مولانا سیّد علی بلگرامی

مولانا سیّد علی صاحب بلگرامی مرحوم خان بہادر سیّد زین الدین صاحب مرحوم متعلقہ پراونشل سروس بنگال کے فرزند اصغر تھے۔ ہندوستان میں آپ کا آبائی وطن تو مشہور و مردم خیز قصبہ بلگرام

(ضلع ہردوئی۔ اودھ) تھا مگر غالباً بنگال کے ساتھ آپ کے خاندان کی ملازمت کے تعلقات کی وجہ سے آپ کی پیدائش ۱۸۵۱ء میں بمقام پٹنہ (بہار) ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے عم بزرگوار خان بہادر اعظم الدین صاحب سی آئی ای کے زیر نگرانی حاصل کی۔ طباعی و ذہانت کے علاوہ حافظہ بچپن ہی سے غضب کا پایا تھا، جس نے آخر عمر تک بھی طرح آپ کا ساتھ دیا اور جو کمالاتِ علمیہ کے حصول میں اس قدر آپ کا ممد و معاون ہوا کہ عربی و فارسی کی تعلیم کے زمانہ میں کلامِ اساتذہ سے دیوان کے دیوان آپ کو ازبر تھے۔ پندرہ سال کی عمر سے انگریزی شروع کر کے آٹھ سال کی مدت میں پٹنہ کالج سے بی اے کا امتحان اوّل درجہ میں ڈبل آنرز کے ساتھ پاس کیا۔ بی اے میں دوسری زبان آپ کی سنسکرت تھی۔ اس کے بعد میکینکل سائنس کی تعلیم حاصل کی اور اس تعلیم کے حصول کی خاطر رڑکی انجینیرنگ کالج میں داخل ہوئے مگر سر سالار جنگ اعظم (اس زمانے کے وزیر اعظم حیدرآباد دکن) نے آپ کو رڑکی کالج سے واپس طلب کر کے سرکار نظام میں عہدہ دلا دیا۔ کچھ مدت آپ سر سالار کے ذاتی اسٹاف میں رہے۔ جب سر سالار ولایت کے سفر پر تشریف لے گئے تو مولوی سید علی صاحب کو بھی ہمراہ لیا اور ولایت پہونچ کر ان کو معدنیات کے شاہی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ یہاں آپ کو پروفیسر ہکسلے اور پروفیسر ٹنڈل جیسے مشاہیر روزگار سائنس دانوں کی خاص شاگردی کی خوش نصیبی حاصل ہوئی، جس پر آپ ہمیشہ بجا طور سے فخر کیا کرتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے معدنیات کا امتحان بھی اعزازوں کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے علاوہ ارضیات کے مضمون میں بھی ایک اعلیٰ درجہ کا تمغہ حاصل کیا۔ اسی زمانے میں آپ نے جرمنی، فرانسیسی، لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھنا شروع کیں، اور بہت جلد ان میں مہارت پیدا کر لی۔ امتحانات سے فارغ ہو کر تمام یورپ کا سفر کیا۔ اطالی زبان خود اٹلی میں قیام کر کے سیکھی۔ ولایت سے حیدرآباد پہونچنے کے بعد آپ انسپکٹر جنرل معدنیات اور پھر ہوم سکریٹری اور ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اور معتمد ریلوے جات کے ممتازی عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۸۹۲ء میں آپ نے کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان بی ایل صرف چار ماہ کی کوشش سے پاس کر لیا اور کل امیدواروں میں اوّل نمبر آئے۔ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد کی ملازمت سے پنشن حاصل کر کے آپ انگلستان چلے گئے اور ایک عرصہ تک کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے پروفیسر رہے۔ اس قیامِ انگلستان کے زمانے میں آپ نے یونیورسٹی کا امتحان بھی پاس کیا۔ آپ مطالعہ کے نہایت شائق تھے۔ ویدوں پر آپ کو بہت عبور حاصل تھا۔ مدراس یونیورسٹی کے سنسکرت کے امتحان ایم اے کے آپ ممتحن مقرر ہوا کرتے تھے سنسکرت میں

آپ نظم لکھ سکتے تھے۔ اب آپ اٹھارہ بیس زبانوں کے ماہر تھے اور دو اور زبانوں (ڈچ کی دلیشتر) کے جلد سیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیف "تمدنِ عرب" سب سے زیادہ مشہور اور اردو لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ تمدنِ عرب آپ نے فرانس کے مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاوی بان کی اصل فرانسیسی کتاب سے ترجمہ کی تھی۔ اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب "تمدنِ ہند" کے نام سے آپ اردو میں چھاپنا چاہتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس کا ترجمہ مکمل ہوگیا ہے اور کچھ اجزاء چھپ بھی چکے ہیں۔ اگر اس کتاب کے چھپنے کا انتظام ہو سکے تو درحقیقت یہ ایک بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔ سنا ہے کہ مرحوم نے سنسکرت سے ایک وید کا ترجمہ بھی اردو میں کرنا شروع کیا تھا۔ آپ کا کتب خانہ بھی ایک بیش بہا ذخیرہ کتابوں کا ہے۔ اسلام کے متعلق یورپ کی کسی زبان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو آپ کے کتب خانہ میں نہ ہو۔ آپ علی گڑھ کالج کے ایک ممتاز ٹرسٹی تھے۔ قومی معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے آپ ہی سکریٹری تھے۔ گذشتہ اپریل میں جب آپ مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب کی غرض سے علی گڑھ میں مقیم تھے تو نواب وقار الملک بہادر کو ایک خط مورخہ ۳ اپریل میں لکھا تھا: "کل میں نے مسلسل نو گھنٹہ تک کام کیا اور پھر شام کو دو گھنٹے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس محنت اور انہماک کے ساتھ آپ اس اہم ذمہ داری کے کام کو انجام دے رہے تھے۔ ۲ مئی ۱۹۱۱ء کو آپ نے یکایک دل کی حرکت بند ہو جانے سے بمقام بردوئی انتقال فرمایا۔ آپ کی رحلت سے نہ صرف قوم بلکہ ملک کو ایک نقصان عظیم پہونچا بلکہ ایک ایسا فرد دنیا سے اٹھ گیا جس کے مانند مادرِ گیتی روز روز پیدا نہیں کرتی۔ (مخبر عالم ۲۳ مئی ۱۹۱۱ء)

علامہ شبلی مرحوم

یہ خبر نہایت رنج و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صاحب نے چند روز کی بیماری کے بعد اپنے وطن اعظم گڑھ بروز بدھ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی، مولوی صاحب کے انتقال سے مسلمانانِ ہند کا پرانے اسکول کا نہایت قابل اور عالم بزرگ گذر گیا کہ جس کی جگہ اب پر ہونا دشوار معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے تاریخ اسلام کا بڑا مطالعہ کیا تھا۔ اور اردو زبان میں تاریخ و تذکرہ

اور علمِ کلام میں جو آپ نے ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو موثر اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں مطالب ادا کرنے کا اعلیٰ درجہ کا محاورہ تھا۔ فارسی میں بھی آپ نے بہت عمدہ اور دل پذیر نظمیں لکھی ہیں اور اردو میں بھی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ مگر تاریخ اور تذکرہ میں جو کتابیں لکھی ہیں انہیں قوم نے سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ابتدا میں آپ نے اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سے تعلیم پاکر مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا پھر علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور سر سید احمد خاں مرحوم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اسی زمانے سے ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں آپ نے تاریخ اسلام پر لیکچر دیئے اور کتابیں لکھنا شروع کیں۔ آپ نے قسطنطنیہ اور شام کی سیاحت کی۔ واپسی پر سفرنامہ لکھا اور علی گڑھ کالج کی ملازمت ترک کرکے حیدرآباد دکن میں سلسلۂ تصانیف دولتِ آصفیہ کے متعلق ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ نظام نے آپ کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس پر آپ نے ندوۃ العلماء کے بیت العلوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور ندوۃ العلماء کو آپ کی کوششوں سے بہت فائدہ پہونچا مگر اخیر میں لکھنؤ کے بعض منتظمین ندوہ سے آپ کو اس قدر شکایت پیدا ہو گئی کہ آپ نے ندوہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ زمانہ قیام لکھنؤ سے ہی بیگم صاحبہ بھوپال نے آپ کو سیرتِ نبوی مرتب کرنے کے لئے مالی امداد دے کر اس خدمت پر مامور کیا۔ مگر معلوم نہیں کہ موت نے انھیں اس کے ختم کرنے کی مہلت دی یا نہ دی۔

آپ کی دیگر تصانیف سیرت النعمان، الفاروق، علم کلام دو جلد، فارسی لٹریچر کی تاریخ تین جلد، موازنہ انیس و دبیر، سفرنامہ ترکی، لیکچر اور نظمیں وغیرہ ہیں۔ گورنمنٹ نے آپ کو علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں ہی شمس العلماء کا خطاب دے دیا تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں ان کے پولیٹکل خیالات بہت آزاد ہو گئے اور نیشنل کانگریس کے خیالات کے حامی ہو گئے تھے۔ ان کے مذہبی خیالات و عقائد سے بھی بعض علماء کو اختلاف تھا مگر انھوں نے کفر کے ایک فتوے کے جواب میں پچھلے دنوں دہلی میں صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ حنفی عقیدے کے پکے مسلمان ہیں۔ چند سال پیشتر ایک بندوق کے حادثہ سے آپ کا ایک پاؤں کٹوا دیا گیا تھا۔ تو آپ نے ایک شعر میں یہ مطلب لکھا تھا کہ مجھ گنہگار کا تو سر کٹنا چاہئے تھا نہ کہ صرف پاؤں پر درگذر کیا گیا۔

مسلمانانِ ہند کو خصوصاً اور علمی دنیا کو عموماً علامہ شبلی نعمانی کے انتقال سے سخت صدمہ پہونچا۔ ؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"مخبر عالم ۸ر دسمبر ۱۹۱۴ء"

مولانا رفیقی

"رنگون کے خاص تاروں سے یہ دریافت کر کے سخت قلق و اندوہ ہوا کہ مولوی عبدالسلام صاحب رفیقی مالک کشمیر ٹریڈنگ ایجنسی و رسالہ الرفیق رنگون یکایک اپنے مکان سے غائب ہوگئے اور کئی روز کی بے فائدہ تلاش کے بعد ان کے کاغذات کی جانچ پڑتال سے ان کی نسبت خودکشی کا قوی اندیشہ کیا جا سکتا ہے اور عارضی دیوانگی کا جوش یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے تو انہوں نے اپنی لاش کے جلائے جانے کی وصیت لکھی اور پھر اس کو بہتر سمجھا کہ جانور ان کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں۔

مولانا رفیقی صاحب ایک سیلف میڈ مین تھے جنہوں نے اپنے وطن قصبہ نور پور حوالی کشمیر میں فارسی عربی کی تعلیم پائی، اور لاہور آکر قومی معاملات سے خاصی دلچسپی پیدا کر کے بحیثیت تنخواہ دار سفیر انجمن حمایت اسلام برما گئے۔ لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت و ہوشیاری سے انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ بعد برما کی عظیم الشان تجارتی فرم جمال برادرس کے یہاں خاص رسوخ پیدا کر لیا۔ [illegible] ہیں ان کا ممنونِ احسان ہے کہ کوٹھی مذکور کے عالی ہمت مالک جناب سیٹھ جمال برادرس کی فیاضی کا رخ انھوں نے تعلیمی ضروریات کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کو صاحب موصوف سے گراں قدر مدد ملی اور صرف ان ہی کی وجہ سے محمڈن کانفرنس کا اجلاس خاص کامیابی سے رنگون میں منعقد ہوا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ابوظفر کی قبر انھوں نے بڑی کوشش سے بچائی۔ نیز ان کی ہمتِ مردانہ اور سیٹھ جمال و دیگر حضرات کی سرپرستی سے محمڈن کانفرنس و مسلم لیگ کی پراونشل شاخیں بھی وہاں قائم ہوئیں اور ایک انجمن اسلامی اوقاف کی نگرانی کے لئے بھی بنائی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ رفیقی صاحب کا مضمون نگاری کا مشغلہ بھی جاری رہا اور بڑے بڑے اخباروں میں مضمون لکھنے کے علاوہ انھوں نے اپنا ایک خاص رسالہ بنام "الرفیق" بھی جاری کیا لیکن چند در چند مشکلات سے اس کو بھی وقت پر نکلنا نصیب نہ ہوا۔

افسوس ہے کہ مالی دقتوں نے جن کی وجہ شاید ایک حد تک ان کی فیاضانہ طرزِ معاشرت کو بھی قرار دیا جائے گا انھیں سخت مجبور اور زیست سے بیزار کر دیا۔ اور اندیشہ ہے کہ خدا نخواستہ ان کی کارآمد زندگی کا ہولناک خاتمہ ہوا۔"

افسوس اس دورِ ناپائیدار میں کسی ذی حیات کو پنجۂ اجل سے چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا۔
خلّاقِ دو جہان، مالکِ ارض و سما، اپنے کلامِ پاک میں صاف فرما چکا ہے۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

اس سے کسی کو چارہ نہیں لیکن ؎

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے (مخبر عالم یکم نومبر ۱۹۲۶ء)

شریمتی مالان دیوی

آپ سورگ باشی لالہ دینا ناتھ کی دوسری بیوہ ہیں۔ انھوں نے قومی تعلیم کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک نمایاں فیاضی کا ثبوت حال ہی میں دیا ہے۔ سورگ باشی لالہ صاحب لاہور میں ریلوے کے لوکو آفس کے ہیڈ کلرک تھے۔ انھوں نے بوقتِ انتقال پانچ سو روپے ڈی اے وی کالج کے لئے دان فرمایا تھا۔ اب ان کی چھوٹی بیوہ مالان دیوی صاحبہ نے اپنی جائیداد غیر منقولہ سے دو عمدہ مکانات ڈی اے وی کالج کو دان کر دیئے ہیں۔ ایک مکان دروازہ ٹکسالی کے نواح میں ہے اور دوسرا مکان چھوونی محلہ کے لوچے تیلیاں (لاہور) میں واقع ہے۔ ان مکانات کی مالیت دس ہزار روپے تک اندازہ کی جاتی ہے۔ اس رقم سے ایک مستقل طلائی تمغہ ہر سال اس طالب علم ڈی اے وی کالج کو دیا جائے گا جو یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان میں سنسکرت کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے گا اور اس آمدنی کا باقی حصّہ اس کالج کی کمیٹی جس طرح مناسب سمجھے گی خرچ کرے گی۔ نیز شریمتی موصوفہ نے دس ہزار روپے نقد کی ایک معقول رقم کانگڑی کے گروکل کے لئے دان فرمائی جو ہری دوار سے متصل ہے اور قرار دیا ہے کہ رقم سے گروکل کے طلبہ کے لئے ایک عمارت تعمیر کی جائے۔ اس کے علاوہ زیورات اور نقرئی برتن وغیرہ کی حیثیت کا قریب چھ ہزار روپے بنک میں جمع کر دیئے گئے اور یہ رقم مدرسہ نسواں کے نام منتقل کی گئی ہے جو شہر لاہور کے کوچہ بابیان میں کئی سال سے جاری ہے یہاں لڑکیوں کو سماجی اصول پر عمدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس رقم سے پاٹھ شالہ کے لئے ایک مکان

تعمیر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ باقی کپڑے اور برتن جن کی مالیت بھی قریب ڈیڑھ دو ہزار سے کم نہیں ہے لاہور کے ہندو یتیم خانہ کے لئے وقف کر دی ہے جو کہ آریہ سماج کی کوشش سے جاری ہے اور جہاں لاوارث یتیموں کی پرورش نیز تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ ایک طلائی زیور مالیت .... سو روپیہ اس گرلز اسکول کے لئے دیا گیا ہے جو آریہ سماج کے تحت جاری ہے۔ موصوفہ کا یہ دان کتنا قیمتی اور قابل قدر ہے اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے انہوں نے قرار دیا ہے کہ جن درس گاہوں کے لئے رقم مذکور وقف کی گئی ہیں اگر ان میں سے کوئی نہ رہ جائے تو اس کی امدادی رقم ڈی اے وی کالج کا مال سمجھی جائے گی۔ "مخبر عام ۲۱ جنوری ۱۹۰۹ء"

میاں شاہ دین

اخبار سول و ملٹری گزٹ لکھتا ہے میاں شاہ دین صاحب بی اے جو حال میں جج بنائے گئے ہیں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۷ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی سال میں قانون تعلیم بیرسٹری کے لئے ولایت گئے اور امتحان بیرسٹری پاس کر کے ۱۸۹۰ء میں لاہور واپس آئے تھے۔ ان ایام میں آپ کے برادر اکبر مرحوم و مغفور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں وہاں کے مقامی بار کی لیڈر تھے۔ میاں شاہ دین بھی پہلے قانونی پیشہ کے لئے وہیں گئے اور عمدہ تجربہ حاصل کر کے ۱۸۹۲ء میں لاہور کی عدالت چیف کورٹ میں پیشہ وکالت شروع کیا۔ اگلے سال ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ نے آپ کو پنجاب یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا اور اسی سال کے ماہ دسمبر میں محمڈن کالج علی گڑھ کے ایک ٹرسٹی منتخب کئے گئے۔ اگلے سال پنجاب یونیورسٹی کی مجلس سنڈیکیٹ کے ایک ممبر بنائے گئے اور ۱۴ سال سے اس عہدے پر مامور چلے آتے ہیں۔ تعلیمی امور سے دلچسپی در صحیح قسم کی خداداد لیاقت کی بنا پر آپ نے مسلمانوں کے ایک معتبر لیڈر کا منصب حاصل کیا اور اعتبار اور وقار میں مسلسل ترقی حاصل کی۔ تعلیمی امور میں نمایاں شوق کی وجہ سے ۱۸۹۴ء کے ماہ دسمبر میں اسلامی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں کیا گیا تھا اور آپ نے اس اجلاس کی کرسئ صدارت اس خوبی سے پر کی کہ سر سید مرحوم نے ان کو قوم کا ایک ہونہار ممبر تسلیم کیا۔ ۱۹۰۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے لا اسکول لاہور میں لیکچرر کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۰۴ء میں حضور سر چارلس ریوز صاحب بہادر نے آپ کو لوکل واضع آئین پنجاب کا ممبر مقرر کیا اور آپ کی خدمات اور معلومات اس درجہ مفید نکلیں کہ اس کے بعد متواتر دو مرتبہ آپ ممبری کونسل پر نامزد کیے گئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کو بارگاہ گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ اور اسی سال کے ماہ دسمبر میں آپ عارضی طور پر جج چیف کورٹ پنجاب مقرر کیے گئے اور قریب ایک سال تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۰۵ء میں شاہ دین صاحب پنجاب ایسوسی ایشن کے ایک سکریٹری منتخب کیے گئے۔ یہ عہدہ آنریری تھا۔ اسی سال میں گورنمنٹ عالیہ نے پنجاب پبلک لائبریری کی کمیٹی کا ممبر نامزد فرمایا۔ پنجاب کی تعلیمی کانفرنس میں بھی آپ بارہا بطور ممبر کے مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کی ٹیکسٹ بک کمیٹی کی ممبری پر بھی کئی بار فائز رہے۔ ہندوستان کی اسلامی لیگ میں آپ پنجاب شاخ کے پریسیڈنٹ ہیں اور علی گڑھ پارٹی کے ایک جلیل القدر لیڈر سمجھے جاتے ہیں۔

جسٹس سید کرامت حسین

سید کرامت حسین صاحب جو ہائی کورٹ الہ آباد میں ساتویں جج مقرر ہوئے ہیں کاظمی خاندان سادات کے ممبر ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔ ان کے جد امجد مفتی سید محمد قلی خاں گذشتہ صدی کے اوائل میں میرٹھ کے صدر امین تھے اور اپنی دیانتداری و راستبازی کی وجہ سے مشہور تھے۔ وہ عربی و فارسی کے جید فاضل تھے۔ چنانچہ ان زبانوں میں ان کی اعلیٰ پایہ کی مذہبی تصانیف موجود ہیں۔ ان کے والد بزرگوار سید سراج حسین نے اوائل عمر میں عربی و فارسی کی تحصیل کرنے کے بعد انگریزی و ریاضی میں بھی ایسی لیاقت پیدا کی کہ اپنے زمانہ کے بہترین ریاضی داں مشہور ہوئے اور کچھ زمانہ تک منصفی کرنے کے بعد بندیل کھنڈ ایجنسی کے دیوان مقرر ہوئے۔

سید کرامت حسین صاحب ۱۸۵۲ء کو جھانسی میں پیدا ہوئے اور پانچ برس کی عمر میں ان کی عربی کی تعلیم شروع ہوئی۔ ان کے والد کا ارادہ تھا کہ عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی میں علوم مغرب کی تحصیل کرائیں مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت نہ دی اور ان کی تیرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ اٹھ جانے کے بعد وہ اپنے چچا سید حامد حسین کے سایہ عاطفت میں آگئے جو علوم عربی و فارسی میں فاضل اجل مانے جاتے تھے۔ ان کی سرپرستی میں انہوں نے فقہ، حدیث اور دیگر علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے بھائی سید عنایت حسین نے ان کو ڈاکٹر اسٹریٹن پولیٹیکل ایجنٹ بندیلکھنڈ سے، جو ان کے والد کے بڑے دوست تھے، تعارف کرایا جنہوں نے ان کو انگریزی علوم مغربی کے حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور راجہ کمار نے انہیں مجوزہ کالج میں ہیڈ مولوی مقرر کرنے کا وعدہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے خداداد ذہن اور محنت و جانفشانی سے قلیل عرصہ میں انگریزی کی بہت اچھی لیاقت پیدا کر لی اور علوم جدید خصوصاً اس کی بعض شاخوں سے نہایت دلچسپی ظاہر کی چنانچہ گذشتہ تین سال تک فرصت کے اوقات میں یورپین فلاسفہ خصوصاً ہربرٹ اسپنسر کی تصانیف کثرت سے ان کے زیر مطالعہ رہیں بعدہ جب ڈاکٹر اسٹریٹن کے ماتحت بندیل کھنڈ ایجنسی کے میر منشی مقرر ہوئے تو انہوں نے انگریزی تعلیم کی تکمیل کی غرض سے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور ریاست نرسنگھ گڑھ میں دیوان مقرر ہوئے اور جب والی ریاست کا ولایت جانے کا عزم ہوا تو ان کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ انہوں نے وہاں تین سال تک قانونی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

ہندوستان میں واپس آنے کے بعد چند ماہ تک ریاست ٹیکم گڈھ کے مدارالمہام مقرر ہوئے۔ اس کے بعد الہ آباد میں وکالت شروع کی۔ کچھ عرصہ تک علی گڑھ کالج میں لا پروفیسر اور اس کے بعد سینٹرل کالج الہ آباد کے لا ریڈر بھی رہے۔

سید کرامت حسین مصنف بھی تھے۔ عربی الفاظ کے اشتقاق پر ان کی ایک کتاب نہایت مشہور ہے جس کا نام "المقدمہ" ہے اور علی گڑھ میں چھپی ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق و فرائض اور قانون پر بھی انہوں نے بعض اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھی ہیں۔ شرع اسلامی کے دقیق مسائل حل کرنے میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اور اس بارے میں ان کی رائے نہایت صائب اور مستند سمجھی جاتی تھی۔ انہیں تعلیم نسواں سے بڑی دلچسپی تھی کراسٹیویٹ گرلز اسکول کے آپ سکریٹری بھی تھے۔ مذہبی امور میں باوجود روشن خیالی کے نہایت راسخ الاعتقاد اور شرعی قیود و احکام کے پابند تھے، ور چونکہ ان کی ذات علوم مشرقی و مغربی کا ایک نہایت حیرت انگیز مجموعہ تھی اس لیے ہائیکورٹ الہ آباد کی ججی پر ان کا تقرر استحسان کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔

(مخبر عالم، ۱۶ را پریل ۱۹۰۹ء)

رائے بہادر پنڈت سندر لال

رائے صاحب پچھلے دنوں اودھ کے ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر مقرر ہوئے تھے۔ جو صوبہ اودھ کی اعلیٰ ترین عدالت میں جگہ حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی ہیں۔ رائے صاحب ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں میو سینٹرل کالج سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہ الہ آباد کی عدالت ضلع کی بار میں داخل ہوئے اور عرصے کے بعد ایک ایسے وقت میں ہائی کورٹ پہنچے جبکہ وکلا کی پرانی جماعت، جس نے صدر عدالت میں بخوبی نام اور دولت پیدا کی تھی، ہندوستانی یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کے لیے جگہ خالی کر رہے تھے۔ پنڈت سندر لال صاحب کی کالج کی تعلیمی حالت اور عدالت ضلع میں ان کی کارکردگی وکالت سے پیشہ قانون میں اس شہرت کا اندازہ ہو سکتا تھا جو آئندہ انہوں نے حاصل کرلی تھی لیکن جس روز سے وہ ہائی کورٹ کے وکلا کے زمرہ میں شریک ہوئے انہوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے کام لیا اور پوری کامیابی حاصل کی۔ وہ ان فیصلہ نویسوں کے پہلے گروہ میں سے تھے جنہیں سر کومر پیتھرم چیف جسٹس نے الہ آباد نے مقرر کیا تھا۔ لیکن ان کی پریکٹس روز بروز اس قدر بڑھتی جارہی تھی کہ وہ فیصلہ نویسی کے کام کی طرف پورے طور پر توجہ نہ دے سکے اور آخر کار اس کام کو چھوڑنا پڑا۔ اگرچہ ۱۹۰۰۔۱۸۸۰ء کے درمیان الہ آباد ہائی کورٹ بار میں مسٹر والٹر، کا مول، آنجہانی مسٹر آرتھر، اسٹریچی آنجہانی، مسٹر پینکی، مسٹر جسٹس اے۔ ایچ ریڈ جیسے انگریز اور پنڈت اجودھیا ناتھ آنجہانی، پنڈت

بشنبر ناتھ آنجہانی، منشی ہنومان پرشاد آنجہانی، مسٹر دوارکا ناتھ آنجہانی جیسے لائق ہندوستانی موجود تھے۔ تاہم مسٹر سندر لال کو عرصہ دراز تک کامیابی کا انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے گذشتہ فیصلہ جات کے حوالہ دینے میں بخوبی مہارت حاصل کر لی تھی یہاں تک کہ بہت سے سینیئر وکلا ان کی امداد کے خواہاں رہا کرتے تھے۔ مسٹر چارلس بل نے پنڈت صاحب کو امداد دی اور سب سے پہلے ان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پنڈت صاحب کے سر کامیابی کا سہرا بندھا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد الٰہ آباد کے اکثر مشہور آدمی کسی نہ کسی وجہ سے اپنی اپنی جگہ خالی کر چکے تھے اور پنڈت جی کی پریکٹس اس کے بعد روز بروز بڑھتی گئی۔ چنانچہ گزشتہ پندرہ سال سے انہیں بار کے ہندوستانی حصہ کا مسلم لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے لیے بھی بہت عمدہ کام کیے جس کے اعتراف میں ۷۔۱۹۰۶ء میں سر جیمس لاٹوش نے انہیں یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کر دیا تھا۔ اودھ کے ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر کا عہدہ انہوں نے بہت سے مالی نقصانات اُٹھانے کے بعد منظور کر لیا تھا جس کی وجہ محض یہ تھی کہ انہوں نے جب دیکھا کہ اتنا بڑا ذمہ داری کا عہدہ بلا طلب مجھے ملتا ہے تو مجھے اس کو منظور کر لینا چاہیے اور عذر نہ کرنا چاہیے پنڈت سندر لال صاحب کا اودھ بیچ پر نامزد ہونا ایک نئی بات تھی مگر آخر کار مالی نقصانات کی وجہ سے پھر وہ اپنا آزاد پیشہ کرنے لگے۔ پنڈت سندر لال صاحب کو الٰہ آباد کے طلبا سے ہمیشہ دلچسپی و ہمدردی رہی اور وہ ہندو طلبا کے اس عظیم الشان بورڈنگ ہاؤس کے بانیوں میں سے ہیں جس کا نام لارڈ میکڈانلڈ پر رکھا گیا ہے۔ پولیٹیکل معاملات میں پنڈت سندر لال صاحب کانگریسی خیال کے آدمی ہیں اور آپ اس کے گذشتہ اجلاسوں میں شریک ہو چکے ہیں آپ ایک پابند مذہب ہندو ہیں اور تمام مجلسی و مذہبی امور میں ذات پات کے قواعد پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ (مخبر عالم ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۹ء)

اشہری

جناب اشہری ایسے خندہ پیشانی تھے کہ گو ہزاروں مصیبتیں ان پر ٹوٹ پڑتیں مگر افسردگی اور غم کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ دیوانگی میں بھی تہذیب و شائستگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ یک رنگ دوست تھے۔ اگر آپ اپنے دوستوں سے برسوں کے بعد بھی ملتے تو اس شان سے پہچانتے تھے کہ گویا آپ ایک لحظہ کو بھی جدا نہیں ہوئے تھے۔ طبیعت اتنی صاف پائی تھی کہ کبھی کسی سے رنج و عناد عمر بھر نہیں رکھا۔ تعصب سے اتنے دور تھے کہ کسی نے اتنا بھی نہ جانا کہ اشہری کس مذہب کے پابند ہیں۔ وہ نہایت سادہ مزاج تھے لڑکوں میں لڑکے بوڑھوں میں بوڑھے اور جوانوں میں جوان تھے۔ عشق و حسن کی انہوں نے بادبا سیر کی مگر اپنی

عفت وعصمت کی نگہداشت خوب کی۔ وہ کوئی معمولی انشا پرداز نہ تھے۔ ان کی موت سے زبان کو بڑا نقصان پہنچا۔

آپ کے مورث اعلیٰ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں ایران سے تشریف لائے۔ آپ کے والد ماجد میر احمد علی خان ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ جناب اشہری ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ عمدہ تربیت اور عمدہ تعلیم علوم مشرقیہ کی آپ کو دی گئی۔ جناب نواب سکندر بیگم فرمانروائے بھوپال کے عہد حکومت میں آپ کا تعلق دربار بھوپال سے ہوا اور جناب نواب شاہجہان بیگم کے عہد میں آپ نے مختلف مدارج پر ترقی پائی۔ جناب اشہری نے جو لطف اور تفریح بھوپال میں خلد مکان کے عہد میں پائی اس کا ادنیٰ ثبوت یہ تھا کہ جب نواب صدیق حسن خاں صاحب کا دور دورہ ہوا تو تمام موسلان شاہی ایک ایک کر کے علیحدہ کیے گئے تو جناب اشہری کا بھی تعلق سرکار کی روبکاری خدمت سے نہیں رہا اور یہ آپ پر بہت شاق گذرا اس واسطے کہ جو شخص رات دن عیش و عشرت اور سیر و تفریح کے جمگھٹوں میں رہ کر سرکاری فرائض انجام دیتا ہو اور ماتحت حکام پر ایک قسم کی حکومت بھی کرتا ہو اور وہ کسی حاکم کا پیش دست کر دیا جائے تو کیوں کر صبر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے حالات کی وجہ سے ان کو ایک زمانہ تک سکتہ رہا یا جنون ہو گیا مگر پھر سنبھلے اور چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو ان سے کام لینا منظور تھا اس لیے اپنا تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔

حدیقۂ شاہجہانی، گلدستۂ سلطانی، ترانۂ معرفت، ایشیائی شاعری، گلدستۂ اردو، مرقع تاجپوشی، حیات نورجہاں، تاریخ اردو، حیات انیس جیسی تصانیف آپ کے نام کو تاقیامت قائم رکھیں گی۔ آپ کی آخری تصنیف دوازدہ امام مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ ۲۶ مئی ۱۹۱۰ء کو فوت ہو گئے۔ (منبر عالم، ۲۳ جون ۱۹۱۰ء)

مولانا حکیم نور الدین بھیروی

مرزا غلام احمد قادیانی کے جانشین مولانا حکیم نور احمد بنائے گئے جو ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو ۲ بجے دن کے اپنے مکان قادیان میں چند ہفتے بیمار رہنے کے بعد فوت ہو گئے۔ حکیم صاحب ایک فاضل و متبحر عالم دین تھے۔ فن طب نے ان کو اعلیٰ دستگاہ پہنچائی تھی جس کو اپنے نصف صدی کے طویل تجربے سے بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی۔ آپ کے حالات کئی پہلوؤں سے قابل غور اور سبق آموز ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۲۵۸ھ یا ۱۸۴۱ء کے قریب ہوئی۔ آپ نے بچپن میں معمولی تعلیم قرآن شریف کے چند سپارے پڑھے تھے۔ جس قدر استادوں سے آپ کو پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ چندرہ سولہ سال کی عمر کے بعد آپ کی دماغی قوتیں اپنی پوری طاقت

حاصل کر چکی تھیں۔ تحصیل علوم اور مشغل علمی میں آپ کو سخت محنتیں اٹھانی پڑیں۔ آپ نے تحصیل علم کے واسطے مختلف شہروں میں مختلف اساتذہ سے فیض علم حاصل کیا۔ فارسی لاہور میں مفتی محمد قاسم صاحب سے پڑھی۔ آپ کی طب کی تعلیم کی ابتداء پنجاب سے ہوئی مگر آپ کے اصل استاد لکھنؤ کے ایک مشہور حکیم جناب مولوی محمد علی حسین صاحب تھے۔ دو تین سال برابر آپ نے مولوی صاحب سے صرف طب کی تحصیل کی اور آپ کے پاس رہے اور مطب دیکھا۔ چنانچہ اس کام کے لیے آپ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں حکیم صاحب سے درس لینے کے علاوہ مختلف اساتذہ سے مختلف علوم پڑھے۔ خدا کی شان جب آپ کی طبیعت وہاں سے اچاٹ ہوئی اور لکھنؤ سے رامپور آنے کا ارادہ کیا تو انہی دنوں میں آپ کے استاد جناب مولوی علی حسین صاحب کو نواب کلب علی خاں کا تار آیا کہ ایک مریض کے علاج کے واسطے آؤ اگر منظور ہو تو ملازمت بھی دی جائے گی۔ اس موقع پر حکیم صاحب مولانا نورالدین کو بھی رامپور اپنے ہمراہ لے گئے اور اس طرح آپ کو حکیم صاحب سے فیض حاصل کرنے کا پوری طرح موقع ملتا رہا۔ حکیم صاحب کی ابتدا سے یہ رائے تھی کہ استاد سے مجربات کی دریافت کرنا ضروری نہیں اور علاج کرنے میں سب سے ضروری چیز تشخیص ہے۔ تشخیص درست ہو جائے تو علاج کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے استاد سے کسی مجرب نسخہ کی خواہش ظاہر نہیں کی بلکہ استاد نے خود ایک موقع پر بیاض دے دی کہ اسے نقل کر لیں اور اپنے پاس رکھ لیں مگر آپ نے اس بات پر توجہ نہیں دی اور اپنی اعلیٰ تشخیص کی بدولت معرکتہ الآرا علاجوں میں کامیاب ہوتے رہے۔ طب کے علاوہ اور بہت سے علوم فقہ اور حدیث میں بھی بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ علم حساب، اقلیدس اور الجبرا وغیرہ اچھی طرح جانتے تھے۔ غرض کہ ہر فن میں کامل تھے۔ حدیث آپ نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پڑھی۔ حج اور زیارت کے بعد عرب و مصر کی سیر اسی غرض سے کی کہ وہاں سے علوم حاصل کریں۔ طب یونانی کے علاوہ آپ نے ڈاکٹری اور وید ک بھی سیکھی، وید ک ایک پنڈت سے آپ نے پڑھی۔ آپ نے متعدد کتابیں اسلام کی تائید میں لکھیں اور متانت کے ساتھ معترضوں کو دنداں شکن جواب دیے اور بعض تصانیف میں بڑی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ ایسا قابل آدمی مرزا غلام احمد قادیانی کے پھندے میں کیسے پھنس گیا اور اپنا دین و ایمان خراب کر لیا۔

(مخبر عالم ۲۳ مارچ ۱۹۱۴ء)

بسودھ چند ملک

بابو صاحب کو حال میں گرفتار کر کے جلا وطن کیا گیا ہے۔ ان کو بنگالی قوم نے راجہ کا خطاب دیا تھا چونکہ انہوں نے کلکتہ کے قومی کالج کو ایک لاکھ روپیہ دے کر عظیم شہرت پائی تھی اور اس کے علاوہ آپ نے اخبار بندے ماترم

کے لیے بھی سرمایہ بہم پہنچایا تھا جو سڈیشن کی وجہ سے بند اور ضبط ہو گیا تھا۔ بابو صاحب کئی مہینوں سے معہ اپنے تمام قبائل کے بنارس میں رہتے تھے۔ یہاں بھی آپ کے مکانات تھے۔ ان کے گرفتار و جلا وطن کرنے میں بھی بڑی ہوشیاری کی گئی تھی۔ بابو صاحب اپنے گھر سے نہیں پکڑے گئے تھے بلکہ صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کمرہ میں پہلے سے مدعو کئے گئے تھے اور اسی جگہ سے گرفتار ہوئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے آپ کو بذریعہ حکم یاد کیا تھا۔ صبح کا وقت تھا جب مجسٹریٹ صاحب آپ کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں بابو صاحب نے رخصت چاہی کہ ناشتہ کا وقت ہے اجازت دیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہ آپ ٹھہریے آپ کے ناشتہ کا انتظام یہیں ہو جائے گا۔ بابو صاحب کو کچھ خبر نہ تھی کہ معاملہ کیا ہے لیکن بات یہ تھی کہ صاحب مجسٹریٹ بیضی تار کے منتظر تھے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد تار کلکتہ سے وصول ہوا۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس کو سنایا اور بابو صاحب کو دکھایا جس کا مضمون یہ تھا "بلسودھ ملک کو گرفتار کر کے جلاوطن کردو" مجسٹریٹ صاحب نے بابو صاحب کی خواہش پر نصف گھنٹہ کی مہلت دی۔ اس وقت یہ اپنے مکان پر آئے اور قبائل کو، جو اس وقت تک بے خبر تھے، اپنی جلاوطنی کی خبر سنائی اور کچھ ضروری سامان اور نقدی لے کر بابو صاحب واپس آ گئے جن کو اسی وقت خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنے ہمراہ گاڑی میں بٹھا کر شیوپور کے اسٹیشن پر لائے جو چھاؤنی بنارس کے اسٹیشن سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں ڈسٹرکٹ جیل میں بند رہے اور بذریعہ ٹرین فیض آباد بھیجے گئے اور اب وہاں جیل خانہ میں نظر بند ہیں (مخبر عالم، ۲۳ مارچ ۱۹۰۸ء)

مشتری جان مغفور باد

۱۹۳۷ء

مشتری جان ایک کہن مشق شاعرہ جنھوں نے اردو میں اپنی زنانہ شاعری کی نرالی بنیاد رکھی تھی، ہفتہ یکم ستمبر ۱ ۱۹۳۷ء کو پچھتر سالہ عمر میں انتقال کر گئیں ؎

حق مغفرت کرے یہ عجب خوش کلام تھیں

شاعرہ کیا، ساحرہ تھیں جس کسی کو اپنی غزل کے دو چار شعر گا کر سنا دیئے بس اُسے محو و حیرت بنا دیا۔ علم شعر کے ساتھ انہیں فن موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ یہ اُن ہی حُسن فروش حسینانِ بازاری میں تھیں جن کے فیضانِ صحبت حاصل کرنے کے لیے شرفائے قدیم اپنے لڑکوں کو بھیجا کرتے تھے اور وہ ان کی خانہ ساز یونیورسٹی سے مجسمہ تہذیب و بزم آرائی و زبان دانی کی سندیں لے کر نکلتے تھے۔

مشتری جان اور ان کی چھوٹی بہن نظیر جان شکل و صورت میں بے نظیر و بدر منیر تھیں۔ جن کا آفتاب حسن و جمال

اوائل ۱۸۶۵ء کے اس روشن زمانے میں چمکا تھا۔ جب کہ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں تخت رامپور پر جلوہ فرما اور ان کے اکلوتے صاحبزادے رمشتاق علی خاں عرش آشیاں، ولی عہد ریاست تھے۔ اور دہلی و لکھنؤ کی سلطنتوں کے مٹ جانے کے بعد صرف یہ ہی ایک اسلامی ریاست ہر اہل علم و فن کی اعلیٰ قدر و مراتب ہو صلہ افزائی کر رہی تھی۔ چنانچہ مشیر جان کے حسن و حسن کلام کی شہرت کے ساتھ اعلیٰ قابلیت علم موسیقی نے ان کو ریاست رامپور کے محکمہ ارباب نشاط میں ایک نمایاں جگہ پر مامور کر دیا۔ اور نظیر جان بزم ولیعہد کی زیب و زینت بن گئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ امیر، داغ، جلال، منیر، حیا، عروج، وغیرہ جیسے قادر الکلام و مشاہیر شعرا مصاحب دربار رامپور تھے۔ روزانہ مشاعروں و بزم سخن کی رامپور میں گرم بازاری رہتی تھی۔ اکثر شعرا سے حسینان ارباب نشاط کو بھی لگاوٹ تھی چنانچہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت داغ دہلوی کی "کچھ" مشیر جان سے چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تھی اور مشہور ہے کہ رامپور میں جب کلکتہ کی منی جان حجاب ہیرو مثنوی "فریاد داغ" آئی تھیں اور داغ مرحوم کو کلکتہ آنے کی دعوت دے کر رخصت ہو گئی تھیں تو مشیر جان کو یہ سخت شاق گذرا اور وہ اس سرکاری مشاعرہ میں جس میں یہ تمام مشاہیر شعرا شریک تھے۔ اور ہر ایک کی غزل اپنے اپنے رنگ ڈھنگ میں نرالی تھی۔ پہونچ گئیں۔ اور حضرت داغ کے اس شعر پر

غمزہ بھی ہو سفاک نگاہیں بھی ہوں خوں ریز
تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا

پھڑک اٹھیں اور چمک کر اپنی غزل شروع کی جس کے یہ چند شعر مشہور عام ہیں۔

وہ آنکھ نہیں جس میں کہ میں تل نہیں ہوتی — وہ سینہ نہیں جس میں کہ میں دل نہیں ہوتی
رویا میں بھی جاتی ہوں رلا آتی ہیں اس کو — میں خواب میں بھی چھیڑ سے غافل نہیں ہوتی
افلاس کا طرہ ہو سر کذب پہ جس کے — میں عشق کے اس کے کبھی قائل نہیں ہوتی

(حضرت داغ کی طرف دیکھ کر)

کیوں کر کسی "داغی" کا گذر ہو میرے گھر میں — دفتر میں غلط فرد تو داخل نہیں ہوتی
کیوں عشق و محبت ہو کسی غیر سے مجھ کو — میں اپنے سوا اور کی مائل نہیں ہوتی

بعض آدمی کہتے ہیں کہ سفیر مراد آبادی مرحوم شاگرد داغ سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ جس سے بگڑ جانے پر یہ غزل لکھی گئی تھی۔ غرض جو کچھ بھی ہو مشیر جان نہایت سخن فہم و سخن سنج شاعرہ تھیں۔ جو اختتام عہد عرش آشیاں پر اپنے گھر چلی آئی تھیں۔ مگر کچھ عرصہ بعد نواب جنت مکان نے ان کو یاد کر کے ان کی پوتی عزیز جان کی ڈیڑھ سو روپیہ ۱۵۰ ماہوار تنخواہ ارباب نشاط سے مقرر فرما دی تھی۔ جو آخر ۱۹۲۹ء تک جاری رہی۔

مگر نواب جنت مکان کی رحلت کے بعد یہ پھر اپنے گھر واپس آکر اپنی قوم کی چودھرائن بن گئیں۔ اب بھی کبھی کبھی یہ اپنے اشعار ایسے دلکش لب ولہجہ میں سنا دیتی تھیں کہ ہر شخص داد دیئے بغیر نہ رہتا تھا۔ یہ اکثر اشعار سنانے اور گذشتہ تذکرے کرتے کرتے وقت کہا کرتی تھیں کہ حسن چار دن کی چاندنی اور اوجِ گناہوں کا اشتہار تھا وہ رخصت ہوئی یہ ڈھل گیا اب نہ سننے والے رہے نہ سنانے کو دل چاہتا ہے۔ مشتری جان کا حسن وجوانی تو پہلے ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اور ایک ہفتہ ہوا کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔ لیکن ان کی خوش کلامی و شعر گوئی کے تذکرے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

(مخبر عالم ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء)

علمی و ادبی معروف اشخاص جب فوت ہوجاتے تھے تو ان کی رحلت کی خبر کے ساتھ بالعموم ان کے حالات زندگی بھی مخبر عالم میں شائع ہوتے تھے لیکن ایسے بھی حضرات تھے کہ جن کے حالات زندگی اگر دستیاب نہ ہوئے تو صرف ان کی وفات کی خبر شائع کر دی جاتی تھی ایسا اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر شیخ غلام محمد صاحب کے ساتھ ہوا جن کی صرف انتقال کی خبر ۱۵ فروری ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں چھپی۔

شیخ غلام محمد صاحب مالک و ایڈیٹر اخبار وکیل امرتسر کی وفات حسرت آیات، جو میو ہسپتال لاہور میں واقع ہوئی، درحقیقت کئی پہلوؤں سے ایک دردناک قومی حادثہ ہے جس پر قوم کے علمی و ادبی حلقوں میں عموماً اور اردو کی اخباری دنیا میں خصوصاً سخت رنج و افسوس ظاہر کیا جا رہا ہے۔ چونکہ شیخ صاحب کی ذات بابرکات ہزاروں خوبیوں کا مجموعہ تھی اور قومی ضروریات اور ابنائے جنس کی خدمت و امداد کا ایک زبردست حق وہ اپنے وقت، محنت اور روپیہ پر تسلیم کرتے تھے وہ اصولوں کی پابندی کو جملہ اقسام کے تجارتی و مالی فوائد پر مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے ملک و قوم اور زبان کی خدمت یک متین اور بے لاگ پالیسی اپنے اخبار کے لیے ٹھہرا رکھی تھی۔ آپ کی تواضع اور انکساری اور بالخصوص ان کی مہمان نوازی زمانہ سابق کے سچے مسلمانوں کا ایک نمونہ دکھاتی تھی اور روزمرہ کی زندگی میں کثیر التعداد طریقوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ ایک ایسے بزرگ کا کئی ضروری اداروں مثلاً وکیل ٹریڈنگ کمپنی و انجمن ترقی تعلیم مسلمانان کو بے سرپرست و نامکمل چھوڑنا یقیناً سخت افسوسناک ہے اور قوم کو ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ و پسماندگان کے صبر و تحمل کی توفیق پانے کی دعا مانگنے کے ساتھ ان کے کاموں کی حفاظت پر مستعد ہونا چاہیئے کہ آپ کا یادگار اخبار وکیل قائم و دائم رہے۔

(مخبر عالم ۵ فروری ۱۹۱۲ء)

تبصرے

مسیحا

یہ وہ چیز کا گلدستۂ شعر و سخن ڈاکٹر محمد حسین صاحب نے امرت سر پنجاب سے ماہوار شائع کرنا شروع کیا ہے جس میں علاوہ پنجابی شعراء کی غزلیات کے کچھ طبی مضامین و ظرافت و خبریں بھی درج ہوتی ہیں، جن کو منشی مولا بخش صاحب کشتہ امرت سری ترتیب دیتے ہیں۔ پنجابی شعراء کے نداز سخن و رنگِ طبیعت کے دیکھنے والے ضرور ایک روپیہ سال پیشگی بھیج کر خرید فرمائیں۔

(مخبرِ عالم مرادآباد ۸ مارچ ۱۹۰۸ء)

مخبرِ دکن

مدراس و دکن جہاں حشرات الارض کی طرح اخبارات شائع ہوتے ہیں اور برساتی کیڑوں کی طرح بہت سے ہر سال جاری ہو کر بعد موسم بند ہو جاتے ہیں۔ ان میں صرف چند اخبارات سربر آوردہ و قابلِ قدر ہیں جن میں ایک "مخبرِ دکن" مدراس بھی ہے۔ جس کا قابل و لائق ایڈیٹر و مالک مولوی سید محمد عبدالقادر صاحب ایک ہمدرد ملکی و قومی خیر خواہ و ہی خواہ شخص ہیں۔ یہی وہ اخبار ہے جو مدراس میں رہ کر دکن کی پوری خدمت کرتا ہے اور اراکان سلطنت و سلطنت کا نہایت ہمدرد و خیر خواہ ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کام میں حصہ لیتا ہے۔ ہر چند یہ اخبار جس طرح اپنے ادائے فرضِ منصبی میں مشہور و معروف ہے۔ اسی طرح سلطنتِ آصفیہ کے عطیات سے محروم ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ پرچہ اپنے آزاد خیالات کو کسی صبح کی زیر نہیں چھوڑ سکا۔ ورنہ باہر کے لوگ فیض اٹھائیں اور گھر کا پرچہ محروم رہے۔ کسی ایسے خیال کے ایڈیٹر مستثنیٰ سے ہیں اور ایسی روش کے اخبار کم پائے جاتے ہیں۔

(مخبرِ عالم مرادآباد ۸ مئی ۱۹۰۸ء)

اخبارِ عام

اخبارِ عام لاہور کا مشہور اخبار تھا۔ اس میں بڑے لائق و تجربے کار ایڈیٹروں نے کام کیا ہے۔ اس کا اشتہار نثر میں اور منظوم بھی شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۹۰۸ء کے مخبر عالم میں حسبِ ذیل منظوم اشتہار شائع ہوا۔

عام اک لاہور کا اخبار ہے — جس سے سارا ہند واقف کار ہے
پورے پینتیس ۳۵ سال سے جاری ہے یہ — سقم سے اور عیب سے عاری ہے یہ
مشتری اس کے ہر اک فیشن کی ہیں — جاتا ہے یہ ہر معزز ہاتھ میں
کون سا ہے حصۂ روئے زمیں — جس جگہ اس کے نہیں ہیں ناظریں
اعلیٰ ہے اسٹاف ایڈیٹوریل — ہوتے ہیں جس کے مضامیں برمحل
عام روزانہ و ہفتہ وار ہے — پھولتا پھلتا ہوا گلزار ہے
ہے برائے نام قیمت عام کی — قدر ہے گو مثل جم کے جام کی
چار دہ بس قیمتِ روزانہ ہے — شوق سے دیتا ہے جو فرزانہ ہے
ڈھائی سالانہ ہیں ہفتے وار کے — مشتری قائل ہیں اس بیوپار کے
مجموعہ کی نو روپیا سال ہے — مالکوں کی ہمتوں پر دال ہے

فیض پہونچاتا ہے یہ اخبارِ ملک
اس سے مالامال ہیں تجّارِ ملک

(مخبر عالم مراد آباد ۸ فروری سنہ ۱۹۰۸ء)

الفصیح

اس نوشیوع اخبار کا پہلا نمبر ۳ مئی کو بریلی سے شائع کیا گیا ہے۔ ایڈیٹر و پروپرائٹر جناب حکیم فصیح الزماں صاحب آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ بارہ صفحہ کا اخبار ہے، لکھائی چھپائی معمولی ہے۔ مضامین اس کے لائق ایڈیٹر کی اعلیٰ دماغ سوزی کا پتہ دے رہے ہیں اس کا پہلا مضمون جو "ہمارے اغراض و مقاصد" کے عنوان سے لکھا گیا ہے، قابلِ دید ہے۔ اس کا دوسرا اعلیٰ مضمون قابلِ تعریف ہے۔ لیکن ہر صفحہ میں مجربہ ادویات کا اشتہار بھی شامل ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ الفصیح نہ فقط ملک کی خدمت کرنے والا پرچہ ہے بلکہ جواہرات طبی سے بھی ملک کو باخبر کرتا رہے گا۔ اور حکیم صاحب کی مجربہ ادویات عام طور پر ملتی رہیں گی۔ یہ پرچہ ۳-۱۱-۱۹-۲۶ کو شائع ہوا کرے گا۔ جس کی ادنیٰ قیمت تین روپے بارہ آنے ہے۔ لیکن اس کا دوسرا نمبر اب تک ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ہر چند کہ بریلی میں کچھ اخبارات کی کمی نہیں ہے لیکن بڑھتی دولت کس کو بری لگتی ہے۔ خدا کرے یہ پرچہ ترقی کرے اور اپنے ملک و گورنمنٹ کا خیر خواہ اخبار ثابت ہو۔

مخبر عالم مُرادآباد، ۱۶ مئی ۱۹۰۹ء

المیزان

" دو تین ہفتہ سے اس نام کا ہفتہ میں دو بار شائع ہونے والا آٹھ صفحہ کا اخبار علی گڑھ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ جس کے ایڈیٹر خواجہ امیر علی صاحب ہیں۔ اب تک جس قدر المیزان کے نمبر شائع ہو چکے ہیں ان سے ایڈیٹر کی عمدہ قابلیت کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ خدا کرے اس اخبار کو حسب منشا کامیابی حاصل ہو کہ علی گڑھ اخبار سے خالی نہ رہے۔ المیزان کی قیمت بھی چنداں گراں نہیں صرف پانچ روپے سالانہ ہے "

(مخبر عالم مرادآباد، یکم فروری ۱۹۱۵ء

آل انڈیا شیعہ گزٹ

زتیبوع، عبارت میں عموماً اور شیعہ پرچوں میں خصوصاً یہ اخبار قابل وقعت ہے۔ اگرچہ یہ اخبار اسی سال جاری ہوا ہے مگر اپنی عمر کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ اول ہر ماہ میں دوبار شائع ہوتا تھا مگر اب مہینے میں تین بار یکم، ۱۱ اور ۲۱ کو نکلنے لگا ہے اور اس کی ترقی کو دیکھتے ہوئے امید ہوتی ہے کہ یہ ضرور مارچ ۱۹۱۱ء تک حسب وعدہ ہفتہ وار ہو جائے گا۔ اس وقت تک شیعہ فرقہ کے جس قدر اخبارات اور رسائل شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں ان سب میں اس اخبار کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ یہ کسی بحث و مباحثہ میں حصہ نہیں لیتا۔ بلکہ آزادی کے ساتھ اخباری فرائض کو نہایت عمدگی سے ادا کرتا ہے اور ہر قوم و ہر فرقہ کی مساوی خدمت میں مصروف ہے۔ اگرچہ اس کے نام سے ایک خاص فرقہ کی طرفداری ظاہر ہوتی ہے مگر نہیں یہ ایک عام اخبار ہے، اس اخبار کا نام سن کر ہر کوئی شبہ میں پڑ سکتا ہے لیکن اس کے مضامین دیکھ کر اس کا یہ شبہ یقیناً دور ہو جائے گا اور وہ اس اخبار کے لائق ایڈیٹر کی مرنجان و مرنج پالیسی کا ضرور اعتراف کریگا لیکن ایسی حالت میں تعجب ہے کہ ایک ایسے عام اور مفید اغراض و مقاصد کے اخبار کو کیوں ایسا نام رکھ کر شبہ میں ڈالا گیا ہے اور اس کی مناسب اصلاح کیوں نہیں کی جاتی۔ اس اخبار کی ضخامت بارہ صفحات ہے، لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ قیمت تین روپے سالانہ ہے لیکن ضرورت ہے کہ یہ قیمت اخبار کی رفتار ترقی کے ساتھ قدم بہ قدم نہ چلے خواہ یہ ہفتہ وار ہو یا اس کی ضخامت بڑھ جائے۔ ایسی حالت میں یقیناً شیعہ گزٹ کو اپنے ارادے میں پوری کامیابی ہوگی۔ اہل ملک کو ایسے ہونہار پرچہ کی ضرور قدر کرنی چاہیے۔

درمجبر عالم مرادآباد، ۱۵ نومبر ۱۹۱۰ء

ادیب

اس ہونہار رسالہ نے جنوری ۱۹۱۰ء سے جاری ہو کر سرمایۂ اردو میں ایک قیمتی اضافہ کر دیا ہے۔ گو ہندوستان میں اس وقت چند رسالے قابلِ تعریف شائع ہو رہے ہیں مگر یہ رسالہ اپنی طرز و نوعیت میں آپ اپنی نظیر ہے جو ۱۸ × ۲۲ کی کتابی ڈبل تقطیع ور ۴۰ صفحات پر شائع ہوتا ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم ہیں جو معمولی تقطیع کے ۱۰۰ صفحے سے ہرگز کم نہیں۔ اس میں تصاویر و مشہور و معروف عمارات کے نقشے قابلِ دید دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض بعض تصاویر کے ساتھ ان کے حالات بھی نہایت دلکش پیرایہ میں لکھے جاتے ہیں۔ نوبت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی کی ایڈیٹری کے علاوہ اس رسالہ میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز اپنا زورِ قلم دکھا رہے ہیں۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ قسم کی ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ و نفیس۔ غرض ہر طرح یہ رسالہ قابلِ قدر ہے۔ قیمت صرف چار روپے سالانہ مقرر ہے۔ نمونہ چھ آنے کے ٹکٹ بھیجنے سے ملتا ہے۔ شائقین انڈین پریس، الہ آباد سے درخواست کر کے اس شاہدِ رعنا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

(مخبرِ عالم مراد آباد ۸ مارچ ۱۹۱۰ء)

بیدر گزٹ

ایک عرصہ سے بیدر گزٹ بیدر ضلع محمد آباد علاقہ حیدرآباد دکن سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے جو علاوہ اپنے ملک کی خدمت کے عام اخباری حیثیت سے بھی حیدرآباد دکن کے اور اخبارات میں ممتاز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی طرف نظامِ حکومت یا اس ملک والوں کی اتنی بھی توجہ نہیں جتنی کہ حیدرآباد یا دوسرے مقامات کے اخبارات کی طرف ہے ورنہ بیدر گزٹ اب تک کچھ کا کچھ نظر آتا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ ہونہار پرچہ جب کسی قریبی گورنمنٹی علاقہ میں منتقل ہو گا تو اس کے ایڈیٹر کی وسیع معلومات اور آزاد خیالی سے ضرور فائدہ پہونچائے گی اب تو گھر کے پیروں کو تیل کے ملیدے کی ضرب المثل اس پر صادق آتی ہے۔ اس کے مضامین لکھائی چھپائی کاغذ سب موزوں ہیں ایڈیٹر کی قابلِ قدر خدمات قابلِ تعریف ہیں۔ ۲ روپے قیمت مقرر ہے۔ شائقین حضرت کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

(۵/مارچ ۱۹۱۱ء)

اتحاد

"جس نے صرف اسلام کا لفظ چھوڑ کر اخبار کا جامہ پہنا ہے، دیکھئے کس خاص رنگ کو اختیار کرتا ہے۔ جس کی حالت آئندہ چل کر شاید کچھ معلوم ہو۔ لیکن ہم خوش ہیں کہ ہمارے شہر میں اور دو نوشیوع اخبارات کا اضافہ ہوا۔ بقول کسے بڑھتی ہوئی دولت کس کو بری لگتی ہے۔ اس کے لئے بھی ہم کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔"

(مخبر عالم مراد آباد، ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

اخبار مدینہ

"بجنور سے اس نام کا اخبار شروع مئی سے شائع ہوا ہے جس کے اس وقت تک چار پانچ نمبر ہمارے پاس آچکے ہیں اور ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر مشہور کہنہ مشق حافظ نور الحسن صاحب اور سب ایڈیٹر لائق حسین صاحب قوتی امروہوی ہیں۔ منشی مجید حسن صاحب منیجر اخبار صحیفہ بجنور اس کے مالک و مہتمم ہیں۔ گو اس وقت تک یہ اخبار ایک عام اخباری روش پر قائم ہے۔ جس میں بے ضرورت مضامین نثر اور بیشتر نظم کا حصہ پایا جاتا ہے اور اکثر مناجاتیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ جن کی اخبار میں ہرگز ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن امید ہے کہ لائق ایڈیٹر اور تجربہ کار مالک اس اخبار کو اسم با مسمی ثابت کرنے کی جلد کوشش کریں گے۔ اس ۱۶ صفحہ والے اخبار کا جو اچھے کاغذ پر خوشنما چھپتا ہے صرف تین روپے سالانہ چندہ ہے۔"

(مخبر عالم مراد آباد، یکم مئی ۱۹۱۲ء)

الہلال

"رویت ہلالِ عید کا جس طرح عام انتظار و اشتیاق ہوتا ہے اسی طرح ملک اب الہلال کلکتہ کا ہر ہفتہ نہایت شوق بھری نگاہوں کے ساتھ راہ دیکھتا رہتا ہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور بےچینی پیدا ہوئی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا ہے کہ کیا الہلال آیا۔ ماہوار رسالوں، میگزینوں اور جرنلوں کے علاوہ ہفتہ وار اور ہفتہ میں دو بار بلکہ روزانہ اخبارات کا اب وہ اشتیاق نہیں جو الہلال کا پایا جاتا ہے۔ اس کی اعلیٰ چھپائی اور خوشنما ٹائپ کے حروف، رنگین ٹائٹل پیج کے بعد اعلیٰ چکنا سفید کاغذ، دلکش تصاویر، قابلِ قدر مضامین دیکھ کر ہر شخص اس کا معترف ہے کہ الہلال اپنے رنگ ڈھنگ میں سب سے جدا اور نہایت کار آمد و قابلِ قدر اخبار ہے۔ ور ایک ایسے مصوّر اخبار کی دراصل ملک کو سخت ضرورت تھی۔ اس کمی کو مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی نے الہلال نکال کر نہایت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ الہلال جیسے ہفتہ وار مصوّر اخبار نے شائع ہو کر فی الواقع اخباری دنیا میں ایک نمایاں اور قیمتی اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے بعد خود الہلال پر کی ضخامت اور علاوہ طرابلس کے جنگی فوٹو کے دیگر تصاویر کے عدمِ انتظام کا شاکی ہے جس کی وجہ شاید اس کا بھاری خرچ ہے جو آٹھ روپے سالانہ سے پورا نہیں ہو سکتا۔

مولانا صاحب اور کسی قسم کی امداد قبول نہیں کرتے۔ اکثر حضرات نے امدادیں دیں خود درخواست کر کے قیمتوں میں اضافہ چاہا مگر حضرت آزاد نے ایسی تمام امدادیں اور اضافہ کی درخواستیں شکریہ کے ساتھ یہ کہہ کر واپس کر دیں کہ الہلال بجز اپنی مقررہ قیمت کے اور کسی قسم کی کوئی امداد و اضافہ قبول نہیں کر سکتا نہ ایسی امداد و اضافہ چندہ سے کوئی اخبار ترقی کر سکتا ہے۔

اب ایسی حالت میں بجز کثرتِ اشاعت اور کیا ذریعہ ترقی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ملک کو سخت ضرورت ہے کہ اس ہونہار اخبار کی قدر کرے۔"

(مخبر عالم مراد آباد، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۲ء)

فانوسِ خیال

"یہ رسالہ ۱۸ × ۲۲ سائز کی کتابی تقطیع پر پچاس صفحہ ماہوار کا پٹھان کوٹ، پنجاب سے بیادگار حیات بخش صاحب رسا مرحوم محمد عبدالمجید صاحب سالک بٹالوی کی ایڈیٹری میں اس مہینے سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ جس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔

اس میں تقریباً چھ سات مختلف حضرات کے مضامین اور چند غزلیں درج ہیں اور صرف ایک غزل رسا صاحب مرحوم کی منجملہ دیگر غزلیات کے نظر آتی ہے۔

اس کا ٹائٹل پیج دیکھ کر ہمارا خیال ہوا تھا کہ اس میں رسا مرحوم کا وہ کلام ہے جو اس وقت تک محتاجِ طبع و اشاعت ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی کا ایک بہت بڑا حصّہ اس میں ہوگا۔ ان کے مختلف مضامین میں بعض بعض مضمون ضرور قابلِ قدر ہیں۔ یہ رسالہ آب و تاب سے شائع ہوتا ہے ہم فانوسِ خیال کی موجودہ شکل و صورت کو نہایت پسند کرتے ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہت عمدہ ہے۔ سالانہ دو روپے گراں نہیں ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ جلد ترقی کرے۔

(مخبرِ عالم مرادآباد، ۱۵ جون ۱۹۳۱ء)

شجرہ نسب

حضرت امام رضا علیہ السلام

- مولانا محمد صالح
- [illegible]
- محمد یعقوب
- محمد اکرام
- سید منور علی
  - از زوجہ اول: فتحیاب علی
    - قاسم علی
      - فیاض علی
        - کاظم علی
      - قربان علی
        - مظہر علی
      - املاک علی لاولد
      - ہاشم لاولد
    - اسد علی لاولد
  - ظفریاب علی
    - قمر علی
      - معصوم علی رنجور
        - سید صمصام علی صمصام
        - برجیس حسین لاولد
    - قاضی سید ولایت علی
      - قاضی جمشید علی تجم
        - از زوجہ اول: قاضی عبد العلی عابد
          - قاضی عابد علی جوہر
            - حیدر علی
              - فاران حیدر
                - عدنان حیدر
              - رضوان حیدر
                - فرزندان رضوان حیدر: عمران حیدر، جبران حیدر، ذیشان حیدر
              - کامران حیدر
                - سلمان حیدر
            - مظہر علی
              - مسعود مظہر
                - ارسلان مظہر
              - فیروز مظہر
              - منصور مظہر
        - از زوجہ دوم: ابو العلی
          - محمود علی لاولد
    - نجف علی خواہاں
      - محمد علی جوہر لاولد
      - خورشید علی
        - از زوجہ اول:
          - ظفر علی لاولد
          - منور علی
            - رضا علی
              - منظر علی
              - محفوظ علی
            - شاکر علی لاولد
            - فرحت علی
              - ارشد علی
              - زبیر علی
              - اسد علی
          - منظور علی
            - یونس علی
              - شعیب یونس
                - تنویر شعیب
                - کاشف شعیب
        - از زوجہ ثانی:
          - اصغر علی
            - انور علی لاولد
          - اختر علی
            - کمال اختر
              - معظم کمال
            - قمر اختر
            - سید خرم
          - انس علی
  - از زوجہ ثانی: نصرت علی
    - وزیر علی
      - نظر علی
        - نیاز علی
          - صادق علی
            - شاکر علی
            - صابر علی
          - مقصود علی
          - غفور علی لاولد
    - امیر علی لاولد

یہ خاندان ... ہجرت کر گئے

شجرہ وخاندانی احوالِ وابستگان

محضرِ عالم

و

حوالہ جات

قاضی جمشید علی کا سلسلۂ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ حضرت مولانا محمد صالح عالمگیر بادشاہ کے اتالیق تھے، در فتاویٰ عالمگیر کے مولفین میں تھے۔ چنانچہ قاضی سید جمشید علی صاحب جم مرادآبادی نے اپنی مشہور تالیف "خمخانۂ جاوید" کے صفحہ ۲ پر اپنے خاندان کے بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔

"امیدوار کرم قاضی سید جمشید علی جم من اولاد حضرت امام رضا علیہ السلام ابن حضرت قاضی سید ولایت علی ابن قاضی سید محمد منور علی صاحب قاضی القضات ملک کٹھیر نبیرہ مولانا محمد صالح صاحب عربی اتالیق شہنشاہ عالم پناہ محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر غازی۔" (۲)

اسی طرح ہندوستان کے مشہور و معروف مورخ و صحافی مولوی نصرت علی صاحب قیصر دہلوی ایڈیٹر نصرت الاخبار دہلی نے آپ کے ان بزرگوں کا اپنی تصنیف "تواریخ اخبارات ہندوستانی" میں ذکر کیا ہے۔

"قاضی سید جمشید علی صاحب جم ایڈیٹر جام جمشید مرادآباد۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ محمد صالح بادشاہ عالمگیر کے اتالیق تھے۔"

لیکن خلیفہ سید محمد حسین صاحب نے تاریخ برنیر میں جس میں ملا صالح کا ذکر فرانسیسی برنیر نے کیا ہے اسکے حاشیہ میں ملا عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں عالمگیر کے استادوں کا ذکر ہے لکھا ہے کہ عالمگیر کے ملا صالح کوئی استاد نہیں تھے۔ لیکن خلیفہ جی کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ملا صالح کا ذکر صرف برنیر نے ہی نہیں بلکہ منوچی نے بھی کیا ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اگر ایک کتاب میں کسی کا ذکر نہیں کیا گیا اور دوسری کتابوں میں ہے تو ان کتابوں کو تسلیم نہ کیا جائے۔ منوچی اور برنیر اس دور کے دو مشہور مورخ ہیں۔ بھلا ان کو کیوں نہ تسلیم کیا جائے اور کیوں نہ ان کی تحریر پر اعتبار کیا جائے۔

البتہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ غیر ملکی سیاحوں اور بطورِ خاص انگریزی سیاحوں نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنے کی بڑی ناپاک کوشش کی اور ہر صورت سے ان کو بدنام کیا ہے۔

برنیر نے ملّا صالح کا ذکر اپنے سفر میں اگر کیا ہے تو اس نے یہاں بھی اپنی عادت و خصلت اور ناپاک طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالمگیر اپنے ضعیف العمر استاد کی بھی بے عزتی کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اس سے وہ توہین آمیز سوالات کرتا ہے۔ جو یہ ہیں۔

• جس مہینے سفیر ایران اپنے ملک کو واپس گیا تو صالح کی دربار میں مشہور آؤ بھگت ہوئی۔ یہ بڈھا عالمگیر کا استاد تھا اور ایک مدت سے اپنی جاگیر میں جو شاہجہاں نے اسے دے رکھی تھی رہتا تھا۔ جب س نے سنا کہ شاہزادوں کی باہمی لڑائیاں ختم ہو چکی ہیں اور اس کے شاگرد نے اپنی اولوالعزمانہ تجویزوں میں پوری کامیابی حاصل کر لی تو فوراً دہلی میں آیا۔ اور اس کو پوری امید تھی کہ اب امارت کا درجہ بہت جلد حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ جو لوگ دربار میں ذی وجاہت تھے سب کو اس نے اپنے جانبدار بنالیے تھے یہاں تک کہ کئی شخصوں بلکہ روشن آرا بیگم نے بھی اورنگ زیب کو یاد دلایا کہ آپ کا قابل استظیم اور کامل الاخلاص استاد عزت و اکرام کا ضرور مستحق ہے۔ مگر تین مہینے تک تو اس نے یہ بھی جاننا نہ چاہا کہ وہ دربار میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن آخر کار جب اس کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا تو حکم دیا کہ ملّا صاحب خلوت کے دربار میں حاضر ہوں جہاں صرف حکیم الملک دانشمند خاں اور تین چار اور امیر جو علم و فضل میں مشہور ہیں موجود رہتے۔ اگرچہ میں اس موقعہ پر حاضر نہ تھا اور ہوتا بھی تو نا ممکن تھا کہ اس طول طویل گفتگو کو یاد رکھتا جو اورنگ زیب نے ملّا سے کی تھی مگر جو کچھ اپنے آغا کی زبانی میں نے سنا ہے کچھ شک نہیں کہ اس کا مطلب حسب ذیل تھا یعنی اورنگ زیب نے فرمایا۔

• ملّا جی! براہ مہربانی یہ تو فرمایئے کہ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں۔ ؟ کیا آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے امراء میں داخل کر لیں ؟ لیکن اس سے پہلے اس بات کا ثابت کرنا ضروریات سے ہے کہ آپ کسی نشان عزت کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ اگر آپ مستحق ہوتے، آپ ہم کو ایک تربیت یافتہ نوجوان شخص بتایئے تاکہ ہم بتادیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کی بابت شکر گذاری کا زیادہ مستحق اس کا باپ ہے یا اس کا استاد۔ فرمایئے تو سہی کہ آپ کی تعلیم سے کون سی واقفیت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ نے تو مجھ کو یہ بتایا تھا کہ تمام فرنگستان ایک چھوٹے سے جزیرے سے زیادہ نہیں ہے۔ جس میں سب سے بڑا بادشاہ اوّل شاہ پرتگال تھا، پھر بادشاہ ہالینڈ ہوا، اور اس کے بعد شاہ انگلستان اور فرنگستان کے اور

بادشاہوں مثلاً فرانس، اور اندلس کے بارے میں آپ یہ بتایا کرتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے موافق ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں صرف ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہی ایسے بادشاہ ہوئے ہیں جن کے آگے تمام دنیا کے بادشاہوں کی شان مدھم ہے اور یہ کہ ایران، ازبک، کاشغر، تاتار، پیگو، سیام، چین اور ماچین کے بادشاہ سلاطینِ ہند کے نام سے کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ آپ کی اس جغرافیہ دانی اور کمال تاریخ کا کیا کہنا ہے کہ مجھ جیسے شخص کے استاد کو لازم نہ تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مجھے مطلع کرتا، مثلاً ان کی قوتِ جنگی سے، ان کے وسائلِ آمدنی اور طرزِ جنگ سے، ان کے رسم و رواج اور مذاہب اور طرزِ حکمرانی سے اور خاص خاص امور سے جس کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ یہ تفصیل اور جدا جدا مجھ کو آگاہ کرتا اور علمِ تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا تاکہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسباب ترقی و تنزلی اور ان حادثات و وقعات اور غلطیوں سے واقف ہو جاتا جن کے باعث ان میں ایسے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے رہے ہیں اور قطع نظر اس سے کہ آپ مجھ کو بنی آدم کی وسیع اور کامل تاریخ سے آگاہ کرتے۔ آپ نے تو ہمارے ان مشہور و معروف بزرگوں کے نام بھی اچھی طرح نہیں بتائے جو ہماری سلطنت کے بانی تھے اور ان کی سوانح عمری اور ان خاص اطوار کی لیاقتوں سے جن کے باعث وہ بڑی بڑی فتوحات کرنے کے قابل ہوئے۔ ان فتوحات سے پہلے جو واقعات ظہور میں آئے ان سے بھی ناواقف رکھا اور باوجودیکہ بادشاہ کو اپنی ہمسایہ قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے بجائے ان کے آپ نے مجھ کو عربی لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اگرچہ اس زبان کے سیکھنے میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوا مگر بے شک آپ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ مجھ پر ایک ایسی زبان کے سکھانے سے جو دس بارہ برس برابر محنت کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ایک دائمی احسان کرتے ہیں۔ آپ نے بغیر یہ سوچے کہ ایک شاہزادہ کو زیادہ تر کن کن علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ صرف صرف و نحو اور ایسے فنون کی تعلیم کو جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہیں مقدم جانا اور ہماری جوانی کے ایام کو بے فائدہ اور لفظی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کیا،، بس یہ الفاظ تھے جن میں اورنگ زیب نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا لیکن بعض پڑھے لکھے آدمی یا تو بادشاہ کی خوشامد اور اس کے کلام کی قوت دکھانے کو یا ملا صالح کے حسد کے مارے یوں کہتے ہیں کہ بادشاہ کا ملامت کرنا اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے دوبارہ ملا کو کہا:-

"کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ بچپن میں جب کہ قوتِ حافظہ قوی ہوتی ہے ہزاروں معقول

باتیں ذہن نشین ہو سکتی ہیں اور آسانی کے ساتھ انسان ایسی مفید تعلیم حاصل کر سکتا ہے کہ جن سے دل میں نہایت اعلیٰ خیال پیدا ہو جاتے ہیں اور انسان بڑے بڑے نمایاں کاموں کے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ سے ادا ہو سکتی ہے اور ہماری اصل زبان میں اسی طرح نہیں ہو سکتی اور تحصیلِ مسائلِ شرعیہ کیا زبان عربی پر موقوف ہیں آپ نے ہمارے والد ماجد کو تو یہ سمجھا دیا کہ ہم اسے فلسفہ پڑھاتے ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ آپ برسوں ایسے بیہودہ اور لغو مسائل سے میرے دماغ کو پریشان کیا کیے۔ جن کے حل ہو جانے کے بعد بھی اطمینانِ خاطر حاصل نہیں ہوتا اور معاملاتِ دنیاوی میں کبھی کار آمد نہیں ہوتے اور وہ صرف ایسے غیر معین اور فضول خیالات و توہمات ہیں جو سمجھ میں تو بڑی مشکل سے آتے ہیں مگر بہت ہی جلد پھر بھول جاتے ہیں اور جن کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ دماغ پریشان اور عقل خبط ہو کر آدمی منھ زور اور ہٹیلا ہو جاتا ہے کہ لوگ اس سے دق ہو جائیں۔ بیشک آپ نے میرے اوقاتِ گراں مایہ کے کئی سال ایسے مسائلِ مفروضہ کی تعلیم میں جو آپ کو مرغوب تھے، صرف کر دیئے۔ مگر جب میں آپ کی تعلیم سے علیحدہ ہوا کسی بڑے علم کے جاننے کا فخر نہیں کر سکتا تھا بجز اس کے کہ ایسی چند عجیب اور غیر معروف اصطلاحوں سے واقف تھا جو ایک عمدہ سمجھ کے نوجوان شخص کی صحت کو شکستہ، دماغ کو مختل اور طبیعت کو حیران کر دیتی ہیں اور جو مدعیانِ فلسفہ کے جھوٹے دعووں اور جہالت کے چھپانے کی خاطر آپ کی مانند لوگوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ وہ عقل و دانش میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کی تاریک اور مشتبہ المفہوم جق بق بق میں ایسے بہت سے دقائق ہیں جو بجز ان کے اور کسی کو معلوم نہیں گھڑلی گئی ہیں۔ اگر آپ مجھ کو وہ فلسفہ سکھاتے جس سے ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ بغیر برہان اور دلیلِ صحیح کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا آپ مجھ کو ایسا سبق پڑھاتے جس سے انسان کے نفس کو ایسا شرف اور علو حاصل ہو جاتا ہے کہ دنیا کے انقلابات سے متاثر نہیں ہوتا اور ترقی و تنزل کی حالت میں ایک سا رہتا ہے۔ یا تم مجھے انسان کے لوازمِ فطرت نیچر سے واقف کراتے یا مجھے ایسے طریقِ استدلال سے عادی بناتے کہ تصورات و تخیلات کو چھوڑ کر ہمیشہ اصولِ صادقہ بدیہہ کی طرف رجوع کرتا اور عالم مافیہا کے حقائقِ واقعیہ اور اس کے کون و فساد کی ترتیب و نظام کے معارفِ یقینیہ سے مجھے مطلع کرتے۔ اور جو فلسفہ آپ نے مجھے تعلیم کیا ہے وہ ایسے مسائل پر مشتمل ہوتا تو میں اس سے بھی زیادہ احسان مانتا جتنا کہ سکندر نے ارسطو کا مانا تھا اور ارسطو سے بھی

زیادہ آپ کو انعام عطا کرتا۔ طبعی ناقدردانی کا الزام جھوٹا خواہ مخواہ مجھ پر نہ لگایئے۔ کیا تم یہ نہ جانتے تھے کہ شاہزادوں کو اتنی بات تو ضرور سکھانی چاہیے تاکہ ان کو رعایا سے اور رعایا کو ان کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا لازم ہے۔ اور کیا تم کو اول ہی یہ خیال کر لینا واجب نہ تھا کہ میں کسی وقت تخت وتاج کی خاطر بلکہ اپنی جان بچانے کے لیے تلوار پکڑ کر اپنے بھائیوں سے لڑنے پر مجبور ہوں گا۔ تم خوب جانتے ہو کہ سلاطین ہند کی اولاد کو ہمیشہ یہی معاملے پیش آتے رہے ہیں پس کیا تم نے لڑائی کا فن یا کسی شہر کا محاصرہ کرنا یا فوج کی صف آرائی کا طریقہ مجھے سکھایا تھا۔ مگر میری خوش طالعی تھی کہ میں نے ان معاملات میں ایسے لوگوں سے کچھ سیکھ لیا تھا، جو تم سے زیادہ عقلمند تھے۔ پس اپنے گاؤں چلے جایئے اب کے بعد کوئی نہ جانے کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے۔" (۲۸۱)

یہ جہل خیالات جو برنیر نے عالمگیر سے منسوب کئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کوئی سمجھ دار کسی معقول آدمی کے متعلق نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ان خیالات کا اظہار کیا ہوگا۔

مذکورہ عبارت کا آخری فقرہ "آپ گاؤں چلے جایئے اس کے بعد کوئی نہ جانے کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے" ایسے غیر شریفانہ اور اخلاق سوز فقرے انتہائی بدتمیز انسان بھی اپنے استاد کی شان میں نہیں کہہ سکتا۔

"کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے" یہ بات کوئی دیندار، متشرع پکا و سچا مسلمان اپنی زبان سے کبھی نہیں نکال سکتا بجا کہ عالمگیر جیسا پابند شرع، مذہب کا شیدائی، مسلمہ شعائر اسلام کے منافی خیالات کا اظہار کرے گا یہ ناممکن ہے۔

برنیر کے نزدیک استاد کو عالم الغیب بھی ہونا چاہیے" پٹے باز بھی ہو، بنوٹ کا فن بھی جانتا ہو، گھوڑ سواری بھی سکھاتا ہو تیر اندازی کا بھی ماہر ہو، مورخ ہو، جغرافیہ کے فن سے بخوبی واقف ہو، علم تصوف میں ملکہ رکھتا ہو، معاشیات کے مسائل میں بھی دسترس حاصل ہو۔ یہ محال ہے لیکن برنیر اپنے ان خیالات کو عالمگیر سے منسوب کرتا ہے، جو صحیح نہیں ہیں۔ برنیر نے اپنے اسی سفرنامے میں عالمگیر کے لڑکوں اور لڑکیوں پر انتہائی شرمناک الزام لگائے ہیں جو سرتاپا غلط ہیں، اور ان کی کوئی بھی اصلیت نہیں ہے۔ اگر عالمگیر کے خیالات برنیر کے لکھنے کے مطابق ہوتے تو وہ نماز عربی کے بجائے اردو یا ہندوستانی اور کسی دوسری زبان میں ادا کرواتے اور طریقۂ تعلیم میں تبدیلی کرتے۔ اپنے نظریہ کے مطابق عالمگیر اپنے دور میں دقیانوسی خیالات کے علماء کی جگہ ترقی پسند علماء دینی مدارس میں مقرر کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ جو کچھ برنیر عالمگیر کے خیالات کے بارے میں لکھتا ہے اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔

مولوی محمد صالح کو شاہجہاں بادشاہ نے پرگنہ حسن پور ضلع مرادآباد کے سات آٹھ مواضع محمد پور وغیرہ معافی دوام عطا کئے۔ اس لیے انھوں نے وہیں سکونت اختیار کی۔ مولانا صالح صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے پوتے

سید محمد سعید اس جاگیر کے مالک اور قابض ہوئے اور پرگنہ حسن پور کی قضا کا عہدہ اسی زمانے سے ملا قضا کا منصب نسلاً بعد نسلاً اس خاندان میں مسلسل چلا آتا ہے۔ جاگیر کا رقبہ ایک لاکھ بیگھے کے قریب تھا جو ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ ہند نے ضبط کر لیا۔ قاضی منور علی صاحب قاضی القضات کیتھیر تھے۔ ان کے بعد یہ خاندان اچھی حالت میں نہیں رہا۔ اس خاندان کے شجرہ کا خاکہ جزو کتاب ہے۔

محمد صالح بن محمد یعقوب بن محمد اکرم بن منور علی تھے۔ منور علی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں پہلی اہلیہ سے دو صاحبزادے فتح یاب علی اور ظفر یاب علی ہوئے جن سے یہ سلسلہ چلا۔ فتح یاب علی کے فرزند اسد علی لاولد اور قاسم علی ہوئے۔ قاسم علی کے لڑکے فیاض علی، قربان علی، امداد علی لاولد اور ہاشم لاولد ہوئے۔ فیاض علی کے صاحبزادے کاظم علی عرف محمد میاں وغیرہ اور قربان علی کے لڑکے مظہر علی ہوئے۔

منور علی صاحب کی زوجۂ ثانی سے نصرت علی تھے۔ نصرت علی کے فرزند وزیر علی وامیر علی لاولد ہوئے۔ وزیر علی صاحب کے لڑکے نظر علی اور نیاز علی ہوئے۔ نیاز علی کے صاحبزادے صادق علی اور مقصود علی اور غفور علی لاولد ہوئے۔ صادق علی کے فرزند شاکر علی اور صابر علی تھے۔

ظفر یاب علی کے صاحبزادے قمر علی، ولایت علی اور نجف علی ہوئے۔ قمر علی کے لڑکے معصوم علی رنجور اور ان کے دو لاولد صاحبزادے سید صمصام علی صمصام اور یحییٰ حسین ہوئے۔

ولایت علی کے فرزند ارجمند قاضی جمشید علی جم ہوئے۔ قاضی جمشید صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ سے قاضی ابوالعلی عابد ہوئے اور ان کے اکلوتے بیٹے قاضی عابد علی جوہر سے حیدر علی اور مظہر علی ہوئے۔ حیدر علی کے صاحبزادے فاران حیدر، رضوان حیدر اور کامران حیدر اور مظہر علی کے مسعود مظہر، فیروز مظہر اور منصور مظہر ہوئے۔

فاران حیدر کے عدنان حیدر اور رضوان حیدر کے عمران حیدر اور جبران حیدر ہوئے جب کہ کامران حیدر ابھی تک کنوارے ہیں۔ قاضی جمشید صاحب کی زوجۂ ثانی سے ابوالعلی اور ان کے لڑکے محمود علی لاولد ہوئے۔

نجف علی نوآباں کے صاحبزادے محمد علی جویا لاولد اور خورشید علی خورشید ہوئے۔ خورشید علی نے دو نکاح کیے پہلی بیوی سے ظفر علی لاولد، منور علی اور منظور علی ہوئے۔ منور علی سے تین فرزند رضا علی، شاکر علی اور فرحت علی ہوئے اور منظور علی کے یونس علی اور یونس علی سے شعیب یونس۔ خورشید علی صاحب کی زوجۂ ثانی سے اصغر علی، اختر علی اور افسر علی لاولد ہوئے۔ اصغر علی سے انور علی اور اختر علی سے کمال اختر، قمر اختر اور سعید اختر ہوئے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی خاندان بکھر گئے اور ان میں سے بیشتر خاندانوں کے تعلیم یافتہ افراد پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہ خاندان بھی اس نقلِ مکانی سے متاثر ہوا اور شاہ نجف علی نوآباں کی شاخ کے بجز منور علی مرحوم کی اولاد کے جو مرادآبادی ظروف کی صنعت سے وابستگی کی بنا پر

مرادآباد ہی میں مقیم ہیں، تقریباً تمام افراد پاکستان منتقل ہوگئے۔ آج کل وہاں سید افسر علی رضوی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی پنشن پر قانع اور دینی اور سماجی خدمات میں مشغول ہیں۔ جبکہ اختر علی مرحوم کے صاحبزادگان میں کمال اختر اور سید اختر تعمیرات کی ٹھیکیداری اور قمر رضوی مشہور اہل قلم فخر ماتری کے ادارے کے روزنامہ ایوننگ ٹائمز کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہیں۔

قاضی بخت علی خواہاں کے برادر قاضی ولایت علی مرحوم کی شاخ میں قاضی مظہر علی صاحب نے اپنے مولد و مسکن ہی سے وابستگی قائم رکھی اور اپنے خاندانی اخبار مخبر عالم کی ادارت کو سنبھال لیا اور اپنے تینوں ہونہار صاحبزادوں مسعود مظہر، فیروز مظہر اور منصور مظہر کی معیت میں اپنے دادا کی یادگار مخبر عالم کو ہفتہ وار سے روزنامہ کی جدوجہد میں مشغول ہیں اور امید ہے کہ مخبر عالم ایک روزنامہ کی حیثیت سے مستقبل قریب میں ملک اور قوم کی خدمت انجام دے گا۔

اس خاندان میں قاضی بخت علی اور قاضی ولایت علی علمی و روحانی اعتبار سے اعلیٰ مراتب و فضیلت کے مالک تھے۔ قاضی بخت علی صاحب علوم دینی میں ماہر اور تصوف کے رموز سے واقف تھے۔ ذکر و اشغال میں منہمک رہتے تھے، اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے قاضی سید خورشید علی خورشید اپنے والد ماجد کے بارے میں اپنی تصنیف "رموز درویشی المعنی در بخت" میں تحریر فرماتے ہیں:

"والد ماجد پیر و مرشد نے خلوت میں اس ضعیف العباد پر بہت توجہ فرمائی ہے، فقیر نے حضوری مراقبہ میں حاصل کی ہے اور اپنے والد ماجد کی کرامتیں دیکھی ہیں اور واقعات عجیبہ اور اتفاقات غریبہ حضرت والد ماجد کی ذات بابرکات سے اس درجہ وارد و صادر ہوئے جن کا بیان باعث طول و طویل ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت نے فقیر کو خاص طور پر وقتاً فوقتاً ایسے فوائد پہونچائے ہیں، جو انسانی حد سے بالاتر ہیں۔ میں نے اپنے والد کے حالات میں یہ عجیب بات دیکھی کہ کیسی ہی مشکل پڑے پر گھبراتے نہ تھے اور پھر خود بخود وہ مشکل آسان ہو جاتی تھی۔ میں والد کے تصرفات، عالم جذبات اور استغراق میں اعلیٰ مقامات پر پہونچا۔ اور بزرگان خاندانی نے فقیر کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ چونکہ فقیر سلسلۂ نسب میں رضوی سید ہے۔ اس امر سے پوری تصدیق ہوگئی کہ نسبت خاندانی بھی کچھ چیز ہوتی ہے اور اپنا اثر ضرور لاتی ہے۔ والد ماجد پیر و مرشد نے فرمایا کہ سالک کو شریعت کے احکام پر مستحکم رہنا چاہیئے۔ تقویٰ اور زہد اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب شرع شریف کی اتباع ہو جائے کہ اعمال سنت کو ہمیشہ رو براہ بنائے۔ اور کوئی رسم خلاف پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے عمل میں نہ لائے۔ منہیات و مشتبہات سے ہمیشہ پرہیز رکھے۔" (۹)

قاضی نجف علی صاحب کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ لیکن عشقِ مجازی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عشقِ حقیقی میں مستغرق تھے۔ چنانچہ آپ کا زیادہ کلام حمد و ثنا میں ہے، صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ آپ کی تصنیف "حرزِ جمال چھتیس سوال" ۱۹۰۵ء میں برجیس پریس مرادآباد میں طبع ہوئی۔ حکیم نظر علی ابن حکیم امیر علی مرادآبادی نے شاہ نجف علی صاحب سے ۳۶ دینی اور تصوفانہ سوال کئے جن کے انھوں نے بڑے معقول اور اطمینان بخش جوابات دیئے۔ اس میں شجرہ قادریہ، چشتیہ، نظامیہ، قلندریہ، نقشبندیہ منظوم اور نعتیہ کلام بھی درج ہے۔ شجرے کافی طویل ہیں۔ ان کے علاوہ "مثنوی سرِ وحدت" از شاہ خورشید بھی شامل ہے۔ آپ کے کلام میں عشقِ الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے۔

بندے تیرے ہی ہیں گو بد ہیں گنہگار بھی ہیں — مغفرت چاہتے ہیں طالبِ دیدار بھی ہیں
عیب ڈھک لیجیو اور بخش بھی دیجو ہم کو — آپ ستار بھی ہیں آپ ہی غفار بھی ہیں
منتظرِ رحمتِ والا کے تیرے یا مولا — اہلِ تسبیح بھی ہیں صاحبِ زنار بھی ہیں
مدح گو فیضِ عموما کے تیرے اے ساقی — مست و سرشار بھی ہیں غافل و ہشیار بھی ہیں

نہیں آیا تیرے دربار میں تنہا خواہاں
شاہِ ابرار بھی ہیں حیدرِ کرار بھی ہیں

خالقِ کون و مکاں حضرتِ رحماں مدد دے — مالکِ ہر دو جہاں حضرتِ سبحاں مدد دے
آپ خلاق ہیں رزاق ہیں ربِ عالم — بندہ محتاج ہے یا حضرتِ یزداں مدد دے
آپ ستار ہیں غفار ہیں میں عاصی ہوں — واجب الرحم ہوں یا صاحبِ غفراں مدد دے
آپ قدوس و صمد ہیں تو میں بندہ گندہ — حق بجانب ہے مرا صاحبِ احساں مدد دے

آپ حنان ہیں منان ہیں میں عاجز ہوں
یا محمدؐ کے خدا مالک خواہاں مدد دے

مظہرِ نورِ کبریا زہرا — نورِ عینین مصطفیٰ زہرا
لختِ دل حضرتِ خدیجہؓ پاک — ہم سرِ پاک مرتضیٰ زہرا
باعثِ بخششِ گنہگاراں — جانِ خلق فاطمہ زہرا
عصمت و عفت و طہارت و نور — ہو غلاموں کو بھی عطا زہرا
نورِ حق رحمتِ خدا ہو تم — دو مجھے شانِ خوشنما زہرا
ہو صلوٰۃ و سلام حق تم پر — مجھ پر رحمت تمھاری یا زہرا

قاضی نجف علی صاحب خوابان کا انتقال ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ کو مرادآباد میں ہوا۔ آپ کے صاحبزادے قاضی خورشید علی صاحب خورشید جنھوں نے اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی اور انھیں سے بیعت ہوئے۔ آپ کو چاروں خانوادوں، چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کی اجازت تھی اور دوسروں کو بیعت کرنے کی بھی اجازت تھی۔

چنانچہ پیر جی احمد شاہ رامپوری کے آپ سلسلۂ چشتیہ میں بھی خلیفہ تھے اور عمامہ خرقہ پایا تھا۔ شاہ صاحب کا فیض عام تھا۔ آپ نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی اور اس میں اپنی قبر کھدوائی تھی۔ جو درویش آپ کی خانقاہ میں آتے ان کو روزانہ دعوتیں دی جاتیں تھیں اور عرسوں میں لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ کسی سے نذر و نیاز نہیں لیتے تھے اور بظاہر کوئی آمدنی کا ذریعہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس بنا پر لوگوں کو گمان ہوتا تھا کہ آپ کو دستِ غیب حاصل تھا یا کیمیا بناتے تھے۔ آپ انتہائی متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ آپ کی صحبت سے قاضی خورشید علی صاحب کو نفع پہونچا۔ آپ نے بعض سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل ذکر و اشغال کی اور اوراد کی قاضی خورشید صاحب کو تکمیل کرائی۔ قاضی صاحب نے پیر جی احمد شاہ رامپوری سے اپنی مرضی سے بیعت نہیں کی تھی بلکہ آپ کے والد ماجد جو آپ کے پیر روشن ضمیر تھے وہ آپ کے مراقبہ میں تشریف لائے اور جو اوراد طریقۂ چشتیہ کے آپ کو سینہ بسینہ پہونچے تھے اس کی تکمیل کرانے کے لئے پیر جی احمد شاہ کے بارے میں کہا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، رامپور گئے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ [1] آپ بھی صاحبِ تصنیف تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف "رموزِ درویشی اعنی دُرِّ نجف" ۱۹۱۳ء مطابق ۱۳۳۱ھ کو مطبع شمس المطابع مرادآباد میں باہتمام قاضی سید محمد عبدالعلی صاحب ایڈیٹر مخبر عالم مرادآباد میں طبع ہوئی جو ۹۰ صفحات اور سترہ حسبِ ذیل ابواب پر مشتمل تھی۔

باب اول: فضیلتِ نماز۔ باب دوسرا: فضیلتِ درود شریف۔ باب تیسرا: وصیت والد ماجد و پیر و مرشد۔ باب چوتھا: حالاتِ غوث پاک۔ باب پانچواں: حالاتِ حضرت خواجہ غریب نواز۔ باب چھٹا: پیری مریدی کے آداب۔ باب ساتواں: خلافت خاندانِ چشتیہ۔ باب آٹھواں: حالاتِ اولیاء اللہ۔ باب نواں: خدماتِ اولیاء اللہ۔ باب دسواں: خانوادہ چہاردہ۔ باب گیارھواں: لطیفوں کے حالات۔ باب بارھواں: خاندانِ قادریہ کے افکار۔ باب تیرھواں خاندانِ چشتیہ کے افکار۔ باب چودھواں: اوراد و اشغالِ خاندانِ سہروردیہ و نقشبندیہ۔ باب پندرھواں: منقولاتِ بزرگانِ دین۔ باب سولھواں: فضیلتِ دوازدہ ماہ۔ باب سترھواں: اعمال و نقوش انواع و اقسام۔

اس میں بھی مثنوی سرِ وحدت از شاہ خورشید علی خورشید، مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات شجرہ خاندانِ چشتیہ

---

[1] رموزِ درویشی اعنی دُرِّ نجف۔

اور شجرہ خاندانِ قادریہ منظوم از شاہ خورشید علی صاحب درج ہے سے

شاہ خورشید علی صاحب کو بھی شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ آپ کا بھی زیادہ کلام حمد و ثنا میں ہے۔ چنانچہ مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات کے اشعار ملاحظہ فرمایئں۔

الٰہی تو ہے خلّاقِ دو عالم
الٰہی تو ہے رزّاقِ دو عالم

نشاں تیرا الٰہی بے نشاں ہے
الٰہی تو نہاں اور تو عیاں ہے

ترا جلوہ ہے ہر ذرّے کے اندر
ترا خانہ ہے مسجد اور منبر

نظر آتا نہیں تیرے سوا اور
ترا ہر رنگ میں ہے یک نیا طور

حجاب اپنے ہم آپ ہی ہو رہے ہیں
عبث اوقات ناحق کھو رہے ہیں

کسی دم کی نہ تیری جستجو ہائے
بندھا عصیاں سے اپنا مو بمو ہائے

کروں کس سے بیاں اپنی تباہی
تو ہی فریاد رس ہے یا الٰہی!

الٰہی دوش پر ہے بارِ عصیاں
بڑھے گا کب تلک طومارِ عصیاں

کسی دم خوابِ غفلت سے نہ جاگا
بہت تیری طرف سے دور بھاگا

جوانی بھی گئی اور آئی پیری
نہ کی اب تک بھی فکرِ گوشہ گیری

کہاں جاؤں کہوں کس سے غم اپنا
عجب کچھ کشمکش میں ہے دم اپنا

مری کشتی ہے بحرِ غم میں آئی
خداوندا کر اب تو ناخدائی

پڑی مجھ پر تباہی پار کر دے
مرا بیڑا الٰہی پار کر دے

گناہوں کا ہے سر پر بوجھ بھاری
پڑی ہے دور منزل شب ہے تاری

ہوئی ہے وقت مجھ کو شام یا رب
پڑا ہوں راہ میں ناکام یا رب

اگر تو چاہے تو منزل کو پہونچائے
سلامت مجھ کو اس صحرا سے لے جائے

گناہوں سے سیاہ ہے میرا نامہ
گھسے گا کب تلک کاتب کا خامہ

بدل دے اپنی رحمت سے الٰہی
مبدّل نور سے کر دے سیاہی

مرے غفّار کر مجھ پر عنایت
مرے ہادی کر اب مجھ کو ہدایت

الٰہی مجھ کو دے شورِ محبّت
نہ دیکھوں غیر کی آنکھوں سے صورت

مری ہستی سے مجھ کو نیست کر دے
مئے الفت مرے کاسے میں بھر دے

رہائی قیدِ ہستی سے مجھے دے
سرورِ تازہ مستی سے مجھے دے

سدا وحشت سے دیوانہ رہوں میں — تری الفت میں مستانہ رہوں میں
نہ سمجھوں کچھ میں اس دنیا کی ہستی — بجائے دم رگ و پے میں ہو مستی
سوا تیرے نہ کچھ دل میں ہوس ہو — پری کی جا نہ شیشہ میں مگس ہو
یہ حاصل ہو مجھے وحدت کی کثرت — جدھر دیکھوں اُدھر ہو تیری صورت
انا الحق کی صدا سے ہر رگ و پے — ہمیشہ نعرہ زن ہوں صورت نے
میں چلاتا پھروں جرس کی مانند — بہاؤں اشک ابر تر کی مانند
عزادے دل کو میری کوچہ گردی — رہوں جب تک رہے صحرا نوردی

خدا خورشید کو دے شورِ الفت
رہے نالہ نمک ریز جراحت

اس خاندان میں قاضی سید معصوم علی رنجور بن قمر علی بن ظفر یاب علی بھی اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ شروع میں انھوں نے پولیس میں ملازمت کی۔ مراد آباد میں محلہ دھری گھاٹ میں رہتے تھے اُن کا کلام ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء کے مخبر عالم مراد آباد میں ملا۔ ؎

نہ ہوتا باعثِ ایجادِ عالم نور احمدؐ کا — تو ہوتا کون حجت مظہر اظہار سرمد کا
نہ مل سکتا خطابِ اشرف المخلوق انساں کو — نہ ہوتا گر وجود اولادِ آدم میں محمدؐ کا
نہیں ملتا دوبارہ لب بہ لب قندِ مکرر میں — سب بارہ لب ملیں جس نام میں وہ ہے محمدؐ کا
کہیں گے نفسی نفسی حشر میں سب انبیا جس دم — کھلے گا حال اس دم مصطفیٰ کی شد اور مد کا

لکھے جا نعت اس ممدوح کی جتنا بھی ممکن ہے
وسیلہ تجھ کو اے رنجور کافی ہے محمدؐ کا

قاضی سید معصوم علی رنجور کے صاحبزادے حکیم سید صمصام علی صمصام تھے۔ ان کو بھی بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ والد رنجور اور دادا قاضی یاب علی بھی شاعر تھے۔ جوانی میں عرب چلے گئے تھے۔ سلطانِ مسقط نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ عرب ممالک سے واپسی پر کراچی کے ملک التجار ڈوسل حاجی ابوبکر سے ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے کی گرویدگی نے یہ طول کھینچا کہ کراچی میں رہ پڑے اور طبابت میں وہ نام پیدا کیا کہ ہر کہ و مہ ان کا گرویدہ اور نھیں اپنا محسن جاننے لگا۔ لاولد تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

بابِ رحمت ترے بندوں پہ کھلا ہے کہ نہیں — تو حجابِ دل عالم میں چھپا ہے کہ نہیں
مرضِ مہلکِ عصیاں و سیہ کاری سے — اے خدا میرے مقدر میں شفا ہے کہ نہیں

کون شئے تیرے خزانے میں نہیں ہے مولا　　　　پر مرے درد کی کچھ اس میں دوا ہے کہ نہیں
بندے تجھ پر نہ کریں ناز تو پھر کس پہ کریں　　　　یہ تو بتلا دے کہ آخر تو خدا ہے کہ نہیں
میں ہی محروم جو بخشش سے رہوں کیا معنی　　　　عام یارب ترا قانون عطا ہے کہ نہیں

تیرے در سے جو نہ مانگے تو کہاں سے مانگے
تو جو مغنی ہے تو صمصام گدا ہے کہ نہیں

قاضی منور علی صاحب قاضی جمشید علی صاحب تجم کے پردادا تھے۔[1] ان کے صاحبزادے قاضی ظفریاب علی قاضی جمشید علی کے دادا تھے۔ ان کے والد قاضی ولایت علی صاحب چشتی قادری تھے جو مولانا عبدالہادی سے بیعت تھے۔

مولانا عبدالہادی امروہہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ماجد شیخ محمد حافظ تھے۔ جب آپ چار سال کے تھے تو شیخ محمدی رحمۃ اللہ علیہ ان کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ کھانے کے بعد حضرت شیخ نے وضو کر کے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تھا۔ آپ کو کم نظر آتا تھا۔ نماز میں قبلہ رخ غلط ہو گیا تو چار سالہ شیخ عبدالہادی نے شیخ محمدی کا ہاتھ پکڑ کر قبلہ رخ کر دیا۔ یہ بات دیکھ کر حضرت شیخ محمدی مسرور ہوئے۔ تو آپ نے ان کے والد شیخ محمد حافظ کو بشارت دی کہ یہ بچہ مقتدائے وقت ہوگا۔

بچپن سے شیخ عبدالہادی پر حضرت شاہ محمدی رحمۃ اللہ علیہ کا اثر اور توجہ ایسی پڑی کہ آپ ریاضت اور مجاہدہ میں مستغرق ہو گئے۔ جب درد طلب پیدا ہوا تو دنیا سے متنفر ہو کر جنگلوں میں پھرنے لگے۔

شیخ عبدالہادی شاہ عضدالدین امروہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ شاہ صاحب زہد و قناعت و پرہیزگاری اور توکل میں مشہور تھے۔ حکام وقت نے بے حد کوشش کی کہ ان کا وظیفہ مقرر ہو جائے لیکن انھوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ صاحب اہل و عیال تھے۔ ان کی زندگی توکل اور فقر و فاقہ میں گذری۔ حاجی رفیع الدین صاحب ۱۱۶۹ھ میں شاہ عضدالدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبان مبارک سے نکلا "شاہ پہاڑی میں افغانوں پر جو آج کل ہمارے حکمراں ہیں آفت دتباہی آئے گی" اسی سال شاہ صاحب فوت ہو گئے۔ آپ کے کہنے کے مطابق ۱۱۸۵ھ میں مرہٹوں نے شاہ عالم، دستاہ کو ہمراہ لے کر افغانوں پر حملہ کیا۔ ضابطہ خان بھاگ گیا اور ملک ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ شاہ صاحب نے ۱۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کے جانشین و خلیفہ شیخ عبدالہادی امروہوی ہوئے۔

شیخ عبدالہادی شاہ عضدالدین سے بیعت ہونے کے بعد درجہ کمال پر پہونچے۔ مخلوق خدا نے ان کی

---

[1] تاج التواریخ اخبارات ہندوستانی صلا۔

ذات سے کافی فیض پایا۔ بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ امروہہ میں دین کو فروغ ہوا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ آپ نے رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ کو جمعہ کے روز انتقال فرمایا۔ اپنے پوتے حضرت شیخ عبدالباری کو اپنا جانشین و خلیفہ مقرر فرمایا۔

شیخ عبدالباری امروہوی کو ایام طفولیت ہی میں شیخ عبدالہادی نے اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا۔ آپ ضعیف و کمزور تھے۔ آپ نے اُن سے زیادہ محنت نہیں لی۔ آپ کے حقیقی بھائی شاہ دوست محمد سے جو اچھی صحت و تندرستی کے مالک تھے، پورا مجاہدہ کرایا۔ دونوں پوتوں کو روحانی تعلیم دے کر سلوک نسبت چشتیہ صابریہ تمام کرایا۔ سلسلۂ صابریہ انھیں شیخ عبدالباری سے جاری ہوا۔ اُن کے چار خلیفہ حضرت حاجی شاہ عبدالرحیم شہید، حاجی سید حاتم علی شاہ، حاجی خیرالدین اور حافظ مکی شاہ تھے۔ شیخ عبدالباری ۱۱ رمضان المبارک ۱۲۲۶ھ کو فوت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کے جانشین و خلیفہ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی مقرر ہوئے اور حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے ارشد جانشین و خلیفہ حضرت شاہ حاجی محمد امداد اللہ مہاجر مکی تھے۔ [۱]

ایسے بابرکت و بافیض پیر روشن ضمیر شیخ عبدالہادی کے صحبت یافتہ قاضی ولایت علی صاحب تھے۔ آپ بھی صاحبِ فیض تھے۔ سینکڑوں ظاہر و باطن مریض اجسام اور مریض گناہ آتے اور شفا پاکر چلے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے فیض روحانی کے بارے میں قاضی جمشید علی صاحب اپنی تالیف "خم خانۂ جاوید" میں لکھتے ہیں:-

> "ہندوستان میں رہنے والے ہر مذہب کے لوگوں میں میں نے دیکھا ان سے فیضیاب ہوئے۔ اور عیسائیوں، یہودیوں، دہریوں، غرض ہر طبقہ کے لوگوں نے ان کی خداداد روحانی طاقت اور مافوق العقل انسانی خوارق کا اعتراف کیا اور اب بھی آمادہ ہوں کہ جس شخص کو خدائے عزّ اسمہٗ کی معشوقانہ انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرنا اور اپنا ایمان کامل کرنا اور لازوال مسرت و ابدی خوشی حاصل کرنا ہو وہ مجھ کو مطلع کریں، میں ان کے حضور میں عرض کروں گا۔"

قاضی ولایت علی صاحب مرادآباد کے مشہور وکیلوں میں تھے۔ آپ اس پیشے کو بڑی احتیاط سے انجام دیتے تھے آپ نے تقریباً نوّے ہزار روپے کی جائیداد و دیہات، باغ دکانیں اور مکانات خود پیدا کئے جو تلف ہوگئے۔ البتہ صرف مکان مسکونہ باقی رہ گیا۔ تو کسی سے اس کا ذکر تک نہ کیا اور نہ کسی قسم کا خیال و ملال کیا اور بڑی بے فکری کے ساتھ نماز روزہ، مجاہدہ و مراقبہ و مکاشفہ میں زندگی بسر کی۔ اگر کسی نے جائیداد کے ضائع ہونے کا ذکر کیا تو آپ نے اس کو یہ جواب دیا "جس نے دیا تھا اس نے ہی لے لیا اور یہ امر شکر گذاری کے قابل ہے، رات دن کی دردسری سے چھوٹے اور آزادی اور فارغ البالی کے ساتھ

---

[۱] انوار العاشقین صفحہ ۵۳۔

پروردگارِ عالم کی عبادت کرتے ہیں۔ جب ہمارے جدِّ امجد حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے خلافت پر لات ماری اور حضرت امیر معاویہؓ کو سلطنت بخش دی تو وضو کر کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیسا شکر ہے جو اتنے بڑے نقصانِ عظیم ہونے پر ادا کیا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے نہیں دیکھا کہ عبادتِ خداوندی میں سلطنت کے کام کیسے حارج ہوتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کون سا شکر کا وقت ملے گا کہ میرے اور عبادتِ خداوندی کے درمیان جو موانعات تھے وہ دور ہو گئے۔" آپ بڑے زندہ دل خوش مزاج اور ذی اخلاق بزرگوں میں سے تھے۔ ہر وقت اور ہر حال میں اللہ جل شانہٗ کا شکر گذارتے تھے۔ آپ اپنی کسی حاجت کے لئے کبھی کسی کے پاس نہیں گئے۔ سینکڑوں حاجت مند آپ کے پاس آتے تھے اور دلی مراد پاتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ دنیا کے ہزاروں طالب آتے ہیں مگر کوئی خدا کا طالب نہیں آتا۔ آپ صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ حضرت شیخ علاء الدین کی درگاہ میں مدفون ہیں۔ [1]

قاضی جمشید علی صاحب اردو، فارسی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ ابتدا میں آپ ریاست جے پور میں سررشتہ دار فوجداری پر مقرر ہوئے۔ وہاں سے ممتاز الدولہ کے ہمراہ کوٹہ آئے اور حاکم اپیل مقرر ہوئے۔ آب و ہوا راس نہیں آئی تو جے پور گئے۔ یہاں حکیم محمد سلیم خاں صاحب چیف سکریٹری رائل کونسل کی سررشتہ داری کی خدمت سپرد ہوئی۔ حکیم صاحب کی وفات کے بعد اپنے وطن تشریف لے آئے۔ اس کے بعد رام پور میں عہدۂ منصری جی پر مامور ہوئے۔ چنانچہ اس ملازمت کا ذکر آپ نے اپنی تالیف "تم خانۂ جاوید" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"میں اس وقت ایک نہایت امید و بیم کی حالت میں ہوں کہ عہدۂ منصری جی رامپور اسٹیٹ سے جو حضور پر نور نواب محمد علی خاں صاحب بہادر فرماں روائے ریاست رامپور دام ظلہم و اقبالہم نے کیم جون ۱۹۱۸ء کو مجھے مرحمت فرمایا ہے۔ حسب رائے مولوی عبدالغفور صاحب بہادر مدار المہام ریاست علیحدہ ہوں، نہ کام ہے نہ تنخواہ ملتی ہے، اس حالت تردد میں ہوں۔"

قاضی جمشید علی صاحب، مورخ بے مثال، صنائع و بدائع میں موجد باکمال استاد مانے جاتے تھے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات صنعتِ نادرہ وغیرہ جیسی دشوار صنائع میں تاریخیں لکھی ہیں۔ مراد آباد کے مشہور شعراء میں آپ کا شمار تھا۔ آپ مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ آپ نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کی طرح دونوں زبانوں فارسی اور اردو میں غزلیات و قصائد میں زمانہ سے داد لی۔ طبقۂ علماء و مشائخین میں آپ وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے زہد و تقوے کی قسمیں زاہد و عابد حضرات کھاتے تھے۔ آپ نے کئی اخبار مراد آباد سے

---

[1] تم خانۂ جاوید ص ۱۵۱۔

جاری کئے۔

"آفتاب ہند" مراد آباد سنبھلی دروازے سے ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ہفتہ وار اخبار وجود میں آیا۔ مشیر الدولہ، سفیر الملک قاضی سید جمشید علی صاحب تجم مالک اور مہتمم سید مہدی حسن صاحب تھے۔

"بلند اختر" مراد آباد سنبھلی دروازے سے یکم جولائی ۱۸۷۰ء کو ماہنامہ رسالہ نکلا، سولہ صفحات پر مشتمل تھا، قاضی سید جمشید علی صاحب تجم مالک اور سید مہدی حسن صاحب منصرم تھے۔ سالانہ چندہ ۶ روپے تھا، مطبع آفتاب ہند میں چھپتا تھا۔

"جام جمشید" مراد آباد محلہ سنبھلی دروازے سے ہفتہ وار ۱۸۷۰ء میں ظہور پذیر ہوا۔ منشی قاضی سید جمشید علی تجم مالک، سید مہدی حسن مہتمم اور عبد العلی صاحب پرنٹر تھے، آفتاب ہند میں طبع ہوتا تھا۔

"روہیلکھنڈ پنچ" یہ ظریف اخبار محلہ سنبھلی دروازہ مراد آباد سے ہفتہ وار ۱۸۷۰ء میں جلوہ افروز ہوا۔ چار صفحات میں نکلتا تھا، منشی قاضی سید جمشید علی صاحب تجم مالک، ایڈیٹر سید مہدی حسن اور مہتمم عبد العلی تھے۔ آفتاب ہند پریس میں طباعت ہوتی تھی۔

۸ جون ۱۹۱۸ء کے مخبر عالم مراد آباد کے پرچے میں جناب قاضی جمشید علی صاحب تجم مراد آبادی کی وفات حسرت آیات کے عنوان کے تحت حسب ذیل اداریہ شائع ہوا۔

کبھی بہار کبھی موسم خزاں دیکھا نہ ہم نے سیر کے قابل یہ بوستاں دیکھا

جس طرح کہ انسانی بنیاد ایک غیر مستحکم اور متزلزل چیز ہے اسی طرح باغ دنیا کی بہار بھی ایک عارضی بہار ہے۔ اس میں کسی شئے کو ثبات ہے نہ قرار۔

جہاں گلزار تھا باد صبا واں خاک چھانے ہے بجائے گرئی گلشن ہوائے سرد باقی ہے

بہار کے دن آناً فاناً میں گذر جاتے ہیں۔ طیور خوش الحان کے چہچہے دم بھر میں نالۂ عنادل کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ بجائے عیش و مسرت، نالہ و ماتم کی ٹھہر جاتی ہے۔ محفل عشرت ختم ہوتی ہے اور صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ کوئی مرنے والے اور اس کی خوبی کو روتا ہے کوئی اپنے عیش و آرام کا ماتم کرتا ہے۔ اگرچہ یوں تو انسان کی ہستیٔ فانی ہمیشہ حیات و ممات کے واقعات سے پُر رہتی ہے اور اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور پسماندگان ہر ایک کی شادی و غم میں مشغول ہوتے ہیں مگر موت کی دائمی نیند کے ان سونے والوں کے مرگ میں ہمیشہ سینہ زنی اور ماتم کیا جاتا ہے جو اپنی لیاقت و قابلیت اور فہم و فراست میں ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بناتا ہے۔ ایسے لائق و فائق مرنے والے کا داغ

مفارقت عام صدمۂ جانکاہ ہوتا ہے اور روح فرسا ہوتا ہے اور ان پہ زمانہ اپنا سر پیٹ کر آٹھ آٹھ آنسو رُلا دیتا ہے اور اس کے پس ماندگان خون کے آنسوؤں سے رو رو کر مرحوم کے ساتھ اس کی تمام قابلیتوں اور خوبیوں کو بھی وداع کرتے ہیں اور اپنی اس ملکی اور نقصانِ عظیم کی یاد میں ہمیشہ نالہ و شیون کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال آج ہمارا ہے کہ ہمارے خاندان اور ہمارے شہر کے فخر، میرے والد قبلہ قاضی جمشید علی حیرتؔ سابق وکیل عدالت و ایڈیٹر جامِ جمشید دروہیل کھنڈ پرنٹنگ رئیس مرادآباد نے انتقال کیا۔ اور ہماری آنکھوں میں دنیا کو تاریک کر دیا۔ آپ کی مسلمہ قابلیت دیانت محتاجِ بیان نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ کی قابلیتِ علمی اور قانونی سے ایک عالم مستفیض ہوتا تھا۔ اگر آپ ایک حیثیت سے شعرائے نامی گرامی میں شمار ہوتے تھے تو دوسرے رتبہ میں مورخ بے مثال و صنائع و بدائع میں موجد باکمال استاد مانے جاتے تھے۔ ہندوستان میں آپ ہی نے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات پر صنعتِ نادرہ وزیر بغیات وغیرہ جیسی دشوار صنائع میں تاریخیں لکھی ہیں۔ ایک آپ ہی نے اپنے استاد حضرت غالبؔ کی طرح فارسی و اردو دونوں زبانوں کے قصائد و غزلیات میں زمانہ سے داد لی ہے۔ حکام و عوام میں آپ کی ایک خاص عزت و وقعت تھی۔ طبقۂ علماء و مشائخین میں آپ خاص نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شعراء مورخین آپ کو حکم بناتے تھے۔ زاہد و عابد حضرات آپ کے زہد و اتقار کی قسمیں کھاتے تھے۔ آپ ملکی خدمات بھی جامِ جمشید کے ذریعہ ۲۶ سال سے لگاتار انجام دے رہے تھے۔ زمانہ جانتا ہے اخبار جامِ جمشید کا بحیثیتِ مضامین ہندوستان کے معزز ترین اخبارات میں شمار رہا ہے۔ اس پرچہ نے ہزارہا ملکی و قومی کارنمایاں کئے ہیں جن کی تصریح بے موقعہ ہے اور آپ کے اظہارِ فضائل کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ ہرچند کہ آپ کی عمر ۵۵ یا ۵۶ سال تھی۔ جس میں وجاہت و خوش رنگ چہرے کی آب و تاب ابھی بدستور باقی تھی۔ مگر دستِ راست میں ایک عرصہ سے رسولی واقع تھی، جس کا گذشتہ سال آپریشن کیا گیا تھا اور اسسٹنٹ سول سرجن اور سول سرجن مرادآباد کی بے حد کوشش سے بہت جلد آرام ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ رسولی پھر بدستور نکل آئی تھی اور اس میں ایک گہرا زخم ہو گیا تھا۔ چنانچہ پانچ چھ مہینے تک برابر علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن بدقسمتی سے کچھ سود مند نہیں ہوا، اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ مطابق ۳ جون ۱۹۰۶ء کو بوقت ساڑھے ۶ بجے شام باتیں کرتے کرتے انتقال فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

"آپ جس طرح ایک فیاض طبع اور مخیر شخص تھے اور ہمیشہ فقراء و مساکین آپ سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اسی طرح بعدِ وفات بھی حسبِ وصیت معقول طریقہ پر خیر و خیرات عمل میں آئی۔ آپ کی تجہیز و تکفین اگرچہ شب ہی میں ہوئی اور ان چند گھنٹے کے اندر عام طور پر وفات کی خبر مشہور نہ ہو سکی۔ تاہم آپ کے جنازے میں بے شمار آدمی تھے اور نمازِ جنازہ میں ہر طبقے کے مشہور و معروف آدمی شامل تھے اور اُس وقت سے اِس وقت تک ہر درجہ و ہر مذہب کے اشخاص آپ کی تعزیت و فاتحہ خوانی کے لئے آ رہے ہیں اور عام طور پر مرحوم کے اس سانحۂ ہوشربا و جاں فرسا پر افسوس کیا جا رہا ہے اور خاکسار ایڈیٹر مخبر عالم کا (جو مرحوم کا خلف اکبر ہے) اس صدمۂ جانکاہ کے باعث دماغ مختل ہے غمگین خاطر و خستہ جگر ہے ادھر قدرتاً تمام پسماندگان کا سرپرست بنا ہوا ڈھارس دے رہا ہے۔ ادھر ہجوم افکار و ملال میں بھی عزاداروں کی مہمان نوازی کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں جو مجبوری و پریشانی ہوگی ہمدرد حضرات ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں۔

آپ کی یادگار وفات حسرت آیات میں ہم نے اور دیگر شعراء مرادآباد و بیرونجات نے جو قطعات تاریخ ارقام کئے ہیں انشاء اللہ مخبر عالم میں سب سلسلہ وار شائع کئے جائیں گے اور آپ کی سوانح عمری و دیوان فارسی و اردو جداگانہ شائع کئے جائیں گے اور جام جمشید و روہیل کھنڈ پنچ کی بابت بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ مہینے میں کسی قدر تبدیلی شکل و صورت کے ساتھ بیادگار قاضی جمشید علی صاحب جاری رہے گا۔ جس میں آپ کی مصنفہ کتب تاریخ و دیگر تصانیف شامل ہوں گی۔ نیز آپ کے اعلیٰ قسم کے مضامین سلسلہ وار درج کئے جائیں گے۔ امید ہے کہ جام جمشید و روہیل کھنڈ پنچ کے قدیمی سرپرست حضرات اس پرچہ کی خاطر خواہ معاونت فرمائیں گے۔"

قاضی جمشید علی صاحب تجم کی تاریخ ہائے وفات مخبر عالم مرادآباد میں چھپتی رہی ہیں، ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء کے مخبر عالم میں طوطیٔ ہند وفا مرادآبادی کا حسب ذیل تاریخی قطعہ چھپا تھا۔ ؎

جہاں ماتم سرا ہے کچھ عجب عالم کا عالم ہے — کوئی بسمل ہے کوئی نیم جاں ہے کوئی بید م ہے
چمن میں یا الٰہی کس شہیدِ ناز کا غم ہے — کہ غنچوں کے تبسم سے بھی پیدا شورِ ماتم ہے
چمن پھولا پھلا اُجڑا ہے نالے کرتی ہے بلبل — پڑی ہے اوس سی پھولوں پہ گریاں چشم شبنم ہے
شجر بھی ہاتھ ملتے ہیں ہوا بھی خاک اڑاتی ہے — چڑھی ہے دار پہ قمری صنوبر نخلِ ماتم ہے

تبرک بن گئے ہیں روتے روتے آنکھوں میں آنسو	کہ پانی یا الٰہی اس کنویں کا آبِ زمزم ہے
تو اپنے گل کو روتی ہے ہم اپنے گل کو اے بلبل	ادھر آ مل کے روئیں ایک ہی دونوں کا ماتم ہے
مورخ بے بدل بے مثل، ناظم ناثر یکتا	اٹھا دنیائے فانی سے نیا غم ہے نیا ماتم ہے
اسی اندوہ میں ہاتف سے میں نے اے قنا پوچھا	یہ کیسا سوگ ہے باہم یہ کیسا شور پیہم ہے

ندا آئی سخنور اس لئے مل مل کے روتے ہیں
بہم جمشید علی جم جاہ کا عالم میں ماتم ہے

۱۳۲۴ھ

مولوی احمد شاہ بیگ جوہر مراد آبادی نے بھی حسب ذیل تاریخ وفات کہی ہے

اہلِ باطن دفن شد زیرِ زمیں	تربتش پر نور مثلِ ماہ است
بر مزارِ ایں نوشتم سالِ وفات	مرقدِ جمشید علی جم جاہ است

۱۳۲۴ھ

قاضی سید جمشید علی صاحب، صاحبِ تصنیف تھے۔ تواریخ الحامد، خم خانہ جاوید ان کی مشہور کتابیں ہیں انھوں نے ایسی بھی کتابیں لکھی ہیں جو دوسروں کے نام سے چھپی ہیں۔ قاضی صاحب فنِ جفر کے ماہر تھے۔ "کلیدِ جعفر" شیخ محمد مظفر صاحب مراد آبادی کے نام سے شائع کرائی تھی "خم خانہ جاوید" ۱۳۲۰ھ میں مطبع جامِ جمشید مراد آباد میں چھپی۔ "خم خانہ جاوید" تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب کن حالات اور وجوہات میں چھپی اس پر قاضی صاحب نے اپنی "خم خانہ جاوید" کے صفحہ ۱۱ اور ۱۲ میں روشنی ڈالی ہے جو یہ تھیں:

"انگریزی سلطنت کی آزادی نے یہ رنگ دکھایا ہے کہ کوئی کسی کے خیالات کو روک نہیں سکتا یورپ اور امریکہ کے دہریوں کے انگریزی مضامین وجود باری تعالیٰ کے خلاف فرانس و لندن کے اخبارات سے دیسی مشتری اُردو اخبارات میں ترجمہ ہوکر زہریلا مادہ پھیلاتے تھے جس سے دیسی دہریوں کو بھی موقع ملا اور دہریا گنگنے لگے۔ ایک طرف عیسائی پادریوں کے تثلیث کا غل، دوسری طرف آریہ گروہ کے بے جا حملے، پھر دیسی دہریوں کے مضامین سب پر طرہ پنڈت شردھا رام ہندوستان کے دہریوں کے گرو گھنٹال کی لمبی چوڑی، ۲۰۶ صفحہ کی اُردو کتاب ایسے امور نہیں جن سے چشم پوشی کی جائے۔"

"جب سے پنڈت شردھا رام کی اُردو کتاب وجودِ باری تعالیٰ کے خلاف کارخانہ اخبارِ عام لاہور میں چھپ کر شائع ہوئی ہے سخت ہلچل مچ رہی ہے۔ اُدھر کم علم مسلمانوں کے بہک

جانے کا اندیشہ' اُدھر حق بات پر جھوٹی دلیلیں اور تمثیلیں دیکھ کر دل کو تاب نہیں۔ یہ کتاب ڈیڑھ روپیوں کے ہزار ہا روپے کی مدد سے ہزاروں کے شمار سے زائد شائع ہو رہی ہے جس کے عنوان پر لکھا ہے کہ "ست امرت پرواہ" یا چشمۂ آبِ حیات راستی جو مذہب و مذاہب کے جھگڑے مٹا کر مکمل دلیلوں اور حوالوں سے انسان کو سکھاتا ہے کہ کس بات پر ایمان لانا چاہیئے۔"

ان مخالف امور نے ایسا شور مچا رکھا تھا کہ العظمت للہ جس سے بڑے اثر پڑنے کا اندیشہ تھا اور اپنے پاک و سچے مذہب کی حفاظت بھی ضروری بات تھی اور آئندہ کے لیے گمراہوں کی ہدایت کا خیال بھی ثوابِ عظیم سے خالی نہ تھا۔ اس لیے قوم نے فلسفیانہ طور پر عقلی دلائل کے ساتھ آیات بینات، اللہ تعالےٰ جل شانہٗ میں ایک ایسی کتاب کا مرتب کرنا ضروری سمجھا جو اس طوفانِ بے تمیزی میں سدِ راہ ہو اور یہ کام خاکسار کے سپرد ہوا جس کو خاکسار نے بڑے جوش و خروش سے ترتیب دیا اور کافی محنت اور جفاکشی سے پندرہ جز کی بسیط کتاب لکھ ڈالی۔ اس کو تاریخی نام "خمخانۂ جاوید" سے موسوم کیا اور حسبِ ضرورت دو حصوں میں منقسم کیا۔ پہلا حصہ تقریباً سات جز کا ہے جس میں وجودِ باری تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے تاکہ مخالفین کو چون و چرا کا موقعہ ہی نہ ملے۔ دوسرا حصہ بھی ثبات وجود اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی وصال کی تدبیریں عقلی و نقلی طریقہ سے قرآن شریف و حدیثِ نبوی و دیگر کتب تصوف کیمیائے سعادت، احیاء العلوم، طالع شموس، مثنوی مولانا روم، منہاج العابدین اور ارشاد الطالبین، مکتوب صوفیاء کرام، اقوال و احوال و اوراد و اشغال اہل اللہ سے ایسے لاجواب انداز سے مرتب کیا کہ اس وقت تک اُردو زبان میں تصوف کی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ کتاب میں جا بجا دلیلوں اور تمثیلوں کے بعد ہر مقصد کو بڑے زور کے ساتھ ثابت کیا ہے جس کے خلاف دم مارنا کارے دارد کا مصداق، اس کی عبارت سلیس اردو ہے۔"

یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ درباره نزول فقر و خنا و طریق تصوف با صفا۔ تبصره درباره وجود حضرت باری تعالیٰ جل جلالہٗ و عم نوالہٗ۔

باب اول: اثبات ذات و آیات اللہ تعالیٰ جل شانہٗ میں۔ باب دویم: وحدانیت اللہ تعالےٰ جل شانہٗ، باب سویم: اسلام و ارکانِ شرع شریف۔ باب چہارم: خانوادوں کے بیان میں۔ باب پنجم: پیری و مریدی کے حالات میں۔ باب ششم: رموز فقرا و بزرگان۔

باب ہفتم، اوراد و اشغال و اذکار اللہ تعالیٰ — باب ہشتم، احوال و اقوال و افعالِ بزرگان
باب نہم، نقوش و اعمال انواع و اقسام — باب دہم، شجرات بزرگانِ چشتیہ و قادریہ
باب یازدہم، بقاباللہ و ختم کلام۔

قاضی جمشید علی صاحب نجم نے اپنی اس کتاب "خم خانۂ جاوید" کا یہ تاریخی قطعہ کہا۔

در کتاب تصوف و عرفان — دُرِ مضمون بطرز نو شفتہ
سالِ تاریخ بود چوں مطلوب — نجم دُر گوش معرفت گفتہ

۱۳۲۰ھ

قاضی جمشید علی صاحب نجم کے کلام میں روانی اور درد ہے۔

غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ جناب مجتبیٰ راحت مولائی صاحب ایم ایل اے کے چچا استاد رشید مراد آبادی نے مجھ کو اپنی بیاض دکھائی تھی جس میں حضرت قاضی سید جمشید علی صاحب نجم کے حسب ذیل اشعار درج تھے۔ اُس میں سے میں نے نقل کئے۔

نیرنگ جہاں بھی ہے عجب بھول بھلیاں — اس میں جو پھنسا بھول گیا راستہ گھر کا
کس پیار سے لیتا ہے بلائیں ید بیضا — اللہ رے جوبن تری الفت کے شرر کا
کیا دیکھے چشم ہمہ کتاب نظر نہیں — ہے برقِ طور حسنِ مرے آفتاب کا

نہ داغِ دل کے سوا کوئی اپنے کام آیا — یہ بے کسی میں چراغ اپنا سرفراز ہوا
آشنا بر سوں رہے لیکن رہے نا آشنا — کام تھا جو مجھ کو مشکل تم کو آساں ہو گیا
آنسوؤں کے ساتھ ہی آنے لگے لختِ جگر — نو بہار آئی نہالِ غم گل افشاں ہو گیا
یہ کام تھا تیرا ہی غمِ یار و گرنہ یاں — کس نے دلوں سے نقشِ تعلق مٹا دیا
آہستہ کان میں نہیں معلوم کیا کہا — ہر غنچہ کو نسیم سحر نے جگا دیا
رہ گئی دل کی تمنائے شہادت دل میں — ہائے بھولے سے بھی قاتل کو نہ میں یاد آیا
نالۂ بلبلِ شیدا کا اثر دیکھ لیا — کبھی گلچیں جو گیا باغ سے صیاد آیا

تجھ سے گل شرمندہ ایسا جانِ جاں ہو جائیگا — پانی پانی ہو کے شبنم میں نہاں ہو جائے گا
غنچے ہنس ہنس کر بلائیں لیں گے چٹ چٹ شوق سے — باغ باغ آنے سے تیرے باغباں ہو جائے گا

خون سے میرے بڑھے گی تیغِ قاتل کی بہار　　یہ چمن جوہر کا رشکِ گلستاں ہو جائے گا

آہ و نالہ نے بھی جواب دیا　　ضعف میں کوئی آشنا نہ رہا[1]

آتی ہے مگر کوچۂ جاناں سے یہ اے جمؔ[2]　　دامن ہے معطر جو نسیم سحری کا
ہے نامۂ اعمال مرا سامنے میرے　　کہتا ہوں جسے اے دلِ مضطر شبِ فرقت
تھا خفتہ میں شب مست مئے جامِ الم کا　　اک دولتِ بیدار کا رخ خواب میں چمکا
سر تا بہ قدم غیرتِ خورشید تھی پیکر　　تھا حسنِ حسینانِ جہاں عکس قدم کا
بکھرے ہوئے بالوں میں وہ عارض کے تھے جلوے　　گویا کہ گھٹا سے تھا کوئی چاند سا چمکا
ابرو کا وہ عالم تھا کہ تھی تیغ سیہ تاب　　کشتہ تھا دلِ راست ہر اک جلوۂ خم کا
اے مجمعِ بحرین دولت عدل و کرم را　　دے مطلعِ سعدین درَبَت علم و عَلم را
از روئے تو شد صبح وطن شامِ غریباں　　وز کوئے تو شد داغ بدل باغِ ارم را
ممنونِ تو ہر شیخ و برہمن بود، آرے　　شمع ست گلِ باغ کرم دیر و حرم را
از رشکِ دلِ روشنت اے نورِ جوانی　　برزد بزمین پیر فلک ساغرِ جم را
از فیضِ تو خوں خشک شدہ در تنِ حاتم　　وز عدلِ تو دل تر شدہ کسرائے عجم را

شاہِ انجم چو شود رونقِ اورنگِ حمل　　سازد از فیض نظر فرشِ زمیں را مخمل
شاہدِ گل شود از ناز و ادا جلوہ فروش　　بلبلانِ چمن از شوق بخوانند غزل
ساغرِ لالہ گریں گو نہ دہد ساقی شوخ　　چہ عجب شوق گرفتن بکند پنجۂ شل
چشم از عکسِ چمن سرخ شود ہم چو شفق[3]
طبع از گل بنماید ہمہ لبریز بغل

---

[1] بیاضِ استاد رشید مراد آبادی　[2] سخن الشعرا صلا
[3] تذکرہ تلامذۂ غالب ص۵۵

قاضی جمشید علی صاحب تجمؔ کے دو صاحبزادے قاضی عبدالعلی عابدؔ اور قاضی ابوالعلی تھے۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ قاضی صاحب کے برادر نسبتی میر محمد علی جویاؔ مراد آباد کے رہنے والے تھے جو قاضی عبدالعلی عابدؔ کے ماموں گویا عابدؔ صاحب کی والدہ ماجدہ کے بھائی تھے اور میر جی غلام حسین جاگیردار بچھرایوں کے نواسے تھے۔ تاریخ گوئی میں ان کو وہ کمال حاصل تھا کہ ان کے زمانے میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔

مراد آباد کے باشندے تھے لیکن نہ معلوم جے پور ان کو کیوں پسند آیا کہ وہاں جانے کے بعد وہیں کے ہو گئے۔ تب کوتوال مقرر ہوئے۔ سکنی جائیداد خرید کر جے پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ زندگی سادہ بسر کرتے تھے۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ ملازمت کے زمانے میں کبھی سواری پر نہیں نکلے۔ گھر سے کوتوالی یا کوتوالی سے کہیں موقعہ معائنہ کرنے کے لئے جاتے تو ہمیشہ پیدل جاتے۔ سواری کا گھوڑا کسا کسایا کوتل پیچھے ساتھ ہوتا۔ احباب معلوم کرتے کہ سواری کیوں نہیں لیتے، تو جواب میں کہتے کہ آج تو یہ ملازمت ہے کل نوکری نہ رہے تو پیدل ہی پھرنا پڑے گا۔ پھر لوگ کیا کہیں گے۔؟

شعروشاعری سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ رشکؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کوئی شخص کسی واقعہ کی تاریخ مانگنے جاتا تو اخلاق سے پیش آتے۔ حقہ بہت پیتے تھے۔ ایک کش لگایا اور فوراً مادۂ تاریخ کہہ دیا اور اسی وقت مصرعے لگا کر اس کے حوالے کر دیا۔ اکثر واقف کار راستے میں اور سرکاری کام کرتے ہوئے مادۂ تاریخ پوچھ بیٹھتے تھے۔ دماغ اس قدر حاضر تھا کہ فوراً مادہ تجویز کیا اور مصرعے چسپاں کر کے سنا دیا کرتے تھے۔

جویاؔ صاحب کی ایک تصنیف "سرودِ غیبی" ہے جو ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۲۰۰ قطعات، مثنویاں، رباعیات، قصائد اور غزلیات ہیں اور کچھ خط نثر میں ہیں۔ اور وہ سب تاریخی ہیں۔ عجیب عجیب صنعت سے تاریخیں نکالی ہیں۔ بعض صنعتیں خود ایجاد کی ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے علاوہ سنسکرت، ہندی، انگریزی، پشتو، پنجابی اور جے پور جھاڑشاہی زبان میں پورے پورے تاریخی مصرعے کہے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ایک مصرعہ سے ایک لاکھ بارہ ہزار مادے نکالے ہیں۔ اس دماغ کا اندازہ لگانا ہرگز آسان نہیں۔

میر محمد علی جویاؔ کے متعلق مولانا تسلیمؔ اسی کتاب کی تقریظ میں فرماتے ہیں۔

" ملکہ خداداد کا یہ حال کہ جویائے تاریخ کی تاریخ طلب کرنے میں جس قدر ساعت صرف ہوتی ہے گویائے تاریخ کو کہ حضرت جویاؔ ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ تاریخ نکالنے میں نہیں لگتی۔ "

یہ تو تحقیق نہ ہو سکا کہ اس باکمال کو اپنے فن سے کچھ فیض حاصل ہوا یا نہیں۔ البتہ یہ کتاب نواب میر امیر علی خاں والی ٹونک کے نام آپ نے معنون کی ہے۔ ان کی مدح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں سلہ

"ہر چند کہ جویا اس گلشن میں بے برگ اس کے نواسنج مہدی علی خاں ذکی نے والیٔ لکھنؤ کے اوصاف میں بارہ شعر کہے خلعت جاگیر ذیل سے ممتاز ہوا۔ جویا نے علی قدر مراتب وہ کچھ کہا کہ جس جلوہ میں عمر بھر کے بے آز ہو گیا۔ کیوں نہ ہو کہ اس کی ذاتِ فیض آیات مشہور جہات ہے۔ اس رسالۂ بے بہا کو ان کے نامِ نامی پر تالیف کیا ہے۔"[1]

قاضی سیّد عبدالعلی عابدؔ جب مراد آباد میں ۱۹ ر صفر ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے تو ماموں جان کو اپنے بھانجے کے پیدا ہونے پر بے حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے اس کی ولادت پر یہ تاریخی قطعہ کہا ؎

چوں بہ جمشید علی پسر حق داد	دل من شاد گشت و شد خوش تر
ہاتفِ غیب گفت اے جویا	سالِ تاریخ او بلند اختر

۱۲۸۰ھ

عابد صاحب نے عربی، فارسی و انگریزی کی تعلیم مدرسہ امدادیہ، مدرسہ عربیہ قاسم العلوم اور مشن ہائی اسکول مراد آباد سے حاصل کی۔ آپ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ابتداء میں آپ نے اپنے والد ماجد سے اصلاح لی اسی دوران میں شوکت باغ کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ حضرت داغؔ بھی رامپور سے تشریف لاکر بزمِ سخن میں شریک ہوتے تھے۔ آپ نے اس زمانے میں جناب داغؔ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور تخیل کو زبان اور قالب میں ڈھال کر نہایت دل آویز بنا دیا۔ شعر گوئی کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ جس طرح آپ کے ماموں سیّد محمد علی جویاؔ تاریخ گوئی اور صنائع بدائع میں مشہور تھے۔ آپ نے اسی طرح غیر معمولی شہرت اس فن کمال میں حاصل کی تھی۔ مرزا تسخیرؔ مراد آبادی نے جب صنعت ملفوظی میں حضرت تسلیمؔ کے انتقال کی تاریخ کے لئے انعامی اشتہار شائع کرایا تو یہ میدان آپ کے ہاتھ آیا۔ اخبار نیر اعظم مراد آباد میں اس پر اعتراض ہوا۔ اس کا فیصلہ داغؔ اور جلالؔ کے سامنے آیا۔ انھوں نے اعتراض کو لغو ٹھہرایا۔ چنانچہ صاحب خم خانۂ جاوید لالہ سری رام دہلوی نے اس بات کی تصدیق کی اور تحریر کیا۔

"داغؔ مرحوم ہمیشہ آپ کو فخرِ داغؔ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ حاسدانہ طور پر آپ پر جو اعتراضات شاعری اور تاریخ گوئی کے متعلق شائع ہوئے تھے ان کو جلالؔ اور حضرت امیر مینائی نے غلط اور نامعقول قرار دیا۔"

۶ر جنوری ۱۹۰۸ء کو مراد آباد کے شعراء نے ایک انجمن سخن قائم کی جس میں جناب صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں شستہ،

---

[1] تذکرہ شعراء جے پور صد ۲۰، قصائد مدحیہ نظام صد ۲۰ صد ۲۲۵

جناب صاحبزادہ شبیر علی خاں شبیر، حضرت مضطر خیرآبادی اور جناب جلیل وغیرہ شریک تھے آپ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ آپ اپنے استاد حضرت داغ کو صاحب طرز اور یک رنگ مانتے تھے اور مسئلہ جانشینی داغ کے ابتدا سے مخالف تھے اور اس کے متعلق اپنے اخبار مخبر عالم مرادآباد اور دوسرے مشہور و معروف اخبارات میں مضامین نکالتے رہے۔ اصنافِ سخن پر قادر تھے اور محاورات کے ماہر تھے۔ علمی تاریخی اور اخلاقی مضامین آپ نے کثرت سے لکھے ہیں۔ تیر نظر ناول اور فغانِ عابد نظم وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ جو مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔ لالہ سری رام دہلوی آپ کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ آپ کے بارے میں انھوں نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے[1]

"عابد صاحب سرخ و سفید رنگ، خوشنما خد و خال، متوسط قد و قامت کے آدمی ہیں، مزاج میں خوش طبعی و ظرافت ہے۔ رامپور کے نامی مشاعروں میں دادِ سخن لے چکے ہیں۔ انجمن اتحادِ سخن دہلی کے تحت جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے تھے۔ زود گوئی میں فرد ہیں۔ الفاظ کی نشست، بندش کی خوبی، روزمرہ بول چال داغ کی شاگردی کا اظہار کرتی ہے۔ ہر شعر گلزارِ داغ کی شگفتگی معلوم ہوتی ہے جس میں سادگی اور مضمون آفرینی کا رنگ ہے۔"

فی البدیہہ شعر کہنے میں عابد صاحب کو کمال حاصل تھا۔ رامپور کے ایک مشاعرے میں جناب تشنہ مرحوم سکریٹری رامپور نے آپ کو یاد فرمایا۔ آپ اس وقت پہونچے جب مشاعرے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور غزلیں پڑھی جا رہی تھیں، اسی مشاعرہ میں آپ نے نو اشعار کی ایک غزل کہی۔ شمع آپ تک پہونچی، غزل سنائی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

آہ و فریاد کو روکے گی یہ چلمن کب تک	وہ سنیں گے نہ مرا نالہ و شیون کب تک
تیغ اٹھانا ہے اگر یار نگاہیں تو اٹھیں	ہم جھکائے ہوئے بیٹھے رہیں گردن کب تک
منتظر راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں پیک نظر	تم چھپاؤ گے نظر بازوں سے جوبن کب تک

عشق کے ساتھ نکل جائے یہ دم بھی عابد
میرے ہاتھوں میں رہے گردشِ دامن کب تک

ایک مرتبہ آپ لکھنؤ گئے۔ جہاں قیام تھا اس سے متصل دوسرے دن مشاعرہ تھا۔ مہتمم مشاعرہ کو آپ کے آنے کی اطلاع دوسرے روز ہوئی۔ وقت کے وقت مہتمم صاحب مع چند شعراء کے آپ سے ملے اور طرحی مشاعرے میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ نے وعدہ کر لیا۔ قیام گاہ پر تو موقعہ نہیں ملا۔ مشاعرہ میں آ کر آپ نے اکیس شعر کی ایک غزل کہی۔ مشاعرے میں سنائی تو سننے والے بہت خوش ہوئے۔ خوب داد ملی۔ اس کے چند شعر یہ تھے۔

---

[1] خمخانۂ جاوید، جلد پنجم ص ۴۹۰

دیکھ کر مجھ کو وہ غیروں سے یہ فرمانے لگے ۔۔۔ ناک میں دم ہے مرا اب روز یہ آنے لگے
مے سے میں توبہ کروں اے شیخ جی اچھی کہی ۔۔۔ بس چلو رخصت میرے اب کان کیوں کھانے لگے
صدقے اس شوخی کے اس انداز کے اس ناز کے ۔۔۔ آپ ہی چھیڑا مجھے اور آپ شرمانے لگے

کیا کریں گے داورِ محشر سے ان کا کچھ گلہ
اک قیامت حشر میں ہوگی جو شرمانے لگے

ایک مرتبہ مراد آباد شہر کا کوتوال آپ سے ملاقات کرنے کے لئے گھر پہ آگیا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ غزل سنا دیجئے۔ اسی وقت آپ نے ایک کاغذ لیا اور اس پر اشعار لکھنے شروع کر دیئے۔ دس منٹ میں پندرہ شعر کی ایک غزل لکھ دی اور اس کو سنائی تو حیرت میں رہ گیا۔ اس غزل کے حسب ذیل چند شعر یہ تھے۔

نہیں کھنچتی نزاکت سے اگر تلوار تھوڑی سی ۔۔۔ کئے جھگڑا اٹھا دے ابرو ئے خمدار تھوڑی سی
وہ کچھ ایسے بگڑ بیٹھے منانے سے نہیں منتے ۔۔۔ ہوئی تھی باتوں باتوں میں یونہی تکرار تھوڑی سی
یہ میں ہرگز نہیں کہتا محبت ہی نہیں تم کو ۔۔۔ مقرر ہے بلاشک مگر اے یار تھوڑی سی
گرائیں بجلیاں ڈھائی قیامت آج تو تم نے ۔۔۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی دم رفتار تھوڑی سی
یہاں بھی مر گیا شوقِ شہادت دم میں گھٹ گھٹ کر ۔۔۔ وہاں بھی رہ گئی کھنچ کر اگر تلوار تھوڑی سی

عدو سے اضطرابِ شوق میں ایسا بہک اٹھا
حقیقت کہہ گیا دل کی دمِ گفتار تھوڑی سی

مرزا دآغ کی زندگی میں کسی نے دشمنی میں یا غلط فہمی میں ان کی وفات کی خبر اخبار وکیل امرتسر میں شائع کرا دی جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ اس خبر کی تردید کرنے کے لئے آپ نے بڑے جتن کئے۔ اخبارات میں تردیدی مضامین شائع کرائے۔ بکثرت تار و مطبوعہ کارڈ و اشتہارات ملک کے مختلف مقامات پر بھیجے جن سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حضرت دآغ حیات ہیں۔ دآغ کو خبر ہوئی تو انھوں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

آپ ۱۸۸۲ء میں اخبار جام جمشید اور روہیل کھنڈ و بلند اختر کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے تھے مبین الاخبار مراد آباد سے یکم اپریل ۱۸۸۱ء کو وجود میں آیا۔ اس کے مالک مولوی اشرف علی اور مولوی دلاور علی تھے۔ ۱؎ ہفتہ وار نکلتا تھا۔ اس کی ادارت بھی آپ نے کی۔ اردو صحافت کی دنیا میں آپ خصوصی حیثیت کے مالک تھے اسی بنا پر ڈسٹرکٹ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے آپ صدر منتخب ہوئے۔ ۱؎

۱؎ اختر شہنشاہی ۱؎ تاریخ صحافت اردو دوئم ص ۲۴۴

آپ نے مخزنِ عالم مراد آباد محلہ شیدی سرائے سے ہفتہ وار ۸ جون ۱۹۰۳ء کو جاری کیا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید عبدالعلی عابد مراد آبادی تھے۔ سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ ظل سلطان مخزنِ عالم پریس باہتمام سید منور علی منیجر چھپتا تھا۔

پہلا شمارہ مخزنِ عالم کے نام سے چھپا۔ تیسرا پرچہ ۲۴ جون ۱۹۰۳ء کا مخزنِ عالم ورحمتِ عالم کے نام سے شائع ہوا، اور اخبار کے نام کے نیچے یہ عبارت درج ہونے لگی۔ "روہیل کھنڈ میں سب سے آزاد اور زیادہ چھپنے والا"۔ اس کے بعد ۱۶ جولائی ۱۹۰۳ء کے شمارے میں اخبار کے نام کے نیچے یہ عبارت لکھی جانے لگی:

"بہ سرپرستی عالی جناب صاحبزادہ والا مناقب مولوی رحمت اللہ میاں صاحب فضل رحمانی گنج مراد آبادی خلف حضور پر نور مولانا شاہ احمد میاں صاحب دامت فیوضہٗ۔"

اس اخبار کے حسب ذیل ضابطہ سرورق پر شائع ہوتے تھے۔

"مخزنِ عالم اپنے رنگ ڈھنگ میں نہایت پختہ، بلا خوف وخطر ملک وقوم کی خدمت کرنے والا اور باادب گورنمنٹ سے عرض ومعروض کرنے والا پرچہ ہے جو ہر انگریزی مہینے کی ۸، ۱۶، ۲۴، ۳۲ کو چھپ کر شائع ہوتا ہے۔ ہر پیشگی سالانہ چندہ دینے والے خریدار کو ایک دلچسپ ناول مفت۔"

۸ ستمبر ۱۹۰۳ء کے پرچے سے حسب ذیل قطعہ اخبار کے سرورق پر چھپنے لگا تھا۔

رحمت اللہ بہ فضلِ رحمان ‏ ‏ ‏ گشتہ چوں مخزنِ عالم یاور
ہاتفی گفت مسیحی تاریخ ‏ ‏ ‏ مخزنِ رحمتِ عالم بن کر

۱۹۰۳ء

اس اخبار میں ملکی خبریں کم اور غیر ملکی خبریں خاص طور پر اسلامی ممالک کی خبریں زیادہ چھپتی تھیں۔ ادبی، تاریخی اور معلوماتی مضامین اور شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا۔ ریاستوں کے انتظامی معاملات پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔

مخزنِ عالم آزاد خیال اخبار تھا۔ ملک کی غلامی کی لعنت کو برا سمجھتا تھا اور ملک وقوم کو آزاد کرانے والی تحریک کا ساتھ دیتا تھا۔ چنانچہ سودیشی کی تحریک کی اس نے کھل کر حمایت کی۔ اس کے حق میں تبصرے کئے اور اس کی خبریں نمایاں طور پر شائع کیں۔ انگریز ہندوستان کے ساتھ جو امتیاز برتتا تھا ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں ذلیل اور خوار اور بے عزت کرتا تھا اور ہندوستانیوں کی عزت وآبرو کو خاک میں ملاتا تھا۔ اس کی یہ اخبار مذمت کرتا تھا۔

عابد صاحب اعلیٰ ترین اخلاق اور صفاتِ انسانی کا مجسمہ تھے۔ آپ کی شرافت، مروّت، وضعداری، اور مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ آپ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بزرگ شاہ صندلؒ کے مرید تھے۔ ۱۹۱۳ء میں

فریضۂ حج ادا کیے۔

عابد صاحب مراد آبادی ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ تقریباً ہر طبقہ ان کا احترام کرتا تھا۔ مراد آباد میں نمائش ہوتی تھی، اس میں غالباً ۱۹۲۷ء سے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تین مشاعرے ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء کے ناکام ثابت ہوئے تو سید عبدالعلی عابد صاحب کو ۱۹۳۰ء کی مشاعرہ کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا۔ چنانچہ یہ نمائش گذشتہ تمام نمائشوں سے بہ حیثیت صنعتی و حرفتی و زراعتی اعتبار سے کامیاب ثابت ہوئی جس کا نظارہ قابل دید تھا۔ سینکڑوں شعراء کے ساتھ ہزاروں اہل علم سامعین ۱۰ جنوری کی شب میں ٹھیک ۸ بجے سے ۲ بجے تک، اور گیارہ جنوری کو ۹ بجے صبح سے ۲ بجے دوپہر تک مشاعرے میں شریک رہے۔ باوجود سخت سردی کے ہجوم میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی اس مشاعرے کی عظمت اس سے بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے کہ مشاعرے کی جانب سے علاوہ مقامی حضرات کے ساڑھے سات سو دعوت نامے شعرائے ہند کی خدمت میں روانہ ہونے کے علاوہ ہندوستان بھر کے قریب قریب تمام معزز ہندو مسلم اخبارات اور بعض انگریزی اخبارات نے بھی اس مشاعرے کے مصرعۂ طرح کا اعلان شائع کیا تھا۔ ہر حلقہ اور ہر طبقہ کے شعراء کی طرح کچھ ایسے مشہور شاعروں کے کلام بھی اس مشاعرے میں شامل ہوئے جو کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ خصوصاً حضرت ریاض خیرآبادی جو آسمانِ سخن کے ایک درخشندہ آفتاب اور اپنے دور میں تمام اساتذہ متقدمین کی یادگار تھے۔ آپ نے ضعف پیری کی وجہ سے شرکت کی معذرت کرتے ہوئے اپنی غزل روانہ فرمائی۔ صاحبزادہ سید محمد شبیر علی خاں صاحب خلف نواب کلب علی خاں سابق فرمانروائے رامپور نے اپنے بہت سے شاگردوں کو بھیجنے کے ساتھ اپنی غزل بھی مرحمت فرمائی اور طبقۂ مشائخ کرام میں سلطان و آزاد اور جیا ماجان معہ اپنے معتقدین و مریدین مشاعرے میں شریک ہوئے۔ جن کے پر تصوف کلام نے حاضرین کے دلوں پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ تمام ہندو مسلم مقامی شعراء کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، شاہجہاں پور، کلکتہ، بمبئی، مدراس، اور میرٹھ کے شعراء حضرات آئے جن کے قیام کے لئے اس مرتبہ تین وسیع خیمے اور ایک چھولداری نصب کی گئی تھی۔ ان سب کے پُر ہو جانے کے بعد بعض مہمانوں کے لئے دوسرے مقامات کا انتظام کیا گیا۔

ان مہمانوں کے آرام و آسائش کے لئے قریب میں ایک ہوٹل تھا جہاں ہر قسم کے کھانے، و چائے وغیرہ کا کافی انتظام تھا۔ مہمانوں کی خاطر مدارات و تمام ضروریات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا تھا۔ جس سے بیرونجات کے شعراء نہایت خوش اور محظوظ رہے۔

اس سے قبل مہمانوں کے لئے مختصر سا انتظام کیا جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ مشاعرۂ نمائش میں سوائے شور اور پھکڑ بازی کے کچھ نہیں ہوتا ہے چنانچہ منشی فضلِ رب صاحب باغ سابق سکریٹری مشاعرہ کمیٹی اپنی رپورٹ مشاعرہ ۱۹۲۷ء میں خود لکھتے ہیں:-

"یہ اعتراض کہ مشاعرے میں مذاق اڑایا جاتا ہے آوازے کسے جاتے ہیں، پھبتیاں کسی جاتی ہیں بے شک درست ہے لیکن میرا کیا تعلق ہے۔ میں خود بھی ایسی لغویات ایک ادبی جلسہ میں پسند نہیں کر سکتا۔ چند بے تمیزوں نے مذاقِ بے محل اور گفتگوئے مہمل شروع کی تھی لیکن جواب ترکی بہ ترکی ملنے سے سکون ہو گیا۔"

اسی رپورٹ میں آپ دوسری جگہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"بعض میرے قابل دوست میری مخالفت پر آمادہ رہے اور حتی المقدور مشاعرہ کو ناکامیاب اور بائیکاٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک کمیٹی قائم کر کے چند تجویزیں پاس کیں اور اس کی نقل بذریعۂ ڈاک میرے پاس بھیج دی گئی۔ میں نے اپنے دوستوں سے بارہا کہا کہ اگر میں اس خدمت کے لئے موزوں نہیں ہوں تو آپ کسی اور کو تجویز فرما سکتے ہیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ گذشتہ مشاعرہ کمیٹی بدنام تھی اور اس کا شعرا بائیکاٹ کر چکے تھے۔ اس میں معزز ہستیاں شریک نہیں ہوتی تھیں اور یہ مشاعرہ ایک طوفانِ بے تمیزی اور بازیچۂ اطفال بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے مشاعرۂ نمائش کمیٹی کے اجلاسوں کی صدارت کوئی معزز شخص قبول نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ اسی رپورٹ میں باتغ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کو صدارت کے لئے مدعو کیا تھا وہ دوبارہ کے جلسہ میں چلے گئے تھے۔ پھر جناب مولوی سید ابو محمد صاحب ڈپٹی کلکٹر مراد آباد سے درخواست کی گئی۔ ڈپٹی صاحب موصوف نے بھی عدیم الفرصتی کا عذر فرماتے ہوئے تجویز کیا کہ جناب سلطان حیدر صاحب کو صدر بنایا جائے۔ چنانچہ میں نے ان سے مل کر استدعا کی لیکن انھوں نے بھی صدارت سے معذرت کی۔ آخر رامپور کے ایک شاعر کو صدر بنایا گیا۔"

اسی طرح سالِ گذشتہ کی رپورٹ مشاعرہ ۱۹۲۹ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مشاعرہ کی صدارت ایک شاعر ولایت حسین دکانے کی اور ان کے کسلمند ہونے کے بعد شوق صاحب صدر نشین ہوئے۔ ۱۹۲۸ء کے مشاعرے کی صدارت شوق صاحب کے لئے تجویز ہوئی۔ جب وہ چلے گئے تو طاہر رامپوری و کلیم مراد آبادی کی تحریک و تائید کے بعد خود باتغ صاحب سکریٹری مشاعرہ کمیٹی نے کرسیٔ صدارت کو رونق بخشی۔

اس مشاعرہ ۱۹۳۰ء کی شب کے مشاعرہ کی صدارت عالی جناب مولوی طفیل احمد صاحب بہادر جج خفیفہ ضلع مراد آباد نے فرمائی۔ آپ ساڑھے گیارہ بجے رخصت ہوئے تو مشہور علم دوست اور خوش گو شاعر جناب مولوی مسعود حسن صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر نے آخر وقت تک صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ اپنی غزل بھی ارشاد فرمائی

۱۱ر جنوری صبح کے وقت مشاعرہ کی صدارت جناب صاحبزادے حافظ محمد احمد رضا خاں صاحب عرف مُنّن رئیس اعظم ملک لکھبریا تم الرامپوری ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ و سکریٹری صیغۂ زراعت نے فرمائی اور ان ہر دو جلسوں میں تقریباً تمام حکام دیوانی و فوجداری، وکلاء اور معززین شہر شریک رہے اور خیمۂ مشاعرہ میں تمام ارد گرد کی کرسیاں پُر تھیں اور درمیانی فرش پر تخمیناً پانچ ہزار سامعین تشریف فرما تھے۔ بہت سے حضرات نے قنات کے قریب ہی کھڑے رہنے پر قناعت کی، اور نہایت خاموشی و سکون کے ساتھ حاضرین نے شعراء کا کلام سنا۔ اور ایسے عظیم الشان جلسوں میں ذرہ برابر بھی شور و غل نہیں ہوا۔ آوازیں نکلنا، پھبتیاں کسنا تو کجا داد سخن نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ دی گئی جس سے ہر شاعر مسرور تھا۔ کڑاکے کی سردی کی کسی نے پرواہ نہیں کی۔ ہر شخص شروع سے آخر تک شریک رہا۔

دوسری اہمیت اس مشاعرے کی غزلیات کی تعداد تھی۔ مشاعرہ ۱۹۲۷ء میں اگرچہ دو مصرعے طرح کے تھے۔ اور بعض شعراء نے دو دو غزلیں لکھی تھیں۔ پھر بھی اول طرح میں کل ۹۲ اور دوم میں ۵۱ غزلیں موصول ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۸ء کے مشاعرہ میں جب کہ ایک مصرعۂ طرح تھا صرف ۱۱۰ غزلیں بیشتر غیر مشہور شعراء کی آئی تھیں، اور ۱۹۲۹ء کے مشاعرہ میں ۱۰۸ غزلیات پہونچی تھیں لیکن اس مشاعرہ ۱۹۳۰ء میں ۲۰۰ غزلیں شعراء کی وصول ہوئیں۔

تیسری اہمیت اس مشاعرہ کی یہ تھی کہ گذشتہ مشاعروں میں گمنام کمیٹیاں قائم ہوئیں اور رپورٹوں میں صرف ایک دو اشخاص کو منتخب کنندۂ کلام ظاہر کیا گیا تھا۔ لیکن اس مشاعرہ ۱۹۳۰ء میں باضابطہ کمیٹیاں قائم کی گئیں، جن کا بذریعۂ اشتہار اعلان کیا گیا۔

اوّل کمیٹی مشاعرہ کے حضرات ذیل اعزازی اراکین۔

۱۔ جناب مرزا معظم علی بیگ ڈپٹی کلکٹر مراد آباد ۲۔ جناب مولوی سید غیور احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر مراد آباد ۳۔ جناب بابو رگھونندن کشور شوقؔ بی اے ایل ایل بی ۴۔ جناب سید آل حسن صاحب بی اے ایل ایل بی، ۵۔ جناب افضل خاں صاحب زمیندار و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ مراد آباد۔

کمیٹی انتظامیہ: صہباؔ صاحب، ناکیؔ صاحب، بھگوتؔ صاحب، بیزارؔ صاحب، ڈاکٹر شوکت صاحب، حکیم ابرار الحق صاحب اور مسٹر جتندر ناتھ صاحب وفاؔ۔

کمیٹی انتخاب کلام: ۱۔ عالی جناب خان بہادر قاضی محمد شوکت حسین خاں صاحب رئیس اعظم مراد آباد صاحب دیوان، ۲۔ جناب مرزا علی رضا صاحب محزوںؔ رئیس مراد آباد صاحب دیوان، ۳۔ جناب مرزا احمد شاہ بیگ جوہرؔ مولف رسالہ علم عروض، ۴۔ جناب اخگر مراد آبادی۔

انتخابِ کلام کمیٹی نے شعراء کا کلام منتخب کر کے چھ تمغے دینے کا فیصلہ کیا۔

۱۔ تمغۂ نقرئی درجہ اوّل۔ حضرت ریاضؔ خیرآبادی ۲۔ تمغۂ نقرئی درجہ دوئم۔ صاحبزادہ سیّد شبیر علی خاں صاحب ۳۔ تمغۂ نقرئی درجہ سوئم۔ حضرت برقؔ رئیس شاہجہانپوری ۔ ۴۔ تمغۂ نقرئی درجہ چہارم۔ اشتیاق احمد مشتاقؔ اسلون ضلع رائے بریلی، ۵۔ تمغۂ نقرئی درجہ پنجم۔ جناب نروتم داس صاحب داسؔ مرادآبادی۔ ۶۔ تمغۂ نقرئی درجہ ششم۔ جناب حبیب اللہ خاں صاحب حبیبؔ رامپوری

۱۹۳۰ء کے مشاعرے کے شعراء کا منتخب شدہ کلام مشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری سیّد عبدالعلی عابدؔ مرادآبادی نے طبع کرایا جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جن چھ شعراء کو انعام میں تمغے دیئے گئے تھے ان کی غزلوں کا کیا معیار تھا' ان کے شعروں سے اندازہ لگایئے۔

جناب ریاضؔ خیرآبادی۔

بارِ عصیاں کے سوا دو دو فرشتے سر دوش   لطف یہ بندۂ عاجز کو ذرا بار نہ ہو

کب سے کشتی ہے بھنور میں مری اے یم بلا   ڈوب ہی جائے یہ کم بخت اگر پار نہ ہو

پینے آیا ہے سوئے میکدہ جو آبِ حیات   خضر صورت یہ پرانا کوئی مے خوار نہ ہو

خلق کو دھوکے میں ڈالا ہے مقدس بن کر

اے ریاضؔ آپ سا بھی کوئی ریاکار نہ ہو

صاحبزادہ محمد شبیر علی خاں صاحب شبیرؔ رامپوری۔

تیرا بندہ بتِ کافر کوئی دیندار نہ ہو   جھوٹ کہتا ہوں تو اللہ کا دیدار نہ ہو

اس قدر فیض بڑھے رحمتِ باری تیرا   حشر میں کوئی گنہگار گنہگار نہ ہو

جس کا غم کھاتے ہوئے ایک زمانہ گذرا

ہائے قسمت وہی شبیرؔ کا غم خوار نہ ہو

جناب منشی علی حسین خاں صاحب رئیس برقؔ شاہجہاں پوری۔

ہم کہاں آپ کہاں' جلوہ گہِ طور کہاں   کیا کوئی دور سے بھی طالبِ دیدار نہ ہو

کہتی ہے شانِ کریمی مجھے نام اس کا بتاؤ   سرخرو ہونے کے قابل جو سیہ کار نہ ہو

لوگ کہتے ہیں جسے مہر جہاں تاب اے برقؔ

کہیں یہ عکسِ نقابِ رخِ دلدار نہ ہو

نروتم داس گپتا داسؔ مرادآبادی نے ایک خمسہ سنایا تھا جس کا ایک بند یہ ہے۔

میٹھا میٹھا سا مرے درد جو پہلو میں اٹھا یاد تازہ ہوئی دل ماہیِ بے آب ہوا

شوقِ دیدار نے گھر میں مجھے رہنے نہ دیا المدد ضبط کہ رکھنا ہے تجھی کو پردا

بے خودی میری کہیں کاشفِ اسرار نہ ہو

جناب اشتیاق احمد صاحب مشتاق رلسئے بریلوی۔

دشمنوں کو بھی کبھی ہجر کا آزار نہ ہو کوئی اس دامِ محبت میں گرفتار نہ ہو

اب نہیں مجھ سے سنی جاتی برائی مے کی مجھ کو واعظ سے یہ اندیشہ ہے تکرار نہ ہو

چمن نظم بنے رشک دہ باغ ارم

دل پہ مشتاق اگر مجمعِ افکار نہ ہو

جناب حبیب اللہ حبیب رامپوری۔

غم وہی غم ہے کوئی جس سے خبردار نہ ہو درد وہ درد ہے جو قابلِ اظہار نہ ہو

نزع میں ان کے [illegible] کا یہی منشا ہے تلخیٔ مرگ ہو اور شربتِ دیدار نہ ہو

دیکھ لینا ہی حسینوں کا ہے بس وجہِ حیات

ہم نہ مرجائیں جو اک روز بھی دیدار نہ ہو

اس مشاعرے میں ۹۰ شعرا نے شرکت کی تھی اور نتیجوں کے دینے کے بعد حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ان شعرا میں کچھ کو سرٹی فیکیٹ بھی دیئے گئے، جن کے نام اور ان کا کلام بھی درج ذیل ہے۔

جناب مرزا علی جان بیگ آزاد، قصبہ ڈبائی، ضلع بلند شہر۔ آپ کا کلام تصوف کی جان ہے۔

جام پر جام بتکرار پلا اے ساقی دے مئے عشق جسے پینے سے انکار نہ ہو

تو ہے جب پردۂ آفاق پہ اک سرِ نہاں شش جہت کیوں ترے جلووں سے پُراسرار نہ ہو

حسنِ کثرت نے چھپایا ہے مری آنکھوں سے غیر ممکن ہے کہ اس پردے میں دلدار نہ ہو

اپنے آزاد کو اے ساقیٔ بزمِ وحدت

ایسا اک جام پلا دے کبھی ہشیار نہ ہو

جناب کاظمی افق امروہوی مدیر رسالہ شاعر امروہہ۔ آپ خوش گو شاعر تھے۔

غیر ممکن ہے کہ آرام ہو آزار نہ ہو کوئی گلشن نہیں ایسا کہ جہاں خار نہ ہو

وہی ہشیار ہے جو مے کدۂ عالم میں پی کے اک جامِ محبت کبھی ہشیار نہ ہو

اولیں شرط ہے موت آپ سے ملنے کے لئے کیجیے کس طرح کوئی زیست سے بیزار نہ ہو

کس کے نالوں کی چلی آتی ہے پیہم آواز
ارے دیکھو تو کہیں یہ افقِ تار نہ ہو

جناب سیٹھ موہن سرن داس تجو، سنبھل۔

یار کی بزم ہو اور مجمعِ اغیار نہ ہو — میری رسوائی کا چرچا سرِ بازار نہ ہو
ان کو یہ ضد ہے کہ میں وصل سے محروم رہوں — مجھ کو یہ کد ہے کہ کوشش مری بیکار نہ ہو
نہ دوا سے مجھے صحت، نہ دعا سے آرام — مجھ سا دنیا میں الٰہی کوئی بیمار نہ ہو

جناب سید نظیر علی صاحب خلیل۔ محلہ دالان بریلی، ان کا کلام گل گلزار سخن ہے۔

اس کی رحمت کے مزے لوٹیں گے عاصی حشر تک — اس کو رحمت سے غرض کیا جو گنہگار نہ ہو
اس کے دل سے کوئی فرقت کی مصیبت پوچھے — جس کا دنیا میں کوئی مونس و غم خوار نہ ہو
اک فقط ان کا گلہ ان کی شکایت ہے عبث — کوئی ایسا بھی حسیں ہے جو ستم گار نہ ہو

زیست کا لطف اسے خاک ہے دنیا میں خلیل
دل سے جو شیفتۂ احمدِ مختارؐ نہ ہو

جناب قاضی خورشید الاسلام صاحب خورشید سیوہارہ ضلع بجنور باوجودیکہ نومشقی غزل تھی، سننے والوں کو بہت پسند آئی اور خوب داد لی۔

میری غیرت کا تقاضا ہے یہی رہ رہ کر — بے کسی تو بھی عیادت کشِ بیمار نہ ہو
میرے مذہب میں عبادت ہے تری جلوہ گری — جذبۂ شوق بشرطیکہ گنہگار نہ ہو

اس کو کیا ملتی ہے پاداشِ محبت خورشید
قابلِ رحم اگر کوئی خطاکار نہ ہو

جناب نروتم داس صاحب داس گپتا۔ بازار شاہی مسجد مرادآباد۔ آپ کا ستغراق فن و رنگِ تجدید کلام سے ظاہر ہے۔ آپ کا خمسہ بہت پسند کیا گیا۔

بحر زخار نہ ہو وادی و کہسار نہ ہو — دشت و گلزار نہ ہو خلقتِ جاندار نہ ہو
ارض اور ارض پہ یہ چرخِ مدار نہ ہو — نیستی صورتِ ہستی میں نمودار نہ ہو
ضو فشاں کن سے اگر شعلۂ انوار نہ ہو

ہے یہی عشقِ حقیقی کا حقیقت میں پتہ — خود بخود آنے لگے لب پہ انا الحق کی صدا
عشقِ منصور سے یہ رازِ حقیقت کا کھلا — بیخودِ عشق ہو اتنا کہ تو بن جائے خدا

عشق وہ عشق نہیں جس کا ثمر دار نہ ہو

حاصل کوتہ نگاہی ہے سدا ناکامی | رنج و افسوس کا سرچشمہ ہے کوتہ نظری
پاؤں پھیلائیے زیادہ نہ ردا سے اپنی | دستِ نسیاں ہو جو مرہونِ مآل اندیشی

اس کا انجام ندامت کا سزاوار نہ ہو

جناب حاجی داؤد خاں صاحب داؤد سرائے ترین سنبھل ضلع مرادآباد۔

تم بلو طور پہ پھر کیسے وہاں پر جائیں | ہوش جس کو نہ ہو اور طاقتِ رفتار نہ ہو
جانتے سب ہیں تمھیں پردے میں رہتے کیوں ہو | آپ سے کون ہے ایسا جو خبردار نہ ہو
چاہنے والے پہ دن رات مصیبت گذرے | سب خبردار ہوں اک تو ہی خبردار نہ ہو

جذبۂ عشقِ محمدؐ ہو کچھ ایسا داؤد
نعت لکھنے کے سوا اور کوئی کار نہ ہو

جناب منشی محمد فرخ شاہ خانصاحب راغب محرر میونسپلٹی مرادآباد و تلمیذ جناب جوہر

نشۂ بادۂ لفت کو بتاتا ہے حرام | ناصحا ہوش کی پی مفت گنہگار نہ ہو
رند مستوں سے الجھنا نہیں اچھا اے شیخ | صاف کشتیِ مے آپ کی دستار نہ ہو
میرے دم سے ہے ترے حسنِ ادا کی شہرت | جنس بے کار ہے جب تک کہ خریدار نہ ہو

یار کے جور و جفا دل پہ سہو اے راغب
لطف یہ ہے کہ کسی غیر پہ اظہار نہ ہو

جناب قاضی رضی باقر صاحب رضی اہل کار عدالت جج بدایوں، آپ فنِ شعر کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں اور خوش گو شاعر ہیں۔

کفر ہے کفر تری شانِ کرم کی توہین | قابل عفو نہیں ہے جو گنہگار نہ ہو
نہیں کہتے اسے مجبور تو کیا کہتے ہیں | قصد سے حدِ عمل تک بھی جو مختار نہ ہو
کس مپرسی کا سبب فطرتِ عالی ہے مری | ہوں میں وہ جنس گراں جس کا خریدار نہ ہو

لذتِ ذوقِ فنا کی نہ کشش ہو جو رضی
روح زندانِ عناصر میں گرفتار نہ ہو

جناب حکیم سلطان حسن صاحب سلطان بدایونی۔ سلطان صاحب غریقِ دریائے معرفت ہیں۔ آپ کا کلام صوفی منشوں کو روحِ تازہ بخشتا ہے۔

کوئی عاشق مئے دیدار سے سرشار نہ ہو ذرہ ذرہ میں اگر جلوۂ دلدار نہ ہو
لب رہی ہے نگہ ہوش ربا ساقی کی جو مجھے دیکھ لے وہ پھر کبھی ہشیار نہ ہو
دل کا دل ہی میں رہے سرِ حقیقت محقق رازِ توحید زباں سے کبھی اظہار نہ ہو
دل وہ کیا دل ہے نہ ہو دردِ محبت جس میں سر وہ کیا سر ہے جو وقفِ قدمِ یار نہ ہو

سجدۂ شوق کا اندازہ نہیں ہو سکتا
چشمِ نقشِ قدمِ یار جو بیدار نہ ہو

جناب عزیز احمد صاحب عزیزؔ کندرکھی، ضلع مراد آباد، شعراء قصبہ کندرکھی میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ لکھتے بھی خوب تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے۔

دل محبت میں حسینوں کی گرفتار نہ ہو سو بلائیں ہوں مگر ایک یہ آزار نہ ہو
رحم صیاد کو خود آگیا اک دن بلبل دھن میں آزادی کے پہلے سے گرفتار نہ ہو
سبق آموز ہے پروانے کی رسمِ الفت پھونک دے سوزِ محبت مگر اظہار نہ ہو

حسنِ یوسف کا خریدار زمانہ ہے عزیزؔ
یہ نمائش بھی کہیں مصر کا بازار نہ ہو

جناب منشی محمد فضل حسین صاحب عیشیؔ تلمیذ حضرت جوہر مرادآبادی۔

تو اگر ساتھ نہ دے کوئی مرا ساتھ نہ دے تو اگر یار نہ ہو کوئی مرا یار نہ ہو
عشق کے رمز سے ہوتی نہیں واللہ خبر آہ تا زیر و زبر معرفتِ یار نہ ہو
ہو ولا معرکۂ عشق میں وہ کیا منصور شکلِ منصور جسے حوصلۂ دار نہ ہو

سرخوشی ہے کہ تجھے نیند کا غلبہ عیشیؔ
ایسا مدہوش مئے فکر بھی اے یار نہ ہو

جناب سعید الزماں صاحب عمؔ پھرایونی اہل کار عدالت ججی مرادآباد، حضرت اثرؔ کے برادر زادے اور خم خانۂ سخن کے متوالے تھے۔

آپ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہے شبِ وصل نکل جائیں سب ارماں دل کے جانِ جاں آج کسی بات سے انکار نہ ہو
دل تو کہتا ہے رکھو کوچۂ الفت میں قدم عقل کہتی ہے کہ رسوا سرِ بازار نہ ہو
یاد رکھے اگر انسان وہاں کا اقرار پھر گنہ کرنے کی جرأت اسے اک بار نہ ہو

سخت بیکل ہے نہ کل پر رکھو آجاؤ تم آج
کیا عجب ہے کہ کل تک غمِ بیمار نہ ہو

جناب منشی محمد ہادی علی صاحب کوثر رامپوری۔

روبرو تو ہو تو کچھ بھی مجھے درکار نہ ہو — تیرا شیدا کبھی جنت کا طلبگار نہ ہو
جذبِ صادق ترے صدقے کہ وہ اب کہتا ہے — میں ملوں تجھ سے اگر کوئی خبردار نہ ہو
تیری تصویر میں ہو جائے اگر گویائی — پھر تری ذات سے کچھ مجھ کو سروکار نہ ہو

نالہ و آہ جگا کی کوئی حد ہے کوثر
کس طرح وہ تری فریاد سے بیزار نہ ہو

جناب ابوالقیصر صاحب گویا نقوی امروہوی مدیر رسالہ معراج الکلام امروہہ۔

وصلِ محبوب ہے در اصل زوالِ الفت — انتہا عشق کی یہ ہے کبھی دیدار نہ ہو
بلبلِ زار کے دل کی تو خلش مٹ جائے — ایک ہو باغ میں یا گل نہ ہو یا خار نہ ہو

جناب حاجی چودھری محمد محفوظ علی خاں محفوظ انسپکٹر پولیس سنبھل چودھری سرائے۔

بیخودِ بادۂ غفلت کبھی ہشیار نہ ہو — موت آجائے مگر خواب سے بیدار نہ ہو
کام کیا رحمتِ خالق سے تجھے اے زاہد — اس کا حق ہی نہیں کوئی جو خطاکار نہ ہو

عابد صاحب کی علالت ایک ہفتہ جاری رہی۔ بخار ایسا چڑھا کہ پھر اترا نہیں۔ ۱۲ و ۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء کو حالت بہت خراب ہو گئی تھی مگر نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی تسبیح و تہلیل جاری تھی۔ بیمار پرسی اور عیادت کے لئے جو لوگ آتے تھے ان کو بمشکل جواب دیتے تھے۔ ۱۳ اور ۱۴ نومبر ۱۹۴۳ء کی شب کو ۹ بجے جب کہ مکان کے متصل مسجد میں نمازِ عشاء ادا ہو رہی تھی آپ عالمِ بے خبری میں چونکے اشاروں میں ادائے نماز کر کے شریکِ جماعت ہو گئے۔ ادھر نمازیوں نے سلام پھیرا ادھر انھوں نے اجل کو لبیک کہا۔ میت کے ساتھ مراد آباد اور گرد و نواح کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ قبرستان شاہ علاء الدین میں مدفون ہوئے۔ مخبرِ عالم مراد آباد مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۳ء کے شمارے میں حسبِ ذیل تعزیتی اداریہ شائع ہوا۔

"اظہارِ غم کے لئے نہ الفاظ ملتے ہیں اور نہ خیالاتِ پریشان ظاہر کرنے کے لئے پیرایۂ بیان، اولاد کے غم کو ناسورِ قلب بتایا گیا ہے اور یہ صحیح ہے۔ مگر آہ والدین کا غم! اولاد کا نعم البدل مل سکتا ہے مگر والدین جب سر سے اٹھ جاتے ہیں تو پھر ان کے دیکھنے کے لئے ہمیشہ نگاہیں ترستی رہتی ہیں اور پھر باپ بھی وہ باپ جو شفقتِ پدری کا مجسمہ اور

محبت و ایثار کا پیکر، جو صرف اپنی اولاد کے لئے ہی نہیں بلکہ احباب و اعزا اور متوسلین اور متعلقین کے لئے بھی اعلیٰ ترین اخلاق کا نمونہ ہو، صفاتِ انسانی کا مجسمہ ہو۔ جس کی دیانت، جس کی شرافت، جس کی مروت، جس کی وضعداری، جس کی مہمان نوازی، جس کی اعزا پروری اور جس کی نکوکاری ضرب المثل ہو۔ جس نے اپنی محنت و قابلیت اور مسلسل سعی و عمل سے خاندانی وقار کو دوبارہ قائم کیا ہو اور جس کی محنت کے ثمرات سے آج تک مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس پدرِ مہربان و شفیق کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو انصاف کیجئے کہ دل پر کیا گذرے گی۔

ضبط کی تاب نہیں گو ترے ماتم میں ہیں
صبر اللہ عنایت کرے اس غم میں ہیں

اللہ اللہ آج وہ گھر جو آپ کی شاندار شخصیت سے معمور نظر آتا تھا خانۂ ویراں ہے۔ آج وہ دفترِ اخبار (مخبرِ عالم) جہاں آپ علمی نکات کے دریا بہایا کرتے تھے، سونا پڑا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام دنیا تاریک ہو گئی ہے اور وہ وجودِ گرامی جو ہر مشکل میں دل کا سہارا تھا کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اب کون مشکلات میں ہمت بندھائے گا۔ اب کون اپنے مدبرانہ مشوروں سے عقدہ کشائی کرے گا۔ اب کس پر ناز کیا جائے گا اور اب کون ناز اٹھائے گا۔

دردِ دل دردآشنا جانے
کوئی بے درد اس کو کیا جانے

گذشتہ اشاعت میں راقم الحروف نے قارئینِ مخبرِ عالم کو والدِ ماجد کی علالت کی اطلاع دے کر التماسِ دعا کی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ مرض الموت ہے اور اخبار کی آئندہ اشاعت میں مژدۂ صحت سنانے کے بجائے حادثۂ ارتحال کی خبرِ وحشت اثر سنائی جائے گی۔ گو آپ کی علالت صرف ایک ہفتہ جاری رہی لیکن یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ اب یہ شفیق و مہربان وجود ہم سے بچھڑ جائے گا۔ ۱۲ اور ۱۳ نومبر کو مرض نے شدت اختیار کر لی۔ ہفتہ کے روز ۱۳ نومبر کو حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور دوپہر سے آپ پر غشی اور بے خبری طاری ہو گئی۔ چند گھنٹے تک یہی کیفیت طاری رہی۔ تا اینکہ شب کے نو بجے، جب یہ بدنصیب ان کے پاس سے اٹھ کر نمازِ عشاء کے لئے مسجد میں گیا اور فریضۂ نماز ادا کر رہا تھا کہ یکایک آپ کی نازک حالت کی اطلاع آئی۔ زنان خانہ میں جا کر دیکھا کہ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا ہے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

مرحوم کے تقدس دیانت اور مذہبی شیفتگی کا کیا بیان کیا جائے۔ آپ کو بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام سے بہت عقیدت تھی اور سلسلۂ تصوف میں چشتی و صابری بزرگوں میں میاں صندل شاہ صاحب کے مرید تھے۔ ۱۹۳۰ء میں فریضۂ حج ادا کیا اور فریضۂ حج سے واپس ہو کر تمام وقت اذکار وعبادت میں گذرتا تھا۔ عین شدتِ مرض میں بھی اوقاتِ نماز پر متنبہ ہو کر لیٹے لیٹے اشاروں میں نماز ادا فرماتے تھے۔

خاندانی وجاہت اور شخصی عظمت کے لحاظ سے آپ اپنی مثال آپ تھے اور کیوں نہ ہو آخر آپ کس کے جانشین اور خلف الصدیق تھے۔ آپ کے والدِ ماجد مشیر الدولہ سفیر الملک قاضی محمد جمشید علی صاحب تجم رئیسِ مراد آباد تھے جو وکیل عدالت اور ایک مشہور خوش بیان شاعر تھے۔ آپ یک مورخ باکمال اور مصنفِ شیریں مقال تھے۔ آپ کے آباء و اجداد قصبہ حسن پور ضلع مراد آباد کے باضابطہ قاضی تھے اور اب تک ہیں۔ آپ سلسلۂ عالیہ رضویہ کے گوہر شاہوار تھے میرے والدِ ماجد کی تاریخ ولادت ۲۹ر صفر المظفر ۱۲۸۷ھ ہے۔ آپ صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ مدرسہ امدادیہ، و مدرسہ عربیہ قاسم العلوم اور مشن ہائی اسکول میں قابل و لائق اساتذہ کی زیر نگرانی آپ کی تعلیم ہوئی۔ آپ کے گھر میں شعر و سخن کا ابتداء ہی سے چرچہ تھا۔ چنانچہ آپ کے والدِ ماجد قاضی سید محمد جمشید علی صاحب تجم مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ آپ اپنی مدت العمر اخبار جامِ جمشید اور روہیل کھنڈ پنچ کو نکالتے رہے جو قدیم اردو صحافت کی دنیا میں بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ میرے والدِ ماجد مرحوم کو بھی شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی۔ چنانچہ اپنے تکمیل ذوقِ سخن کے لئے مرزا داغ کی شاگردی اختیار کی اور بہت جلد اپنی ذہانت اور قابلیت سے مرزا داغ کی نظروں میں اس قدر وقعت پیدا کر لی کہ انھوں نے آپ کو "فخرِ داغ" خطاب عنایت فرمایا۔ آپ نثر و نظم دونوں میں قادر الکلام تھے۔ آپ کی بہت سی غزلیں عوام میں مشہور تھیں۔ آپ کی نثر میں سادگی اور حسنِ بیان کے ساتھ بے حد شگفتگی اور دل آویزی پائی جاتی تھی۔ ۸ر جون ۱۹۰۳ء کو آپ نے مخبرِ عالم جاری کیا جو بفضلہٖ تعالیٰ اب تک جاری ہے۔ اس سے قبل اپنے والدِ بزرگوار کی زیر نگرانی ۱۸۸۲ء میں اخبار جامِ جمشید اور روہیل کھنڈ پنچ کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۸۸۸ء میں خود اپنا پہلا اخبار بلند اختر نامی جاری کیا۔ اردو صحافت کی دنیا میں آپ خاص اہمیت کے مالک تھے۔ اور اسی بنا پر ڈسٹرکٹ جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے آپ کو اپنا صدر منتخب کیا۔ ریاستِ رامپور سے آپ کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور نواب حامد علی خاں خصوصیت کے ساتھ آپ

کے مزاج اور قدر شناس تھے۔ عالم شباب میں آپ نے چند ناول بھی تصنیف کئے تھے۔ آپ کا دیوان تمام اصناف سخن پر مشتمل تھا جو ابھی تک طبع نہیں ہوا۔ آہ تنہا جامع صفات بزرگ ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ اور پھر یہ کہ میری والدہ ماجدہ بھی علیل ہیں اور اس صدمے نے ان کو اور مضمحل کر دیا ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت آج ۱۰ر نومبر کو میرا نواسہ جو ہنوز غنچہ ناشگفتہ تھا موت کی باد صرصر سے مرجھا گیا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

قارئین مخبر عالم سے مستدعی ہوں کہ وہ میرے والد کے لئے دعائے مغفرت اور والدۂ ماجدہ کے لئے دعائے صحت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کریں۔ مرحوم کا سایۂ شفقت ہی سر سے نہیں اٹھا بلکہ مخبر عالم کا نگراں بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چنانچہ زیر نظر اشاعت کے سرورق کی لوح سے جب آپ کا اسم گرامی جو بحیثیت نگراں کے درج ہوتا تھا محو کیا گیا تو دل پاش پاش ہو گیا۔ اب بجز ذات الٰہی مخبر عالم اور ایڈیٹر مخبر عالم کا کوئی نگراں نہیں۔ آپ کی کوئی اولاد میرے سوا نہیں۔ میری کوئی بہن ہے نہ بھائی۔ اب اس تنہا ذات کا فضل الٰہی پر بھروسہ ہے۔ ہائے افسوس وہ چمن جو اُن کا سینچا ہوا تھا آج اس بلبل خوش نوا سے خالی ہے۔ قارئین! مخبر عالم والد ماجد کی زندگی میں ان کی برکت اور فیض نگرانی سے برابر جاری رہا۔ لیکن ان کی رحلت اور موجودہ پُر آشوب حالات نے مجھے اس قدر دل شکستہ کر دیا ہے کہ آپ کی توجہ عالی کے بغیر مخبر عالم کی بقاء دشوار ہے۔ امید ہے کہ آپ ایک شکستہ دل انسان کا ہاتھ بٹائیں گے اور مرحوم کی علمی و قومی یادگار کو زندہ رکھنے کے لئے عملی اقدام فرمائیں گے۔ کیونکہ آپ کی توجہ فرمائی کے بغیر اخبار کا قیام بہت مشکل ہے۔

"عابد علی رضوی"

فاتحہ چہلم کے موقعہ پر ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو دفتر اخبار رہنما مراد آباد میں جناب مولوی سید حلیم الدین راحت مولائی ایڈوکیٹ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ جس کی کاروائی ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۳ء کے مخبر عالم مراد آباد میں چھپی۔

"آج ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء بروز پنج شنبہ بوقت پانچ بجے شام دفتر اخبار رہنما مراد آباد میں ایک تعزیتی جلسہ بسلسلۂ فاتحہ چہلم جناب حاجی الحرمین قاضی سید عبد العلی صاحب عابد رضوی مرحوم منعقد ہوا۔ کثرت آراء سے جلسہ کی صدارت جناب مولوی سید حلیم الدین صاحب

راحت مولائی ایڈوکیٹ مراد آباد نے فرمائی۔ اول تلاوتِ قرآن مجید ہوئی۔ بعدہٗ جناب صدر نے قاضی سید عبد العلی عابد مرحوم کی ادیبانہ زندگی پر اور ان کی وفات حسرت آیات سے جو کمی ادبی حلقہ میں واقع ہوگئی اس کے احساس پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے قاضی میر الدین امیر نے نظم بعنوان یادِ رفتگاں پڑھی۔ اس کے بعد جناب سحر مراد آبادی، نائب مدیر اخبار رہنما نے ان کی صحافتی اور جناب رئیس امروہوی مدیر اخبار جدت نے ان کی شاعرانہ اور جناب ابو لقیام قاضی شہاب الدین آخر استاد الشعراء سابق مدیر روزنامہ آواز" نے ان کی شہری اور سماجی زندگیوں پر سیر حاصل تبصرے کئے اور پھر دیگر شعراء کرام نے جلسہ کو جناب قاضی صاحب مرحوم و مغفور کی دیگر خوبیوں سے آشنا کیا اور نظمیں اور قطعاتِ تاریخ پڑھ کر سنائے۔ جلسہ کے خاتمہ پر بہ تحریک جناب ابو القیام قاضی شہاب الدین آخر ایک تجویز پیش ہوئی۔ جس کی جناب الطاف حسین صدیقی سحر اور جناب مرزا محمد اسحاق بیگ صاحب کرامت مدیر اخبار مسلم لیگ و اراکین بزم ہائے ادب مراد آباد نے تائید فرمائی۔ تجویز کو تمام جلسہ نے کھڑے ہو کر منظور کیا۔ اور یہ طے پایا کہ ایک نقل تجویز کی اخبارات اور قاضی صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے قاضی سید عابد علی صاحب جوہر رضوی کو بھیجی جائے۔ نیز یہ کہ تمام مضامین و قطعات اور نظمیں دفتر اخبار مخبر عالم مراد آباد کو بغرضِ اشاعت بھیج دیئے جائیں۔

ریزولیوشن:۔ مدیرانِ اخبار، شعراء و ادباء و وکلاء و مختاران و دیگر معززین شہر کا یہ جلسہ شہر مراد آباد کے مشہور اہلِ قلم و فخرِ داغ جناب حاجی الحرمین قاضی سید محمد عبد العلی صاحب عابد رضوی مرحوم و مغفور (انار اللہ مرقدہٗ) بانی اخبار مخبر عالم مراد آباد کی خاتمہ کے سلسلہ میں ان کی ابدی جدائی اور اہالیانِ مراد آباد کی ان کی رہنمائی و اصابتِ رائے سے محرومی پر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم و مغفور کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ و ارفع مقام اور پس ماندگان بالخصوص جناب قاضی عابد علی جوہر رضوی مراد آبادی کو جن کے کاندھوں پر قاضی صاحب مرحوم کی تمام ذمے داریوں اور ان کی یادگار مخبر عالم کی زندگی کا دارومدار ہے، صبر جمیل عطا فرمائے۔"

محرک: قاضی شہاب الدین آخر سابق ایڈیٹر اخبار روزنامہ آواز، مراد آباد۔

موئیدین: الطاف حسین صدیقی سحر، مولوی مرزا اسحاق بیگ کرامت، اراکین و صدر بزم ہائے ادب مراد آباد، اراکین بزم فروغ ادب مراد آباد، اراکین بزم تنویر ادب مراد آباد، اراکین بزم مصباح ادب مراد آباد

جناب سید عابد علی جوہر مرادآبادی نے اپنے والد ماجد کی وفات پر حسب ذیل مرثیہ کہا تھا جو ۱۶ نومبر ۱۹۳۳ء کے مخبر عالم میں شائع ہوا تھا۔

مشکل ہے صبر شعلۂ اشک و آہ میں
تاریک بزم دہر ہے اپنی نگاہ میں
وہ رہ نورد میں ہوں جہانِ سیاہ میں
رہبر نے جس کو چھوڑ دیا وسطِ راہ میں

کس سے شکایتِ ستمِ آسماں کروں
اس دل پہ جو گذرتی ہے کیونکر بیاں کروں

اب سر پہ سایۂ پدرِ مہرباں نہیں
اب کوئی درد کا بھی مرے رازداں نہیں
مشکل ہے عرضِ حال کہ تابِ بیاں نہیں
اب مجھ کو کوئی صورتِ تسکینِ جاں نہیں

دنیا ہے غرق خوں مری چشمِ پُر آب سے
رخصت ہوا یہ کون جہانِ خراب سے

یہ کثرتِ الم یہ ہجومِ غم و ملال
دل کا عجیب رنگ ہے گھر کا عجب ہے حال
سایہ پدر کا سایۂ افضالِ ذوالجلال
ہجرِ پدر میں دل ہے مصائب سے پائمال

دنیا میں غمگسار ہمارا نہیں رہا
اب کوئی زندگی کا سہارا نہیں رہا

وہ جس سے تھی بہارِ گلستاں کہاں ہے آج
جو تھا سکونِ قلب کا ساماں کہاں ہے آج
تھی جس کی ذات رحمتِ یزداں کہاں ہے آج
جو تھا معینِ حالِ پریشاں کہاں ہے آج

ہر لمحۂ حیات مرے دل پہ شاق ہے
اُف کتنا دردناک پدر کا فراق ہے

کیونکر پدر کی موت سے دل ہو نہ اب دونیم
سمجھے گا وہ یہ غم کہ زمانے میں ہو یتیم
جوہر پدر کے غم سے مرا حال ہے سقیم
گھر کی بہار خانۂ تربت میں ہے مقیم

تنہا ہوں آہ، انجمنِ کائنات میں
باقی نہیں ہے لطف کوئی اب حیات میں

شام و سحر ہے بارگہِ حق میں یہ دعا
مرحوم کو ہو سایۂ دامانِ حق عطا
توفیقِ صبر ہم کو عنایت ہو اے خدا
اولاد میری ہو نہ کسی غم میں مبتلا

یارب یہ تم نصیب بجاہ و حشم رہیں
نقشِ قدم پہ اپنے بزرگوں کے ہم رہیں

تواریخ انتقال پُرملال الحاج قاضی سید عبد العلی صاحب مرحوم

بانی مخبرِ عالم مُرادآباد

از نتیجۂ فکر: صابر شاہ صاحب اشرفی مُرادآباد

واصلِ حق ہو گئے عبد العلی — جس طرح دریا میں ملتا ہے حباب
وقتِ آخر دے کے ایماں کا ثبوت — ہو گئے وہ امتحاں میں کامیاب

مصرعۂ تاریخ صابرؔ یوں لکھو
پندرہ ذی قعدکی ہے عالی جناب

۱۳۶۲ھ

بدلتا ہے ہمیشہ رنگ اس دنیائے فانی کا — بھروسہ کیا ہے اس دورِ جہاں میں زندگانی کا
مزارِ قاضی عبد العلی پر لکھدے اے صابرؔ — درِ جنّت ہے مدفن مخبرِ عالم کے بانی کا

۱۹۴۳ء

از جہانِ بے ثبات رفت در دارِ جناں — آں ادیبِ خوش بیاں قاضی عبد العلی
بر مزارش سالِ رحلت صابرؔ چشتی نوشت — روح افزا آستانِ قاضی عبد العلی

مخبرِ عالم ۱۶ فروری ۱۹۴۴ء

قطعۂ تاریخ

از جناب فروغؔ صاحب مرادآبادی

مہِ نومبر چاردہ یکشنبہ بود
از جہاں کردہ نجات آں نیک بخت
چوں رود بر آسماں روحِ گہر
حور و غلماں آں بگیرد دست بدست
از سرِ حزن ایں بگو عاجز فروغؔ
محترم عبد العلی فردوس رفت

۱۳۶۲ھ — ۱۹۴۳ء

قطعہ تاریخ

از جناب قاضی غلام سجاد صاحب بسمل بدایونی

آں سیدِ محترم دریغا، — امر تودیع ایں جہاں یافت
یعنی عبد العلی ذیجاہ — از مارہ خویش برکراں یافت
مادر جدائیش کشیدیم — او عشرت و عیش جاوداں یافت
سالِ ترحیل او ازیں شعر — بسمل دیدم ہمی تواں یافت

از قرب آں گذشتہ جانش
۳۶۱

قاضی عبد العلی جناں یافت

۱۰۲۳ — ۱۳۶۳ھ

نظم

مرزا نظام الحسن صاحب عروج

سالِ نو ہے کہ ہے یہ سالِ بہار — سج رہے ہیں چمن چمن اشجار
اوجِ پر ہوگا مختبر عالم — اس کی ہوں گی ترقیاں پیہم
ناظریں شاد ہوں گے اور آباد! — دیکھنے والے رات دن دلشاد
دے گیا پچھلا سال ایسا داغ — جس سے گل ہو گیا ہے دل کا چراغ
محترم قاضی سیّد عبد العلی، — چل دیئے لے کے راہ جنّت کی
سچ تو یہ ہے کہ خوش نصیب تھے وہ — مغفرت دے خدا عجیب تھے وہ

مجھ کو اس غم سے ہے عروج ملال
دیکھئے کیسے گذرے اب کا سال

ذکر تعزیتِ انتقالِ پرملال

الحاج قاضی سیّد محمد عبد العلی صاحب عابدؔ نگراں اخبار مخبرِ عالم، مراد آباد

(از: جناب مرزا نصیر برلاس صاحب مراد آبادی)

صدمۂ رنج ناگہاں سنئیے — دل شکستہ کی داستاں سنئیے
گریہ آلود ہے قلم میرا — کش مکش میں پڑا ہے دم میرا
کیا کہوں وارداتِ قلب و جگر — شام سے تا سحر ہوں نوحہ گر
میں حوادث کا ہوں جہاں میں شکار — چین مجھ کو نہیں نہ دل کو قرار
میرے والد کے بچپنے کے رفیق — قاضی عبد العلی شریف و لئیق
سیّد اور حاجی، خُلق کی تصویر — آپ اپنی مثال آپ نظیر
والدِ جمشید علی تخلص جمؔ — مطمئن آپ سے رہے ہر دم
بعد اُن کے تھا ان کا یہ عالم — مالک اخبارِ مخبرِ عالم
دیکھئے بات تو مقدّر کی — عمر ستّر کی یا پچھتّر کی
شاعرِ علم و فضل اہلِ قلم — ہوا رخصت جہاں سے ہائے ستم
کیا تخلص تھا آپ کا عابدؔ — ایسا عابد جسے کہیں زاہد
نو بجے رات کو سنیچر کی — تیرہ تاریخ تھی نومبر کی
بیسویں صدی سال ینتالیس — ہوا مرحوم مومنِ خالص
ان کے لختِ جگر جو روتے تھے — اپنا منھ آنسوؤں سے دھوتے تھے
نام عابد علی ہے بیٹے کا — غم زدہ دل ہوا تھا بیٹے کا
گھر میں جا کر پچھاڑیں کھاتے تھے — روتا جب دوسروں کو پاتے تھے
قاضی عبد العلی کے سب احباب — نیچی نظریں کئے تھے چشم پُر آب
الغرض بعد دفن صبر کیا — دل شکستہ پہ اپنے جبر کیا
کر کے لوگوں نے مغفرت کی دعا — صبر عابد علی کرو یہ کہا
گھر کے لوگوں کو جا کے سمجھاؤ — سوگواروں کو کھانا کھلواؤ

ایسے کاموں میں تم رہے ہو میر
کیسی تاخیر کی یہ مرزا نصیر

غمزدہ دل کو تم بھی سمجھاؤ
اب خوشی کو کام میں لاؤ

مخبرِ عالم ۱۶ اپریل ۱۹۴۴ء

قطعہ تاریخ

از جناب مولوی مجتہدالدین عیش بدایونی

چو گشت واصلِ حق آں گرامی و نامی
بخلق از غمِ مرگش بپا قیامت شد

چو فکر کردپئے سال عیش ہاتفِ گفت
جناب قاضی عبدالعلی جنت شد

۱۹۴۴ء

مخبرِ عالم ۱۶ مئی ۱۹۴۴ء

یادگار وفات

بسلسلۂ گذشتہ

الحاج قاضی سید محمد عبدالعلی عابد فخرِ داغ چیف ایڈیٹر اخبار مخبرِ عالم، مراد آباد

از:۔ جناب قاضی رضی باقر صاحب رضی بدایونی

اب کہاں عبدالعلی جیسا کوئی شیرِ خدا
دینِ اطہر کا مجاہد خلق کا حاجت روا

درحقیقت آپ تھے مجموعۂ انسانیت
نقشِ الفت، پیکرِ اخلاق تصویرِ وفا

آپ ہی کے دم قدم سے تھی بہارِ زندگی
آپ کے غم میں صفِ ماتم بچھی ہے جا بجا

کون دلجوئی کرے گا بے کس و ناچار کی
کون اب پہروں سنے گا داستانِ پُرجفا

اب کہاں ہیں دہر میں ایسی مقدس ہستیاں
نیک سیرت، نیک طینت، بامروت، باوفا

کیا کیا اے گردشِ دوراں ذرا یہ بھی تو دیکھ
ان کے غم میں رو رہا ہے آج ہر چھوٹا بڑا

صبر کر ہاں اے دلِ بیتاب رونا ہے فضول
ہو چکا شیرازۂ حسرت پریشاں ہو چکا

اے خدا یہ تا قیامت قصرِ جنت میں رہیں
حشر میں ہو اُن کے سر پہ دامنِ آلِ عبا

اُن کو آزادی میسر ہو عذابِ قبر سے
صبر کی توفیق دے پسماندگاں کو اے خدا

ان کا گلزارِ تمنّا پھولتا پھلتا رہے
پیروی کرتے رہیں ان کی پرستارِ وفا

اے رحمٰنی اب کون ہوگا قافلہ سالارِ قوم
ہر قدم پہ کون دے گا اب ہمیں دادِ وفا

مجز عالم ۱۶ مئی ۱۹۴۴ء

تاریخ وفات جناب صابر اللہ صاحب صابر اشرفی مراد آبادی نے کہی۔

مجز عالم کے بانی اور ادیب بے مثال — سوئے جنت چل دیئے دنیا سے یکسر برتری
لوحِ مرقد پر بچشم نم یہ لکھدے اے فروغ — آستانِ قاضی عبد العلی صابری

۱۹ ۶ ۴۳

دارِ فانی سے سوئے دارِ بقار — چل دیئے عبد العلی مردِ نکو
فکر ہے تاریخ کی صابر اگر — پندرہ ذیقعدہ محزون کن کہو

۱۳ ۵ ۶۲

رفت زر ماہِ نومبر از جہاں — زبدۂ نادر قاضی عبد العلی
سال رحلت صابرِ چشتی بگو — مرد شاعر قاضی عبد العلی

۱۹ ۶ ۴۳

آہ از دنیائے دوں کردہ سفر — قاضی عبد العلی ذی احترام
گفت صابر مصرع سالِ وفات — ہست در فردوس آں عالی مقام

۱۳ ۵ ۶۲

آہ رحلت کر گئے عبد العلی — تھے جو سبطِ حضرت ختم الرسل
معنوی صوری یہ صابر لکھدے سن — سال رحلت تیرہ سو باسٹھ ہے کل

قاضی عبدالعلی عابد مراد آبادی کے کلام میں اثر ہے، روانی، شگفتگی، سادگی ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ پیاری پیاری غزلیات کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

غضب کی آج شوخی ہے تمہاری بانکی چتون میں
گرانے بجلیاں جاتے ہو شاید بزم دشمن میں

کھلا کیا ہے جو الٹی مجھ پر یہ چھریاں نکلتی ہیں
نگاہیں پھیر کر تم آج جو بیٹھے ہو چلمن میں

میں اس جینے سے درگذرا ہیں اس مرنے پہ مرتا ہوں
اتاریں دستِ نازک سے اگر وہ مجھ کو مدفن میں

وہ جس محفل میں آتے لوٹتے ہیں دیکھنے والے
بھری ہیں بجلیاں شاید کسی کی ترچھی چتون میں

پڑیں کافر ہیں زلفیں مصحفِ رخسار پر ایسی
چھپا قرآں نظر آتا ہے داماں برہمن میں

نہیں مٹتا نہیں مٹتا تصور ان کی پلکوں کا
وہ دل میں بھی نظر آتے ہیں تو آتے ہیں چلمن میں

ہے تارِ نظر کا اور پردے پر بھی پردہ ہے
کوئی پردہ نشیں اب شوق سے آجائے چلمن میں

انہیں ہاتھوں سے قرآں اب اٹھاتے ہو نہ لینا
جو برسوں تک حمائل رہ چکے ہیں میری گردن میں

بہت بہتر تھا پہلے غیر سے عابد جو میں مرتا
وہ رو کر جان کھوتے ہیں سنا ہے مرگِ دشمن میں

سنہ ۱۹۰۳ء

پھر وہی مسٹر کو بیماری ہوئی
ہند سے لندن کی تیاری ہوئی

بارشِ آئی رحمتِ باری ہوئی
حسن پر پھر باغ کی کیاری ہوئی

وعدۂ سروس سے مذہب لے لیا
دی نہ سروسٹس یہ تو عیاری ہوئی

کتنے ترقی پڑھ گئے اس دور میں
کیا مزے کی یہ عمل داری ہوئی

آپ کو اپنی طوائف پر ہے ناز
جنس وہ کیا جو کہ بازاری ہوئی

عشق میں کا کیا پوچھتے ہو ماحصل
ذلت و رسوائی و خواری ہوئی

چل بسے لاکھوں مڈیکل زہر کھا
اُن کی قاتل والے بیکاری ہوئی

سنہ ۱۹۰۳ء

۱؎ SERVICE پر اضافت کا استعمال کر کے عابد صاحب نے دوسری زبان کے تلفظ کے ساتھ اضافت لگانے کی روش کا شعرا متاخرین کے لئے ایک نئی جہت کا اختراع کیا ہے۔

عید کی بہار

عید کا دن ہے چمن میں نہیں اب بادِ خزاں
بن گئی آج کے دن فصلِ بہاری دہقاں

عقل چکر میں ہے اور چشمِ تماشا حیراں
دیکھ کر چار طرف عیش و طرب کا ساماں

سنتے ہیں دھوم ہے گلشن میں کہ عید آئی ہے
فصلِ گل کچھ نئے انداز سے ہے جلوہ کناں

ایک سے ایک گلے ملتا ہے خوش ہو ہو کر
کہ برس بعد یہ دن آیا ہے باعزّت و شاں

سنہ ۱۹۰۳ء

ساقی نامہ سالِ نو ۱۹۰۴ء

مرحبا ساقیٔ مے خانۂ ناز
قالبِ عشوہ و روحِ انداز

مرحبا ساقیٔ سر دفترِ حسن
رونقِ سلطنتِ کشورِ حسن

مرحبا ساقیٔ سرشارِ جمال
یوسفِ گرمیٔ بازارِ جمال

مرحبا ساقیٔ سرخیلِ نشاط
موجِ عیش و طرب و سیلِ نشاط

مرحبا ساقیٔ عشاق فریب
تجھ سے ہے انجمنِ وصل کو زیب

ساقیا فصلِ بہار آپہونچی
باغ میں فوجِ ہزار آپہونچی

چمنستانِ جہاں ہے سرسبز
باغ بے خوفِ خزاں ہے سرسبز

میکدہ انجمنِ ہستی ہے
ابر ہم دوشِ سیہ مستی ہے

باغ پر چھائی ہے گھنگھور گھٹا
ہے سیہ مست شرابور گھٹا

ابر گلشن میں خراماں ہے آج
مے کشی کا سر و ساماں ہے آج

یوں سیہ مست ہوا ہر بادل
رند اوڑھے ہوئے کالا کمبل

باغ میں ابرِ کرم گوہر بار
دشت میں بادِ صبا عنبر بار

آب میں جلوۂ عکسِ گلِ سرخ
یا ہے بیتاب لبالب گلِ سرخ

لالہ ہے شمع تو فانوس ہے باغ — سوزِ داغِ دلِ طاؤس ہے باغ
نشہ کی لہر سے مستی میں ہے آب — نہر میں آبِ رواں موجِ شراب
ہے خیابانِ چمن مے خانہ — چشمِ نرگس ہے ہر اک پیمانہ
میں ازل سے ہوں جو مدہوشِ غزل
دلِ بےتاب میں ہے جوشِ غزل

نہیں پہلو میں دلِ زار ہے یہ — شعلہ یا برق شرر بار ہے یہ
اے مسیحا نہ مجھے دق ہے نہ سل — مرضِ عشق کا آزار ہے یہ
حسن خود دیکھ کے کہتا ہے مجھے — خوبرویوں میں طرح دار ہے یہ
ہے گذرگاہِ حسینانِ جہاں — دل نہیں مصر کا بازار ہے یہ
ساقیا مے کدہ آباد رہے — تو غم و رنج سے آزاد رہے
میں درِ دخترِ رز کا ہوں فقیر — دردِ مے سے مری مٹی ہے خمیر
ہے سوال اب یہی تجھ سے میرا
دے کوئی جام بھلا ہو تیرا

نام سنتے ہیں تیرا مدت سے — کچھ تو مل جائے درِ دولت سے
تیری بخشش کی ہے آفاق میں دھوم — جام سے مجھ کو نہ رکھنا محروم
کچھ تو صدقے میں تیرے پائیں ہم — نہ ترستے کہیں رہ جائیں ہم
نہیں بے جا یہ مرا شیون و شین
کہ ہے جوششِ غزل ذو بحرین

سنہ ۱۹۰۴ء

غزل ذوبحرین

تیغِ قاتل سے محبت ہے مجھے
اپنی گردن سے عداوت ہے مجھے

ہجر میں جینے سے نفرت ہے مجھے
سخت جانی سے ندامت ہے مجھے

ہے نہاں نظروں سے وہ آئینہ رو
صورتِ آئینہ حیرت ہے مجھے

ہر سحر تجھ سے جو ہوتا ہے دوچار
آئینہ سے بھی کدورت ہے مجھے

جم کے بیٹھا ہوں میں کوچے میں ترے
کس قدر زورِ نقاہت ہے مجھے

بوالہوس تجھ کو مبارک ہو یہ ربط
دیکھ لینا بھی غنیمت ہے مجھے

بادۂ ہوش ربا دے ساقی
مجھے مدہوش بنا دے ساقی

اٹھ کہ مجبر کا نیا سال ہے آج
ایک مہینے سے برا حال ہے آج

ایک برس بعد یہ دن آیا ہے
آج قسمت نے یہ دکھلایا ہے

جوشِ مے شیشۂ بلور میں ہے
شوقِ مستی دلِ رنجور میں ہے

چاک دامن ہے مرا گل کی طرح
لب پہ فریاد ہے بلبل کی طرح

کچھ تو لازم ہے علاجِ دلِ زار
ساغرِ مے سے مجھے کر سرشار

جلد ساقی مئے ساغر بھر دے
جام میں بادۂ احمر بھر دے

عیش اک دم بھی غنیمت ہے بہت
عشرتِ کم بھی غنیمت ہے بہت

دسترس جرعۂ مے پر ہو اگر
ہے وہ پیمانۂ جم سے بہتر

گوشِ زد ہو جو ترشیۂ عشرت
ہے وہی نغمۂ داؤد صفت

کارِ عالم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ
شادی و غم بھی کچھ ہے کبھی کچھ

رنگِ دنیا ہے غرض گوناگوں
کارخانے ہیں یہاں بوقلموں

فرصتِ وقت کو کافی سمجھو
عمرِ رفتہ کی تلافی سمجھو

گرچہ دنیا کے تماشے ہیں عجیب
ہاں مگر ہوتے ہیں مشکل سے نصیب

ہے وہی سب میں بڑا خوش قسمت
ہاتھ آجائے جسے یہ دولت

میرا مجبر رہے عالم میں سدا
اور ترقی کرے ہر سال خدا

اس کے ناظر رہیں باخیر تمام
مقصدِ دل ہو بخوبی انجام

سنہ ۱۹۰۴ء

ساقی نامہ

بہارِ سالِ نو آئی ہے اب مرغِ قلم چہکا — کھلے گلہائے مضموں ساقیا باغِ سخن مہکا
کدھر ہے تو اے ساقیِ بے ریا — مجھے جامِ مے بھر کے جلدی پلا
پری لال شیشے سے اپنے نکال — کہ ہو یک بیک دور دل سے ملال
ہے دریا دلی تیری مشہور تر — نہ اب مے کے دینے میں تو دیر کر
سدا تیرا مے خانہ آباد ہو — دلِ غم زدہ دفعتاً شاد ہو
بنا مجھ کو متوالا بہرِ خدا — کریں رشک جتنے کہ ہیں اتقیا
شراب کہن لا نیا سال ہے — نئی فکر منظورِ فی الحال ہے
چمن سے گئی اب خزاں ہے بہار — ہر اک شاخ پر ہے ہجومِ ہزار
چمن پر شگفتہ گلوں کا ہے رنگ — نظر آتا اک سالِ نو کا ہے ڈھنگ
چلا آتا ہے ابر مستانہ وار — بڑے جوش پر ہے یہ فصلِ بہار
عنادل کے ہیں چہچہے شاخ پر — ہر اک سمت پھولے پھلے ہیں شجر
زمانے کے مے خانے آباد ہیں — جو ہیں رندِ مشرب بہت شاد ہیں

اسی جوش میں تھا کہ آئی جو یاد
غزل میں نے اپنی پڑھی شاد شاد

پہونچ ساقیا اب بہار آ گئی — زمانِ طرب سے گھٹا چھا گئی
رہوں صورتِ گل نہ کیوں خندہ زن — مجھے دخترِ رز کی یاد آ گئی
محبت کروں اور گل رو سے کیا — تری بھولی صورت مجھے بھا گئی
جگہ دی ہے دل میں بتِ شوخ کو — پری میرے شیشے میں خوب آ گئی

پہن کے چلا چھا گلیں جب وہ گل — قیامت زمانے میں اک آگئی
بہار آئی جوشِ جنوں پھر ہوا — طبیعت وطن میں ہی گھبرا گئی
فقط عشقِ مجنوں کی تاثیر تھی — کہ لیلےٰ سوئے دشت تنہا گئی
کہ اب مے کشی تا ہو دل شادماں — جو مطلب نہاں ہے وہ سب ہو عیاں
کہ مخبر کا چوتھا شروع سال ہے — مرا اس خوشی میں عجب حال ہے
تو بوتل کو رکھ دے مرے سامنے — غٹا غٹ اڑاؤں ترے سامنے
میں پی کر کروں یہ خدا سے دعا — رہے کارخانہ یہ قائم سدا
جو ہیں قدرداں اس کے ہوں شادماں — بر آئے سبھوں کے دلوں کی مراد
رہیں صاحبِ علم اس پر نثار — یہ اخبار ہے صنعتِ کردگار
خریدار جو ہیں لیاقت شعار — سخن سنج و معنی رس وذی وقار
الٰہی سدا ان کو تو شاد رکھ — جہاں میں سرافراز و آباد رکھ

ترقی پہ مخبر ہو یارب سدا
ذلیل اس کے دشمن رہیں برملا

سنہ ۱۹۰۶ء

غزل

آج جو موجود ہے کل خواب ہے افسانہ ہے — راست اس کو جو نہ ملنے وہ بڑا دیوانہ ہے
دوست جو ہے آج اپنا کل وہی بیگانہ ہے — صورتِ تریاق میں یہ زہر کا پیمانہ ہے
جانِ شیریں جب نکل جاوے گی قالب توڑ کر — تب لحد یا آگ میں تیرے لئے کاشانہ ہے
ہائے نادانی کہ تو اصلی وطن کو بھول کر — بھول بیٹھا اس مکاں میں جو مسافرخانہ ہے
زندگی میں بھی نہیں کوئی کسی کا آشنا — چار پیسے پاس ہیں جب تک ہی سب یارانہ ہے
اور جب تک تجھ سے مطلب ہے بہم ہے دوستی — جب نکلے کام تو پھر وہ سب ہی بیگانہ ہے
بے وفائی، جعل سازی، غیبت و ناراستی — جس کسی میں ہوں یہ باتیں بس وہی فرزانہ ہے
غافلا گر ہوش ہے تو بستر اپنا باندھ رکھ — کیا خبر ہے کب تلک یاں تیرا آب و دانہ ہے

سنہ ۱۹۱۰ء

مقبرۂ اکبر

قبرِ اکبر پہ کل گذر جو ہوا — بولی عبرت کہ آیئے حضرت
کیا کہوں میرے دل پہ کیا گذری — دیکھی جب بادشاہ کی تربت
ہُو کا عالم، عجیب سناٹا — مقبرہ تھا نمونۂ وحشت
در و دیوار سے نمایاں تھی — قادرِ بے نیاز کی قدرت
دل میں کہنے لگا خدا کی شان — کیا ہوئی آج ہیبت و شوکت
یہ وہی بادشاہ اکبر ہے — جس کی شاہی تھی خلق کو رحمت
جس نے تالیف کی ہر اک دل کی — کھوئی غیروں کے دل سے غیریت
عہد میں جس کے تھی ہنود کی بھی — اہلِ اسلام کی طرح وقعت
جس کو کہتے تھے اکبرِ اعظم — تھی عیاں جس کے نام سے ہیبت
ہے وہی زیرِ خاک دفن افسوس — جس سے تھی تاج و تخت کی زینت
موت کی نیند آج سوتا ہے — وہ شہنشاہ صاحبِ ثروت
ملک کے انتظام میں جس کو — نیند آتی نہ تھی کسی ساعت
ہائے یہ سین تھا قیامت کا — میرے دل کی ہوئی عجب حالت
تھام کر دل کو خوب رویا میں — صبح سے شام تک رہی رقّت

سچ ہے دنیا سرائے فانی ہے
سچ ہے دنیا ہے عالمِ عبرت

سنہ ۱۹۰۶ء

موسمِ گرما کی ہوا

(حصّہٴ اوّل)

مرحبا اے ہوائے تازہ و خوب — فرح بخشِ قلوب، خوش مرغوب
ہم سے کب تیرا شکریہ ہو ادا — تیرا دم بھر رہے ہیں صبح و مسا
ان کی رونق ترے قدم سے ہے — روح افزائی تیرے دم سے ہے
تو نہ ہو تو سماں ہے پژمردہ — شوقِ نظّارگی ہے افسردہ
تو ہی اندازِ دل کشائی ہے — تو ہی سامانِ دلربائی ہے
سب یہ ذی روح انس وحش و طیر — چین دم بھر نہ پائیں تیرے بغیر

تیرا خلقت پہ عام احساں ہے
لطف شاہ و گدا پہ یکساں ہے

ہاں وہ ابرِ کرم ہے تیری ذات — تو نہ ہو تو کہاں سے ہو برسات
جھوم کر آئیں پھر کہاں بادل — کس طرح ہو زمین پر جل تھل
تیرا ہے جلوہ بجلیوں کی چمک — تیرا ہے زور بادلوں کی کڑک

ابرِ رحمت کی تو ہی بانی ہے
تیرے ہی دم سے زندگانی ہے

شاد طبعِ ملول کرتی ہے — تو ہی غنچہ کو پھول کرتی ہے
نخل تیری عنایتوں سے نہال — سبزہ رفتارِ ناز کا پامال
سحر کرتی ہے نرم رفتاری — چال کرتی ہے تیری گل کاری
شانہ کش تو ہے زلفِ سنبل میں — جامہ آرا ہے تو ہر اک گل میں
صحنِ گلشن میں تو ہے عنبر ریز — چینِ داماں ہے تیرا نکہت ریز
تیرے ہی نام ہیں نسیم و صبا — تیرے ہی نام ہے دمِ عیسیٰ
دلربائے زمانہ حسنِ بہار — تیری نیرنگیوں کا آئینہ دار

ہیں عروج و زوال تجھ سے عیاں

تو ہے بادِ بہار و بادِ خزاں

اُف تیری شوخی اُف تیری چھل بل — ادھر آئی گئی وہ سن سے نکل
تو دبے پاؤں جب کہ چلتی ہے — دلِ عشاق کو مسلتی ہے
تو نقاب اُلٹے روئے جاناں سے — چھیڑ کرتی ہے زلفِ خوباں سے
کشتیِ جہاز راں تیرے سے — ہیں ہوا دار بادباں تیرے
تو تجارت کے حق میں راس آئی — تو نے اشیاء کی قدر فرمائی

ہے قیامت، مخالفت تیری
روح پرور موافقت تیری

موسمِ گرما کی ہوا

حصّہ دوئم

تو حسینوں سے بڑھ کے زیبا رخ — دیکھتا ہے زمانہ تیرا رخ
باعثِ صد فروغ شمع ہے تو — نور سینوں میں ہے تیرے حسن کی ضو

گویا انداز ہے قیامت کا
یک غازہ ہے روئے صحت کا

حیف ہم تیرے قدرداں نہیں — یہی باعث ہے تن میں جاں نہیں
ہے طبیعت تیری نفیس و لطیف — اور صفائی ہماری محض کثیف
جب تجھے پاک و صاف رکھتے تھے — کب وباؤں کا باک رکھتے تھے
دشمنِ زیست تہ کرتے ہیں — تیرے دامن میں زہر بھرتے ہیں
زندگی ہے ہماری تیرے ہاتھ — حیف پھر ہو برائی تیرے ساتھ

کردیا جب سے تجھ کو برگشتہ
پھر رہے ہیں جہاں میں سرگشتہ

سنہ ۱۹۰۶ء

انسانی حیات کی مختصر حالت

کسی نے بچّے سے پوچھا کہ نورِ چشمِ پدر
نویدِ یمن و سعادت تسلّیِ مادر

یہ رونا کیوں ہے ترا اور بلبلانا کیوں
رگڑتا ایڑیاں کیوں ہے پڑا ہوا یکسر

یہ بے کلی ہے تجھے کس لئے، یہ بے چینی
نہ ہاتھ پاؤں پہ قابو نہ بس میں تیرا سر

ہر ایک چیز کو تکتا ہے تو بھیانک سا
غریقِ لجۂ حیرت بنی ہے تیری نظر

زبانِ حال سے بچّے نے یہ کہا بیدل
بتاؤں کیا میں تمھیں حالتِ دلِ مضطر

ندیم مرکزِ وحدت تھا ایک مدّت سے
صفاتِ خالقِ کونین کا بنا مظہر

بنا کے مٹّی کا پنجرہ کیا ہے اس میں قید
اور اس پہ باندھ دی باریک سی تنی کس کر

پھر اس کو بند کیا ایسا ایک قلعہ میں
کہ جز اندھیرے کے دیوار تھی وہاں پہ نہ در

نہ بھوک پیاس کی خواہش نہ فکرِ بول و براز
ابھی تلک تھے بظاہر تجرّدی جوہر

یکایک آنے لگیں کچھ صدائیں باہر سے
قفس میں رہنے ہیں خود بخود دیئے منظر

کچھ عرصہ گذرا تھا یونہی فضائے ظلمت میں
کہ دفعتًا کھلا پائیں قلعہ میں اک در

جو باہر آیا تو دیکھا کچھ اور ہی عالم
کہ جس کی وضع نے مجھ کو بنا دیا ششدر

نیا جہان، نیا رنگ، اور نئی باتیں
انوکھے لوگ، انوکھا چلن، انوکھا گھر

کسی نے پاؤں پہ بٹھلا کے مجھ کو بہلایا
کسی نے آ کے پہنایا لباس اور زیور

کسی نے لا کے پلائی سیاہ سی گھٹی
کہ جس سے پیٹ میں گڑبڑ ہوئی مرے یکسر

کسی نے آن کے چٹ چٹ مری بلائیں لیں
کسی نے سینے سے لپٹایا گود میں لے کر

کسی نے کان میں دے کر اذان اور تکبیر
کہا نماز پڑھیں گے جنازے میں آ کر

مگر مجھے کوئی اپنا نظر نہیں آتا
کہ جس سے چین ہو دل کو مرے ذرا دم بھر

نہ مونسے، نہ رفیقے، نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم، عجب غمے دارم

سنہ ۱۹۰۶ء

گورِ غریباں

اشک آنکھوں میں بھر آے وہ ہوا دل کو ملال
جانبِ گورِ غریباں کل جو کی ہم نے نظر

چند قبریں تھیں کہ تھے یارانِ رفتہ کے مکاں
کچھ عجب سنسان حالت میں قریبِ رہ گذر

راز کہتے تھے مکینوں کا زبانِ حال سے
ٹوٹے پھوٹے گھر مکلف گھر بہت ویران گھر

ایسے گھر جن پر اداسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ایسے گھر بے چین کر دینے کا تھا جن میں اثر

ایسے گھر اپنی مصیبت آپ کرتے تھے بیاں
ایسے گھر خود رو رہے تھے جن کے صحن و بام و در

ایسے گھر جن میں کوئی سامانِ آرائش نہ تھا
روشنی شمع تھی در پر نہ، نہ زر فرشِ زر

ایسے گھر تھے خدمتی جن میں نہ درباں تھا کوئی
آنے والے جانے والے بھی نہ آتے تھے نظر

ایسے گھر جن کے مکیں حد سے سوا خاموش تھے
تحت لفظی تھی نہ جھگڑے تھے نہ ہنگامے نہ شر

چونکنا کیسا نہ کروٹ بھی بدلتا تھا کوئی
موت کی مستی نے ایسا کر دیا تھا بے خبر

خاک میں سب مل چکے تھے ان کے جسمِ نازنیں
خاک کا تودہ بنے تھے قد و دست و پا و سر

اب نہ آنکھیں نور افشاں تھیں نہ ابرو تھے ہلال
اب نہ رشکِ بدر پیشانی نہ عارض تھے قمر

اب نہ ہونٹوں پر تبسم تھا نہ گالوں پر چمک
راستی قد میں نہ باقی تھی نہ گیسو تا کمر

کچھ نہ کھلتا تھا کہ یہ بد شکل تھے یا تھے حسیں
کچھ نہ آتا تھا سمجھ میں تھے گدا یا تاجور

بھیک جا جا کے دروں پہ مانگتے تھے رات کو
تختِ سلطانی پہ یا ہوتے تھے دن کو جلوہ گر

جھونپڑی میں شب کو ٹوٹے بوریئے پر سوتے تھے
یا فلک منزل مکانوں کے مکیں تھے بیشتر

خانۂ تاریک میں لیتے تھے شب بھر کروٹیں
یا سرِ بالیں جلا کرتی تھیں شمعیں تا سحر

ہستی ناپائیدارِ دہر تھی نقشِ خیال
زندگی اک خواب تھی یا خواب سے بھی مختصر

خاک کے پتلے تھے آخر مل گئے تھے خاک میں
اب سوائے خاک کوئی شے نہ آتی تھی نظر

دیکھ کر یہ ہُو کا عالم پھیر لیتا ہے نگاہ
آ نکلتا ہے جو بھولے سے کبھی کوئی ادھر

فاتحہ پڑھنا بھی تھا ان دوستوں کو ناگوار
زندگی میں رات دن رہتے تھے جو شیر و شکر

دیکھ کر شہرِ خموشاں کا یہ عبرت زا سماں
جو ہمارے دل پہ گذری کیا کہیں تجھ سے جگر

اشک تھے آنکھوں میں، لب پہ آہ، دل میں اضطراب
یہ کسی کا شعر ہم پڑھتے رہے با چشمِ تر۔

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، باتیں اداس
جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر!

سنہ۱۹۰۶ء

کوچۂ یار میں جاکر یہ پکارا کہ میں آج
ایک دل بیچتا ہوں، ہے کوئی لینے والا

دل فروشی کی صدا سن کے یکایک گھر سے
مستِ ناز آگیا دروازے پہ وہ متوالا

پھر مجھے دیکھ کے خوش ہو کے وہ یہ کہنے لگا
ہاں ابھی کون پکارے تھا ابھی دل والا

عرض کی میں نے کہ موجود ہوں حاضر ہے یہ دل
دل سے میں دیتا ہوں موجود ہے دینے والا

پھر جو کچھ آگئی دل میں تو اٹھا کر دل کو
لے لیا ہاتھ میں اور خوب سا دیکھا بھالا

وائے تقدیر کہ کچھ سوچ کے بولا ظالم
جنس ناقص ہے تری میں نہیں لینے والا

سنہ۱۹۰۶ء

ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز

میں نے کل عین قدح نوشی میں ساقی سے کہا
کیوں ہوا جاتا ہے افسردہ یہ باغِ خوبی

کیا شگفتہ نہیں رکھ سکتا تجھے صحنِ چمن
کیا شبِ مہ میں نہیں کھلتی ترے دل کی کلی

دلکشا دیکھ تو منظر ہے یہ کیسا لبِ جو
جانِ فزا دیکھ تو ہے چاندنی یہ کیسی کھلی

مہوشوں کا یہ ذرا دیکھ تو ناز و انداز
مہ جبینوں کی ذرا دیکھ تو یہ عشوہ گری

ان کی یہ ترچھی نگاہیں یہ تبسم، یہ حیا
ان کا یہ بن کے بگڑنا، یہ لگاوٹ شوخی

فتنۂ حشر لگا ہے اسی رفتار کے ساتھ
ایک بھونچال بپا ہو گیا، جو چال چلی

گر نہ اس پہ بھی تو ہو شاد تو ہے ہائے غضب
گر نہ ہو اس پہ شگفتہ تو ہے حیرت کیسی

دلِ پُر درد سے اک آہ کی اور کہنے لگے
کیا کہوں ہائے جو اس وقت ہے حالت دل کی

دلِ بیتاب میں باقی نہیں اب صبر و سکوں
منھ پہ آتا ہے کلیجہ ہے یہ کچھ جان پہ بنی

کھول کے دیکھ ذرا چشمِ بصیرت غافل
پھر کہیں کا نہ رکھے گی تجھے غفلت تیری

میں نے مانا کہ تجھے آج ہے سب کچھ حاصل
میں نے مانا ہے حکومت ترے گھر کی لونڈی

مئے عشرت ہے ترے جام میں، مانا میں نے
میں نے مانا کہ میسر ہے تجھے عیش و خوشی

روبرو تیرے حسینوں کا ہے جھرمٹ مانا
تیرے پہلو میں ہے مانا کہ ہر اک حور و پری

یہ تو سب کچھ ہے سہی لیکن تجھے معلوم بھی ہے
مئے عشرت کا یہ ساغر ہے چھلکنے کو ابھی

صورتِ سایہ حکومت بھی یہ ڈھل جائے گی
موت ہے گھات لگائے وہ الگ سر پہ کھڑی

نقش بر آب ہے سب اس پہ تو مغرور نہ ہو
دیکھ تو کیا ہے حباب لبِ جو کی ہستی

کچھ رہے گا نہ یہاں موجِ فنا سے باقی
کام آئے گی مگر، ایک عمل کی کشتی

از تو خیزد ہمہ شر ورز تو بر آید ہمہ خیر
بد و نیک ہست مکافات نہ نیکی و بدی

سنہ ۱۹۰۶ء

غزل

سوگ میں دشمن کے ان کا ایسا جوبن ہو گیا
بن گیا انداز نالۂ ناز شیون ہو گیا

میرے دل پر وہ شرر انگیز نظریں کیا پڑیں
بجلیوں کا ڈھیر انگاروں کا خرمن ہو گیا

اور پیتے تو ستم کی ہوتی عارض پر بہار
دو ہی قطروں میں غضب کا رنگ روغن ہو گیا

چاند سا چہرہ چھپایا، کیا قیامت آ گئی
آفتابِ صبحِ محشر زیرِ دامن ہو گیا

خرمنِ دل پر مرے بجلی گری اچھا ہوا
دو گھڑی کو یہ سیہ خانہ بھی روشن ہو گیا

اعتبار اب کس کا کیجئے دوست کس کو جانئے
دل مرے پہلو میں رہ کر میرا دشمن ہو گیا

دیکھ لے اپنے گریباں میں ذرا منھ ڈال کر
غیر کے ہاتھوں سے تیرا چاک دامن ہو گیا

جب کہا میں نے مرا دل اب مصیبت ہے مجھے
ہنس کے بولے مجھ پہ آفت میرا جوبن ہو گیا

منھ نکل آیا ذرا سا شیخ کا واعظ کا بھی
جو بتوں کے عشق میں عابدؔ برہمن ہو گیا

سنہ ۱۹۰۶ء

قصیدہ در تہنیت جشن تیئیسویں ۲۳ سالگرہ ۱۹۰۸ء

میجر سر نواب محمد حامد علی خان صاحب

فرمانروائے ریاستِ رامپور

صحنِ گلشن میں یہ اٹھلاتی چلی بادِ صبا
کہ عروسانِ چمن نے دیا گھونگھٹ کو اٹھا

تھی وہ اترائی ہوئی اور امنگوں میں بھری
چھیڑنے کو گلِ تر نے دیا اس کو جھونکا

ٹھنڈے جھونکے جو چلے بادِ سحر کے پیہم
کھل گئی آنکھ مری خواب سے بیدار ہوا

اک سہانا تھا سماں نور کا تڑکا تھا عیاں
آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اسی وقت اٹھا

دیکھا چھائی ہے گھٹا پڑتی ہیں ننھی بوندیں
ہے کہیں ابر اٹھا اور کہیں بادل گرجا

سننے دیتی نہیں یہ کان پڑی کچھ آواز
کہیں چھم چھم کی صدا ہے کہیں جھم جھم کی صدا

جتنے غنچے ہیں وہ کھلنے کی خوشی میں پھوٹے
لہلہاتا ہے ہر اک سمت زمیں پر سبزا

خندہ زن گلشنِ گیتی پہ ہیں گلہائے چمن
طائرانِ چمنِ دہر ہیں سب نغمہ سرا

گل کو جنبش ہے بڑھے پودے ہیں شاخیں جھومیں
چال مستانہ چلا آتا ہے کیا نشو نما

بارشِ رحمتِ حق کا ہے نزول موفور
آیا سیلابِ کرم، فیض کا دریا امنڈا

ابرِ باراں سے ہے کیا بارشِ آبِ حیواں
ہوتا ہر ایک کا ہے اب دلِ مردہ زندا

کوئی گجرے ہے دلا پے کوئی ساون گائے
ہر جگہ پر ہے پڑا ایک خوشی کا جھولا

چل رہا دور ہے رہ رہ کے مزے لے لے کر
کچھ عجب طرح کا اس وقت ہے رندوں میں مزا

پردہ حیرت کا اٹھا ظلمتِ مہجوری سے
مجھ کو اک چاند کے ٹکڑے نے دکھایا مکھڑا

بھولی صورت ہے پری جسم، نرالی سج دھج
بانکی چتون ہے طرحدار امنگوں کا بھرا

چہرۂ صاف پہ بکھری ہوئی کالی زلفیں
چشمِ جادو سے نگہبازی وہ کرتا آیا

بانکپن شوخ طبیعت ہے وہ اٹھا جوبن
چلبلاپن ہے گل اندام ہے وہ تنگ قبا

خون کرتا ہے جگر دستِ حنائی سے وہ شوخ
ہے ستمگار فسوں ساز وہ آفت کا بڑا

حسن آفت ہے بلا گیسوئے شب گوں اسکے
آیا انداز سے وہ پاس مرے اٹھلاتا

ہنس کے کہنے لگا وہ مجھ سے کہ حیراں کیوں ہے
آج ہے سالگرہ جشنِ حضورِ والا

یعنی نواب جہاں حامد علی خاں صاحب
اپنے دربارِ دُربار میں ہیں جلوہ نما

خیر و برکت سے ہیں دن چاروں طرف ہیں نواؔ
اس خوشی میں ہے ہر اک سمت درِ فیض کھلا

کھل گیا غنچۂ دل میرا، مثالِ گلِ تر
مطلعِ مدحت میں لکھا اس کے یہ میں نے مژدہ

مطلعِ دوم

دھوم ہے آج ترے فیض و کرم کی جو شہا
در پہ دوڑی چلی آتی ہے ترے خلقِ خدا

لوگ سب حاتم و رستم کے فسانے بھولے
تیری ہمت کا شجاعت کا بجا جب ڈنکا

نام نوشیرواں کا بھول گئے اہلِ جہاں
تیرے انصاف و حکومت کا ہوا جب چرچا

خلق کہتی ہے تجھے بحرِ عطا شاہِ کرم
اب فقط تیرا ہی عالم میں ہے رائج سکّہ

تیرے ہی فیض و سخا سے ہے تونگر دنیا
تیرے ہی حسن سے عالم ہے منوّر سارا

کون وہ دل ہے جہاں تیرا نہیں نقشِ قدم
کون وہ جاں ہے جس میں نہیں تیرا پھیرا

تیرا دروازہ ہے اک بحرِ عطا کا ساحل
موجیں لیتا ہے جہاں فیض و کرم کا دریا

رعب سے جا نہیں سکتا جو کوئی جن و بشر
حور و غلماں کا ہے شاید ترے در پہ پھیرا

سرنگوں کیسے ادب سے ہیں کھڑے اہلِ ہنر
فرد ہیں آج جو دنیا میں جہاں میں یکتا

مجلسِ علم ہے مشہور جہاں میں تیری
کوئی عالم، کوئی فاضل ہے کوئی اہلِ صفا

ناظم و ناثر و منشی و طبیب و حافظ
غوث و ابدال و قطب شیخ ہیں حاضر اس جا

کوئی صوفی ہے تو ہے رنگ میں وہ مستِ الست
کوئی شاعر ہے تو ہے شعر کا وہ متوالا

کوئی عابد، کوئی زاہد، کوئی ذاکر شاغل
ہیں مراتب کے سبھی کوئی چھپا کوئی کھلا

ہیں حسیں سارے حسینانِ جہاں سے اچھے
علمِ موسیقی کے استاد یہاں ہیں یکتا

جو ہنر فرد ہیں جو علم میں ہر فن میں حضور
آستانے پہ ہے اس واسطے مجمع سب کا

ایسے فیاض کی عادل کی جو ہو سالگرہ
کیوں نہ گھر گھر ہو خوشی اہلِ رعایا کے بھلا

آ کے دیتے ہیں جہاں والے مبارکبادی
آج دربار میں سرکار جو ہیں جلوہ نما

گرد پھرتا ہے کوئی اور کوئی ہوتا ہے نثار
صدقہ سو جان سے کوئی ہے کوئی دل سے فدا!

وقتِ مقبولیتِ خاص ہے اس دم عابدؔ
ہاتھ اٹھا حضرتِ باری میں تو اب بہرِ دعا

ہر برس سالگرہ یوں ہی مبارک ہو مدام — ہر برس یوں ہی الٰہی رہے یہ جشن صدا

میرے آقا کو سدا رکھیو الٰہی قائم — دہر میں شمس و قمر تا کہ رہیں جلوہ نما

دوست اس کے رہیں دنیا میں ہمیشہ شاداں

دشمن اس کے رہیں دنیا میں ذلیل و رسوا

سنہ ۱۹۰۸ء

رامپور میں مرزا غلام احمد قادیانی کے حامیوں سے حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے درمیان جون سنہ ۱۹۰۹ء کو مناظرہ ہوا، جس میں قادیانیوں کو شکست ہوئی۔ اس شرمناک شکست پر جناب قاضی عبدالعلی عابد ایڈیٹر مخبر عالم نے قطعہ تاریخ یادگار مباحثہ ریاست رامپور کہا، جو ۲۳ جون سنہ ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

خاص در بحثِ مذہبِ صادق — اہلِ سنت جو فتح، نصرت یافت

ملکِ رامپور گفت عابد — قادیانی شکست، ہزیمت یافت

۱۹۰۹ء

قصیدہ سالگرہ سر نواب محمد حامد علی خانصاحب

سی۔ ای۔ آئی۔ فرمانروائے ریاستِ رامپور ۱۹۰۹ء

کیا خبر فصلِ بہاری لائی گلشن میں صبا — چہچہے کرنے لگیں سب بلبلانِ خوش نوا

نخل سارے جھومتے ہیں آج مستوں کی طرح — خندہ زن ہیں پھول بھی فرطِ طرب سے جابجا

تالیاں پتے بجاتے ہیں اگر ہلتی ہے شاخ — جھومتے ہیں نخل گویا، رقص ہے طاؤس کا

محوِ آرائش ہوئے ہیں سب حسینانِ چمن — زلفِ سنبل میں نسیمِ صبح نے شانہ کیا

صبحدم سے روئے گل پر یوں درِ شبنم کا حسن — جس طرح افشاں چنے ماتھے پہ کوئی مہ لقا

مسکراتے ہیں جو غنچے خندہ زن ہیں پھول بھی — سرو سے انداز پیدا ہے قدِ معشوق کا

سرخ ہیں رخسارِ گل فرطِ خوشی سے باغ میں — دیدۂ نرگس ہے مثلِ چشمِ جاناں خوش نما

مجھ کو حیرت تھی چمن آراستہ ایسا ہے کیوں — ناگہاں بادِ صبا نے مجھ کو یہ مژدہ دیا

کیوں تحیر میں کھڑا ہے صورتِ سروِ چمن — اس مسرت کا سبب تجھ کو نہیں معلوم کیا

آج پڑتی ہے گرہ پینتیسویں سرکار کی — مصطفیٰ آباد کا عالم ہے عالم سے جدا

رشکِ سلطانِ جہاں دربار فرمائیں گے اب
حضرتِ حامد علی خاں صاحبِ جود و سخا

سن کے یہ مژدہ رہیں جوشِ طرب سے جھوم کر
بے تامل مدحتِ والا میں یہ مطلع کہا

مطلعِ دوئم

یہ جہاں میں فیض کا تیرے ہے شہرہ جا بجا
وقتِ بخشش ابرِ نیساں ہے ترا دستِ سخا

روز و شب ہوتا ہے تیرے فرقِ انور پر نثار
آسماں کی آج گردش کا سبب ہم پر کھلا

جلوۂ رخسار سے تیرے جہاں پر نور ہے
بامِ گردوں پر چراغِ ماہ کو گل کر دیا

یہ تری ہیبت کا پیدا ہے اثر آفاق میں
نام سن کر رعب سے دشمن ہو دم بھر میں فنا

جو تری چشمِ مروت جانبِ حضّار ہو
ہر نفس میں لاکھ قوت ہو دمِ بیم و رجا

حشمت و اقبال کا شہرہ ہے تیرے جا بجا
بے نوایانِ جہاں کا ہے تو ہی حاجت روا

بخششِ فیضِ عطا تیرا محیطِ عام ہے
ہمت و الطاف کا چرچا ہے تیرے جا بجا

مطلعِ ثالث بھی تیرے وصف میں لکھتا ہوں یوں
چار حدِّ دہر میں پیدا نہیں ثانی ترا

مطلعِ سوئم

رعب چھایا ہے یہ تیرا اے امیرِ باحیا
ہے زمیں بوسِ ادب خامہ دمِ مدح و ثنا

چترِ شاہانہ ترے سر پر اگر آئے نظر
ہو فدا ہر ہر قدم پہ سایۂ بالِ ہما

کیوں نہ گر جائیں مری آنکھوں سے اب خورشید و ماہ
چہرۂ پر نور کا تیرے ہے نظارہ کیا

سرو استادہ پئے تعظیم ہیں گلزار میں
اڑ نہیں سکتا ادب سے طائرِ رنگِ حنا

سیر کو دریا کی تو تشریف لے جائے اگر
نذر کو لائے صدف ہاتھوں پہ درِ بے بہا

جب کبھی قصرِ جلالت سے رکھا باہر قدم
پنجۂ خورشید سے گردوں نے بھی مجرا کیا

ہر طلعت، ماہ پیکر، نیترِ اوجِ کمال
خال ہے عارض پہ روشن چرخ پر جیسے سہا

سنبلِ تر باغ میں کیونکر نہ ہو آشفتہ حال
پیچ و تاب آکر جو دیکھے گیسوئے خمدار کا

ماہِ نو ہر ایک ابرو اور جبینِ صاف بدر
ہو شکن ماتھے کی وقتِ غیظ بھی تیرِ قضا

تابشِ رخسارۂ انور کہ جس کے عکس سے — طلعتِ خورشید کا ہر ایک کو دھوکا ہوا
مدح تیری شان کے لائق بھلا کیا لکھ سکوں — وصف ذرّے سے بیاں ہو کس طرح خورشید کا
اب دعا پر ختم عابد مدح کرتا ہے تری — ہے یقیں بابِ اجابت تک رسا ہو التجا
تاقیامت ہر برس یوں ہی گرہ پڑتی رہے — ہو یوں ہی ہر سال تیرا جشنِ شاہانہ سدا
چار سو شہرہ رہے تیری ترقّی کا مدام — اقتدار و دولت و اقبال و صولت ہو سدا
احتشام و جاہ و حشمت روز و شب افزوں رہے — دورِ گردوں تک رہے شہرہ ترے اقبال کا

سنہ ۱۹۰۹ء
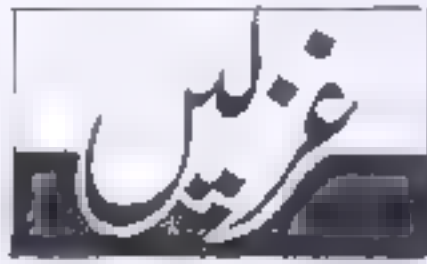
چارہ گر دردِ محبت میں مسیحا نہ ہوا — تیرا بیمار پڑا ایسا کہ اچھا نہ ہوا
آؤ اب مل کے بہم شکوۂ قسمت کر لیں — تم ہمارے نہ ہوئے غیر تمھارا نہ ہوا
وہ ملے بھی تو ملا ہم کو نہ کچھ لطفِ وصال — ہجر کا دور شبِ وصل بھی کھٹکا نہ ہوا
چل دیئے صبحِ شبِ وصل یہ کہہ کر مجھ سے — اب بھی کم بخت کلیجہ ترا ٹھنڈا نہ ہوا
غیر کے ساتھ عیادت کو وہ میری آئے — دردِ دل اور سوا ہو گیا اچھا نہ ہوا
جان جاتی ہے مری آپ کو سوجھا ہے حجاب — جان لیوا ہوا یہ آپ کا پردا نہ ہوا
نہ کہیں وعدہ فراموش تو کیا تجھ کو کہیں — بے وفا ایک بھی پورا ترا وعدا نہ ہوا
تم سنو بھی جو سناؤں تمھیں دردِ فرقت — تم کہو بھی جو کہوں ہجر میں کیا کیا نہ ہوا
سینہ سے سینہ ملا دل سے مگر دل نہ ملا — نہ ہوا وصل میں ارماں مرا پورا نہ ہوا

اس سے امید ہو کیا مہر و وفا کی عابد
جس جفا کار کو ملنا بھی گوارا نہ ہوا

سنہ ۱۹۱۰ء

مہ جبیں روز نیا دل جو لیا کرتے ہیں — کچھ نہیں کھلتا یہ کیوں لیتے ہیں کیا کرتے ہیں
کیا کہا وہ نہیں کرتے جو کہا کرتے ہیں — کھینچئے تیغ ہم اب سر کو فدا کرتے ہیں
شوخیاں کرتے ہیں جو ناز کیا کرتے ہیں — آپ ہی چھیڑتے ہیں آپ حیا کرتے ہیں

دل لگی کے لئے دل ہم نے دیا تھا تم کو
یہ نہ سمجھے تھے کہ صدمے بھی ہوا کرتے ہیں

رشک آتا ہے ہمیں یہ نہیں دیکھا جاتا
سامنے میرے وہ غیروں پہ جفا کرتے ہیں

کیا شبِ وصل بھی یہ یوں ہی گذر جائے گی
آپ سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں حیا کرتے ہیں

فکر میں حوروں کی مصروف ہے تو بھی زاہد
ہم بتوں کے لئے جو یادِ خدا کرتے ہیں

شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلو کہاں کا پردہ
شرم کیا چیز ہے کیوں آپ حیا کرتے ہیں

سنہ ۱۹۱۰ء

ہم نے سو بار سنا تم نے یہ سو بار کہا
لو جفا چھوڑتے ہیں عہدِ وفا کرتے ہیں

وصل میں کیا کوئی ارمان نکالے اُن سے
منھ چھپائے ہوئے بیٹھے ہیں حیا کرتے ہیں

آنکھوں آنکھوں میں اڑا لیتے ہیں دل کیسے حسین
سحر کرتے ہیں فسوں کرتے ہیں کیا کرتے ہیں

ماننے کی نہ ہو جو بات وہ مانیں کیوں کر
آپ سو بار کہیں ترکِ جفا کرتے ہیں

حال پوچھا جو شبِ غم میں تصور نے ترے
منھ سے بے ساختہ نکلا کہ دعا کرتے ہیں

ایک تو ہے کہ ہمیں کو ستا ہے آٹھ پہر
ایک ہم ہیں کہ ترے حق میں دعا کرتے ہیں

روک واعظ نہ ہمیں دیکھ گنہگار نہ بن
یاد میں ساقیٔ کوثر کی پیا کرتے ہیں

ان سے امید ہو کیا لطف و کرم کی عابدؔ
جو ستم گار، جفا کار، دغا کرتے ہیں

سنہ ۱۹۱۰ء

کہوں تو کس طرح ان سے کہوں کیا دل کی حالت ہے
ابھی آ کر وہ بیٹھے ہیں، نئی صاحب سلامت ہے

ہمارے نام سے کس کو ہے نفرت تم کو نفرت ہے
تمھارے نام سے کس کو ہے الفت ہم کو الفت ہے

برا ہم کس لئے کوئی کہے جب ایک حالت ہے
حسینوں کی ہمیں، زاہد کو بھی حوروں سے الفت ہے

یہ سب کچھ ہے کہ ضبطِ غم سے میری غیر حالت ہے
مگر اُن سے کہوں کیا، دور کی صاحب سلامت ہے

وہ کہتے ہیں ہزاروں چاہنے والے ہمارے ہیں
ملیں کس کس سے ہم پر اک زمانے کی طبیعت ہے

شکایت ہے رقیبوں کی، نہ شکوہ ہے مقدر کا
جسے چاہو نہ چاہو تم، یہ اپنی اپنی قسمت ہے

ہزاروں میں کہو کہہ دیں، تمھیں پر دم نکلتا ہے
تمھیں پر جان دیتے ہیں، تمھاری ہی محبت ہے

کہاں جنت، کہاں دنیا، تو کیا کہتا ہے اے واعظ
پرستش خود کریں حوریں، بتوں کی ایسی الفت ہے

کیا شکوہ رقیبوں سے جو ملنے کا تو فرمایا
تمھیں کیوں رشک آتا ہے یہ اپنی اپنی قسمت ہے

ادا غمزہ کرشمہ شوخیاں صورت بھی سیرت بھی
یہ سب کچھ ہے بت کافر مگر تو بے مروت ہے

نہ شب کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے
الٰہی ان بتوں کا کیا قیامت درد فرقت ہے

نظر ہے آرسی پر آئینہ ہے روبرو ہر دم
انھیں تم جانتے ہو جن کو منھ دیکھے کی الفت ہے

جو بعد ظلم بھی ظالم نے ہنس کر حال دل پوچھا
کہا میں نے کرم ہے شکر ہے لطف و عنایت ہے

جنازے پر جو آئے ہو تو مٹی کیوں نہیں دیتے
ملا کر خاک میں بھی آپ کو باقی کدورت ہے

تجھے بیتابیٔ دل کی خبر میرے نہ ہو لیکن
خدا پر خوب روشن ہے بت کافر جو حالت ہے

شکایت کیا کروں عابدؔ میں اُن کی بد مزاجی کی
خفا ہونا بگڑنا روٹھنا بچپن کی عادت ہے

سنہ ۱۹۱۰ء

بیٹھے ہو عبث منھ کو چھپائے ہوئے گھر میں
پتلی بنو آنکھوں کی رہو میری نظر میں

دل میں ہے ادھر سوز اُدھر درد جگر میں
بے چین ہوئے دونوں تری ایک نظر میں

حیران ہوں آنکھوں پہ بٹھاؤں اسے کیونکر
ہے غیر نظر میں تری تو میری نظر میں

اس شکل سے اب دیکھ لیا کرتے ہیں ان کو
اغیار کی محفل میں کبھی راہ گذر میں

خوش ہوتے ہیں سن سن کے وہ نالے مرے یا رب
کچھ اور ترقی ہو مرے درد جگر میں

کیا شیخ نے دیکھا کوئی صورت نہیں دیکھی
ڈھونڈیں گے بتوں کو ہم ہی کعبہ کے سفر میں

سر جائے مگر جائے نہ دل سے غم فرقت
کچھ ایسا سمایا ہے یہ سودا مرے سر میں

یہ دل مرا کعبہ سے تو کچھ بڑھ کے نہیں ہے
واعظ کبھی بت رہتے تھے اللہ کے گھر میں

قسمت ہے یہ ہم دور سے بیٹھے ہوئے دیکھیں
بیٹھا ہے سر بزم عدو آپ کے بر میں

پردہ میں بھی پردہ ہے کوئی آنکھوں کا پردہ
دل میں مرے تم رہتے ہو پھرتے ہو نظر میں

بت خانے میں ہم بت سے یہ کہکر ہوئے رخصت
صورت تری بھولیں گے نہ کعبہ کے سفر میں

ہے کون وہ میں ہی تو ہوں برگشتہ مقدر
دل میں نہ سمایا نہ تری آیا نظر میں

وہ ترچھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں
دل چاہتا ہے تیر یہ رکھ لوں میں جگر میں

اللہ کے گھر سے ہے عداوت انھیں عابدؔ
لاتے نہیں اس واسطے بت دل کو نظر میں

سنہ ۱۹۱۰ء

مناجات

یہ مناجات جناب عبدالعلی عابد ایڈیٹر مخبرِ عالم کی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹ء کے شمارے میں چھپی ہے جس کے بارے میں عابد صاحب نے لکھا ہے کہ جو اس کو پڑھے گا انشاءاللہ تعالیٰ وہ ہر بلا سے محفوظ رہے گا۔

اب کرم اے کریم ہو جائے
رحم، ربّ الرحیم ہو جائے

حال ابتر ہے تیرے بندوں کا
اُن پہ لطفِ عمیم ہو جائے

ٹھنڈے جھونکوں سے باغِ جنت کے
سرد نارِ جحیم ہو جائے

نہ رہے قہر، رحم کی ہو نظر
مہر، ربّ الرحیم ہو جائے

دور طاعون کی بلا ہم سے
یا غفور الرحیم ہو جائے

ہو معطر دماغ عالم کا
بادِ عیسیٰ شمیم ہو جائے

خوفِ تر دامنی مٹے دل سے
ابرِ رحمت ضخیم ہو جائے

آتشِ قہر سرد ہو یا رب
باغِ عالم نعیم ہو جائے

فضل سے تیرے نیک ہوں اعمال
یہ رسالہ ضخیم ہو جائے

تیر ہیں تیزیاں گناہوں کی
عادت ان کی حلیم ہو جائے

دل سے بھولے جو کوئی یاد تری
یہی اس کا نعیم ہو جائے

جو دہن ذکر میں کھلے نہ ترے
اے خدا وہ ضخیم ہو جائے

مرضِ معصیت نہ ہو مطلق
دل جو میرا حکیم ہو جائے

وہ کرم کر کریم اب اپنا
دل سے ہر اک صمیم ہو جائے

وہ محبت کا دے سبق اپنی
خلق ساری فہیم ہو جائے

نت نئی آفتوں سے ہم کو بچا
لطف ہم پر قدیم ہو جائے

بندہ پرور یہ ہو کرم تیرا
سارا عالم حلیم ہو جائے

تجھ سے پوشیدہ کوئی حال نہیں
فضل اب یا علیم ہو جائے

ہو مخالف نہ کوئی عالم میں
ہو جو دشمن حمیم ہو جائے

یہ کرم کر کہ ہو حسد جس سے
حالِ دشمن سقیم ہو جائے

راستے سے جو تیرے بہکا ہے — وہ بھی مشلِ رحیم ہو جائے
اے خدا واسطہ محمد کا — فضل تیرا عمیم ہو جائے
اس گنہگار کی دعا ہو قبول — رحم اب اے رحیم ہو جائے

ہے یہی عرض عابدِ مسکیں
اس پہ لطفِ عظیم ہو جائے

جناب رئیسِ اعظم قاضی محمد شوکت حسین خاں صاحب مراد آبادی کو کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع مراد آباد نے ۱۹۱۱ء کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا تھا جس پر جناب قاضی عبد العلی عابد ایڈیٹر مخزنِ عالم مراد آباد نے حسبِ ذیل مبارک باد کا ایک تاریخی قطعہ تحریر کیا تھا جو ۱۵ر جولائی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

باغِ ہستی پہ جو کی میں نے دمِ صبح نظر — دیکھتا ہوں کہ جھانے ہیں کھلائے گُلِ تر
مسکراتی ہوئی پھرتی ہے بصد ناز و طرب — تن پہ آراستہ ہے نکہتِ گُل کا زیور
ہے اشارہ کہ رہے صحنِ چمن آئینہ سر — غنچے تیار ہوں باندھے ہوئے شبنم سے کمر
بلبلیں نغمہ سرا ہوں بصد الحان و سرور — گائیں مرغانِ چمن مل کے ترانہ یک سر
عطر و خوشبو سے جھلکتا ہے صحرا و چمن — ہے گُل چادرِ چمن کو دے کے آئے باہر
مجھ کو حیرت ہوئی دیکھا جو یہ نقشہ میں نے — عرض کی میں نے یہ پھر اس سے کہ اے نیک گہر
آج کیا بات ہے کیسی ہے خوشی خیر تو ہے — تو جو اس ناز سے پھرتی ہے اِدھر اور اُدھر
سن کے یہ بات مری دیکھ کے حیرت سے بہت — مجھ سے کہنے لگی وہ غنچہ دہن یوں ہنس کر
بے خبر ہے تو ابھی تک یہ تعجب ہے مجھے — کہ تجھے وجد مسرت سے نہیں کچھ بھی خبر
قوم کے فخر ہیں جو حضرتِ شوکت ان کو — اختیاراتِ عدالت ہیں ملے سرتاسر
میں نے جس دم سنا یہ مژدۂ راحت افزا — کھل گیا غنچۂ دل پھر تو مثالِ گُلِ تر
فکرِ تاریخِ تقرر ہوئی پیدا مجھ کو — غرق دریائے تفکر میں ہوا تا بہ کمر

ہاتفِ غیب کی آئی یہ ندا اے عابد
فوجداری کے ہوئے شیریں زباں اب افسر

۱۳۲۹ھ

غزل

نہ دل دیتے تجھے ظالم نہ یہ آہ و فغاں ہوتی
خلش ہوتی، خلش ہوتی نہ یہ حالت عیاں ہوتی

اگر الفت مری اے بت ترے دل میں نہاں ہوتی
چھپانے سے نہیں چھپتی ہزاروں میں عیاں ہوتی

اگر بھولے سے بھی تم پوچھ لیتے حالِ دل میرا
تو پھر کیوں دردِ فرقت کی شکایت درمیاں ہوتی

وہ دل تھامے چلے آتے مرے گھر پر نہیں رکتے
اگر تاثیر کچھ بھی تم میں اے آہ و فغاں ہوتی

اگر ان کو محبت کچھ مری ہوتی تو کیا چھپتے
کہیں برقِ نظر گرتی کہیں شوخی عیاں ہوتی

یہ بت پتھر کے ہیں یارب کہیں کیا حالِ دل ان سے
کبھی تو پوچھتے منہ میں، اگر ان کے زباں ہوتی

یہ سب کچھ ہوتا مجھ پر ہاں نہ اک رشکِ عدو ہوتا
جفا ہوتی، دغا ہوتی، بلائے ناگہاں ہوتی

نہ کرتا بھول کر بھی آہ و نالے میں شبِ فرقت
گر قابو میں دل ہوتا، اگر بس میں زباں ہوتی

نہ کرتا ضبط الفت تو ستم ہوتا غضب ہوتا
زمانے میں تمھاری اور ہماری داستاں ہوتی

نگاہیں چاہنے والوں کی ہیں زیرِ قدم ورنہ
ترے پاؤں کے نیچے کی زمیں بھی آسماں ہوتی

سرِ محفل لگا لیتا انھیں عابدؔ میں سینے سے
اگر ہوتا بھی ہوتا شکایت درمیاں ہوتی

سنہ ۱۹۱ء

غزل

جھوم کر ابر اٹھے خوب سا برسا پانی
میرے مولا تری رحمت سے ہوا چھایا پانی

چار بوندوں سے بھی کچھ ہوتا ہے ابرِ رحمت
کشتِ امید ہو سرسبز وہ برسا پانی

خوب دل کھول کے برسے کہ ہری ہو دنیا
ٹھنڈے چھینٹوں کا نہ دے ہم کو دلاسا پانی

ایک عالم یہ کہے بھر گئے سارے جل تھل
رحمتِ رازقِ مطلق سے یہ برسا پانی

قطرہ قطرہ کے لئے روتی ہے دنیا تجھ کو
اب خدا کے لئے اتنا تو نہ ترسا پانی

ابرِ باراں سے نہ پھر کوئی شکایت ہوتی
چشمِ گریاں کے برابر بھی جو گرتا پانی

رحم ہو خالقِ اکبر قفسِ دنیا پر   بند کرتے نہیں صیاد بھی دانا پانی
لطف تو پینے پلانے کا ہے جب اے ساقی   صحنِ گلشن میں چھما چھم ہو برستا پانی
دھل گئی جس سے گناہوں کی سیاہی عابدؔ
رحمتِ خالقِ عالم سے وہ برسا پانی

۱۰ر اگست ۱۹۱۱ء

پیرِ مے خانہ سے اے شیخ ہے بیعت لازم   سلسلہ ساقیِ کوثر سے ہے مے خواروں کا
چھوڑ کر غیر کو وہ ساتھ ہمارے آتے   ایک جلتا ہوا فقرہ جو سنا یاروں کا
صدمۂ ہجر پہ ہم صبر تو کرتے لیکن   کام وہ کیا کریں جو کام ہو بے کاروں کا

وہ داستانِ دردِ جگر سن کے ہنس دیئے   ایسوں سے کیا کہے کوئی پھر ماجرائے دل
ظالم کوئی حساب بھی ہے ظلم کا ترے   کتنے جگر دکھائے ہیں کتنے ستائے دل
جورِ سپہر ظلمِ بتاں صدمۂ فراق   بڑھ کر ہے ان بلاؤں سے مجھ پر بلائے دل
عابدؔ کو عرضِ حال میں کیا عذر ہے مگر
دل سے کوئی سنے تو کہے ماجرائے دل

بدایوں کے قاضی مولانا مولوی عبدالمقتدر صاحب نے ۱۹۱۲ء میں ۲۸ر رمضان المبارک کو رویتِ ہلال مان کر خلافِ عقل شہادت پر حکم دیا تھا اور خود کھڑے ہو کر نمازِ عید پڑھا دی تھی۔ اس پر ملک میں اعتراضات ہوئے، اور اخبارات نے آرٹیکل لکھے، شعراء نے شاعرانہ مذاق سے کام لیا۔ چنانچہ قاضی سید عبدالعلی صاحب عابدؔ ایڈیٹر مخبرِ عالم مرادآباد نے حسبِ ذیل ایک تاریخی قطعہ یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع کیا۔

ہمیشہ ہوتی تھی انتیس تیس کی رویت   مگر بدایوں میں اب کے ہوئی نرالی عید
بنا کے فروری ماہِ صیام کو افسوس   ستم ہے بارہ ستمبر ہی کو کرالی عید
جو ہر برس یوں ہی گھٹتا رہیگا اک دن   تو بست و ہشت برس بعد ہوگی خالی عید
کہاں سے چاند نکل آیا بست و ہشتم کو   خلافِ عقل تھی اٹھیسویں کو عالی عید
مگر تھے فتوۂ مفتیِ شرع سے مجبور   یقین دل کو تھا جبریہ منالی عید
جنھوں نے کر لیا افطارِ صوم بے رویت   مبارک ہو انھیں یارب یہ بے ہلالی عید

ہوئی ہیں شہرِ بدایوں میں اب کے دو عیدیں
کہ بے ہلالی تھی اک دوسری ہلالی عید

کہا یہ ہاتفِ غیبی نے سال اے عابدؔ
کہ مقتدر نے کہو دھوم سے منائی عید

١٣٣٠ھ

بے خودیٔ شوق میں ہم جان سے جانے لگے
وہ خیالِ وصل بن کر خواب میں آنے لگے

خوب سوجھی دل لگی یہ بیٹھے بیٹھے آپ کو
غیر کا پیغامِ الفت مجھ کو بھجوانے لگے

کس کا وعدہ بھولا یہ جوانی کی اٹھان
اب تو تم نامِ خدا کچھ اور فرمانے لگے

خاک ہونے پر بھی مٹی کیا مری برباد ہو
غیر کو لے کر مرے مرقد پہ جو آنے لگے

کیا انوکھا اک تمھیں پر ہے جوانی کا ابھار
اٹھتے جوبن پر جو اپنے آپ اترانے لگے

اس بہانے سے چڑھائے غیر کی تربت پہ پھول
ہار تھے کانوں کے یہ ہم ان سے گھبرانے لگے

ہار بن کر غیر کی گردن کا، یہ دیکھی بہار
دو ہی دن میں پھول سے رخسار مرجھانے لگے

یہ نگہ خونریز، یہ سفاک غمزہ جاں ستاں
کوئی ہے جو دیکھ کر تجھ کو نہ مر جانے لگے

مر مٹے ہم رشک سے کیسی مسرت کیا خوشی
جب ستایا غیر کو آنکھیں وہ دکھلانے لگے

رہ گیا یاں شوقِ نظارہ، وہاں گیسو کھلے
میری قسمت کی طرح رخ پر وہ بل کھانے لگے

آ چکے تم وعدۂ فردا پہ، اچھا جائیے
جھوٹی قسمیں کھا کے ناحق مجھ کو بہلانے لگے

جا کے بزمِ غیر میں میری طلب ہوتی ہے کیوں
یہ نئی عابدؔ قیامت مجھ پہ وہ ڈھانے لگے

سنہ ۱۹۲۷ء

نہ ہو کیوں بارشِ ابرِ کرم دربارِ صابر ہے
ملک نذریں لئے آتے ہیں وہ سرکارِ صابر ہے

نظر آئے سراپا، محوِ حیرت دیکھنے والے
جمالِ نورِ وحدت ہے کہ یہ دربارِ صابر ہے

عدو کا کیا گلہ مجھ کو فلک کی کیا شکایت ہے
مرا مولا، مرا آقا، مرا سردارِ صابر ہے

حقیقت میں طریقت معرفت کا ہے وہی مالک
جو آگاہِ شریعت ہے جو پیروکارِ صابر ہے

کوئی جنت کا خواہاں ہے کوئی حوروں کا طالب ہے
مرا مطلوب صابر ہے مرا دلدارِ صابر ہے

طوافِ جن و انساں حور و غلماں و ملائک ہے
جسے باغِ جناں کہتے ہیں یہ گلزارِ صابر ہے

حصولِ مدعائے دل امیدگاہِ اک عالم
مزارِ حضرتِ مخدوم پر انوارِ صابر ہے

نگاہوں میں نہ آئیں قیصر و فغفور کے جلسے — نظر میں جس کسی کے جلوۂ دربار صابر ہے

علاء الدین علی احمد ہیں مخدومِ جہاں عابدؔ
اسی گھر کا میں خادم ہوں مری سرکار صابر ہے

سنہ ۱۹۲ء

گلزارِ ناز کا گلِ رعنا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

حاصل ہوئی نیازِ محبت کو شامِ وصل — وہ شامِ وصل حاصلِ دنیا کہیں جسے

پنہاں خرامِ ناز میں ہے ایک دلکشی — وہ دلکشی قیامتِ برپا کہیں جسے

لے دے کے ایک دل ہے وہ بیتابِ آرزو — وارفتۂ بہارِ تماشا کہیں جسے

شاید سنا ہو آپ نے اس خوش نوا کا نام
عابدؔ وہی ہے شاعرِ یکتا کہیں جسے

سنہ ۱۹۲۶ء

غنچہ ہائے گلشنِ عشرت ہے تابِ نشاط — حسن کی محفل میں ہیں دنیا کے اسبابِ نشاط

ہائے یہ رسوائی دردِ محبت اے خدا — عشق بربادِ تمنا، حسن شادابِ نشاط

لے چکا ہوں بادۂ رنگیں سے درسِ بیخودی — کر چکا ہوں مصلحت کو غرقِ گردابِ نشاط

آپ کی عشرت پسندی کو نہیں احساسِ غم — میرے دل کی دردمندی کو نہیں تابِ نشاط

میری آنکھوں میں کبھی جلوے تھے ان کے حسن کے — میری آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اک خوابِ نشاط

دے کے دل میں نے غمِ داغِ محبت لے لیا — کس قدر ارزاں ملی ہے جنسِ نایابِ نشاط

جگمگاتی ہے فروغِ حسن سے شامِ وصال — شعلہ ہے برقِ عشرت نورِ مہتابِ نشاط

نغمہ زارِ دو جہاں میں روح پھونکی عشق نے — ذرہ ذرہ ہو گیا دنیا کا بے تابِ نشاط

یہ خیال آتا ہے عابدؔ آج مجھ کو بار بار
میری آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اک خوابِ نشاط

سنہ ۱۹۲۸ء

عکس افگن ہے ترا گل سا بدن دریا میں — کیا تماشا ہے کہ پھولا ہے چمن دریا میں

جب سے تو آ کے نہایا نظر آئیں موجیں — رہ گئی ہے کوئی زلفوں کی شکن دریا میں

طوقِ گرداب میں زنجیریں ہیں موجیں ساری — رہتے ہیں کس کے اسیرانِ کہن دریا میں

لب تو برشعلہ بانیٔ گوہر سے صدف کی قیمت — آپ نے قہر کیا دھوکے دہن دریا میں
غرق شبنم جو ہر اک پھول کو دیکھا دمِ صبح — ڈوبتے جاتے ہیں مرغانِ چمن دریا میں
رخ پہ ڈالے ہوئے زلفیں جو ہیں کشتی پہ سوار — دیکھنے آئے ہیں وہ چاند گہن دریا میں

ذبح ہونے کو چلا ہے سوئے ساحل عابد
دامنِ موج کا پائے گا کفن دریا میں

سنہ ۱۹۲۹ء

مجزعالم کے شماروں میں ایسی بھی نظمیں اور غزلیں ہیں جن پر کسی شاعر کا نام نہیں ہے اور نہ ان کا مقطع ہے۔ ایسا کلام یقیناً جناب سید عبدالعلی عابد ایڈیٹر مجزعالم مرادآباد کا ہے۔ اس لئے ان میں سے اس کتاب کے لئے نقل کیا گیا ہے اور اس کلام کے آخر میں مجزعالم مرادآباد کی تاریخ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

بمدح حضرت مولانا احمد میاں صاحب گنج مرادآبادی دام فیوضہٗ

بزمِ عرفاں میں ہر اک سمت ہے جلوہ تیرا — رشکِ خورشید مبیں ہے رخِ زیبا تیرا
میری کیا چیز ہے ہر شے پہ ہے دعویٰ تیرا — جان بھی دل بھی ترا دل میں عقیدہ تیرا
مغفرت سے ہمیں محروم رکھے کیا معنی — آسرا تیرا، مدد تیری، بھروسا تیرا
کیوں نہ ہو کس کا تو ہم نام ہے پیارے احمدؐ — عاصیوں کو نہ ہو کس طرح بھروسا تیرا
رہبرِ جادۂ حق، واقفِ اسرارِ علوم — مخزنِ رازِ خدا، قلب مصفّا تیرا
جلوۂ طور اگر دیکھے تو آنکھیں کھل جائیں — وہ بھرا نور سے اللہ نے سینہ تیرا
بختِ دارا و سکندر سے تجھے کیا نسبت — نجمِ اقبال ہمایوں ہے ستارا تیرا
بحرِ غم میں دلِ ناشاد ڈبو ہی دیتا — گر نہ ہوتا مجھے دنیا میں سہارا تیرا

رزق کی فکر نہ بخشش کا تردد مطلق
دین و دنیا میں ہے بس مجھ کو وسیلا تیرا

حضرت صاحبزادے عالی قدر میاں

رحمت اللہ صاحب گنج مرادآبادی دامَ فیوضہٗ

بند کلیوں کی طرح کہتا ہے کھل کر سہرا
رحمت اللہ مبارک ترے سر پہ سہرا

پاسِ آداب جو نوشاہ کا تھا مدِّ نظر
سر پہ یوں شکلِ سلامی ہوا مڑ کر سہرا

مثلِ طائر کے یہ پھانسے گا عروسِ دل کو
جال کے پیچ میں لپٹا ہے جو سر پہ سہرا

دل کو ہاتھوں سے دبائے ہوئے بیٹھی ہے عروس
ایک تو شکل غضب اس پہ ستمگر سہرا

شوخ چشموں کی نگاہیں جو پڑیں سہرے پر
بن گیا تارِ نظر سہرے کے اوپر سہرا

دور سے ناز نے دی بھر کے مبارک بادی
چاند سے مکھڑے کو دیکھا جو ہٹا کر سہرا

تازہ پھولوں کی لپٹ دل کو کھینچے تو یوں ہی
عطر دلہن میں ہوا اور معطّر سہرا

اپنے جامہ میں سماتا نہ تھا پھولا لیکن
ہو گیا دیکھ کے نوشاہ کو ششدر سہرا

دادِ عابد مجھے دیتی ہے عروسِ مضموں
مرحبا کہتا ہے نوشاہ کے رخ پر سہرا

ساقی نامہ سنہ ۱۹۴۳ء

ساغرِ مشک ناب دے ساقی
سالِ نو کی شراب دے ساقی

مژدۂ انقلاب دے ساقی
صبح کو آفتاب دے ساقی

ساقیا زندگی کی رات کٹی
ہجر میں تیرے سب حیات کٹی

بزم میں اہتمام تازہ کر
رند ہیں تشنہ کام و خستہ جگر!

لا پلا دے شراب دے ساغر
انتظارِ شراب ہے دوبھر

نئے ساماں، نیا زمانہ ہے
میرے لب پر نیا فسانہ ہے

ساقیا ہر طرف ہے دہر میں جنگ   رندِ رنگِ جہاں سے ہیں دل تنگ
دیکھ بدلا ہوا ہے بزم کا رنگ   ساقیا اٹھ رہی ہے دل میں امنگ

مست جامِ مئے طرب کر دے
نئے رنگیں کے جام پھر بھر دے

ہے رقیب آج گرمِ جنگ و جدل   تیرے میکش ہیں ہر طرف بیکل
بدل اس رنگِ دو جہاں کو بدل   دے ذرا دہر کو پیامِ عمل

غم سے ہے اضطراب اے ساقی
فتح کی دے شراب اے ساقی

ظلم پرور ہیں جرمن و جاپان   جنگ و غارت کے ہیں نئے ساماں
فرصتِ دم زدن بھی ہم کو کہاں   ساقیا دے شرابِ امن و اماں

آج اک انقلاب ہے گویا
اتحادی ہیں فتح کے جویا

عابدؔ اک رندِ بے نوا ہے تیرا   دل میں اک جذبۂ وفا ہے تیرا
دل مرا طالبِ عطا ہے تیرا   یا رب اس کو بس آسرا ہے تیرا

بزم کو سالِ نو مبارک ہو
قوم کو سالِ نو مبارک ہو

———— مخبرِ عالم، جنوری ۱۹۴۳ء

۴ مارچ ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۶۲ھ روز دو شنبہ کی صبح کو نواب سر رضا علی خاں والیٔ رامپور کے ہاں ایک فرزند ارجمند ہوا۔ اس خوشی کے موقعہ پر جناب قاضی عبدالعلی عابدؔ ایڈیٹر مخبرِ عالم مراد آباد نے چند تاریخی قطعات کہے جو ۴ مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔

شدہ طالع برا درجِ عزّ و اقبال   مثالِ ماہِ نو انجم درخشاں
گلِ گلدستۂ جاہ و ریاست   مہ برجِ حشم عابد علی خاں
بجستم سالِ میلادش چو عابدؔ   کہ از عہدِ سلف ہستم ثنا خواں

بگفتہ مصرعۂ تاریخ ہاتف
مبارک نورِ چشم ماہِ تاباں!

۱۳۶۲ھ

بہار آمد بہ گلشن عندلیب و زمزمہ پیرا
مبارک بادیٔ عابد علی خاں ذی حشم گفتہ
چو پرسیدم ز ہاتف سالِ میلادِ پسر عابدؔ
مبارک جلوۂ نورِ نظر نیکو قدم گفتہ

۱۹۴۳ء

نہ کیوں رام پور آج مسرور ہو
ہے خوش قسمتی سے عجب وقت خوب
کہا دل نے ملکہ کو سرکار کو
مبارک ہو فرزند راحت قلوب

۱۳۶۲ھ

ایوانِ ریاست میں ہر سو سامانِ عیش و عشرت کا
مخصوص نہیں ہے جشنِ طرب ہر سمت ہجومِ عام بھی ہے
سرکار بھی خوش ہیں ملکہ بھی اس جشنِ ولادت میں عابدؔ
خدامِ حریمِ شاہی پر الطاف بھی ہے اکرام بھی ہے
تاریخ ولادت کی مجھ کو تھی فکر کہا یہ ہاتف نے
سردارِ جہاں عابد علی خاں تاریخ بھی ہے اور نام بھی ہے

۱۳۶۲ھ

اے شہِ والا حشم، اے خسرو جم اقتدار
آپ کو قدرت نے رشکِ مہر و رشکِ مہ دیا
فکر تھی تاریخ کی عابدؔ، کہ ہاتف نے وہیں
وہ مبارک ماہرو: نورِ نظر ہو کہہ دیا

۱۹۴۳ء

سید عبدالعلی عابدؔ مراد آبادی کے شاگرد منشی عبدالرزاق اثرؔ، شیخ احمد بخش حسرتؔ، منشی منظور احمد منظورؔ، مولوی محمد علی ہوشؔ، مولوی عاشق حسین عاشقؔ، عبدالغنی فغاںؔ، اور مولوی احمد علی اثرؔ وغیرہ تھے۔

شیخ عبدالرزاق اثرؔ مراد آبادی قریشی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ حسیت اللہ قریشی اپنا آبائی پیشہ نہیں کرتے تھے بلکہ فروٹ یعنی پھلوں کے آڑھتی تھے، منڈی چوک میں ان کی دکان تھی۔ اثرؔ صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اپنے والد کی دکان پر بیٹھتے تھے اور کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن اساتذہ

کے دیوانوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، اور دکان کا تمام حساب وہی کرتے تھے۔

اثر صاحب کو دینی کاموں اور خصوصاً تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ علی گڑھ میں عبداللہ شاہ رہتے تھے جو پہلے عیسائی انگریز تھے۔ اپنے عیسائی مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے اور آپ کا نام عبداللہ تجویز ہوا۔ عبادت الٰہی کرتے کرتے ان کا شمار اہل دل لوگوں میں ہونے لگا اور لوگ ان کے مرید ہونے لگے۔ چنانچہ عبدالرزاق اثر بھی ان کے مرید تھے ان کے پاس علی گڑھ میں کثرت سے جاتے تھے۔

عبداللہ شاہ نے اثر صاحب کو وظیفہ بتایا کہ کاغذ پر ایک لاکھ اللہ اللہ لکھ کر ان کو کاٹ کر آٹے کی گولیوں میں موڑ کر رکھ دو اور ان کو کسی دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ذکر و اشغال میں معروف رہنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اثر صاحب نے دنیاوی امور سے قطع تعلق کر لیا۔ دکان چھوڑ دی گھر کی آمد و رفت بہت کم کر دی اور ایک کمرہ علیحدہ لے کر اس میں رہنے لگے۔ گھر کا کھانا بھی نہیں کھاتے۔ خود دن میں جو کی ایک روٹی پکا لیتے تھے اور اس سے پیٹ بھر لیتے تھے۔ سالن کی قید نہیں تھی، جو مل جاتا اس سے روٹی کھا لیتے تھے۔ لوگ ان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے اور بعض لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اچھی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ اصالت پورہ میں رہتے تھے اور اصالت پورہ کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

عبدالرزاق اثر کو بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ قاضی سید عبدالعلی عابد کے شاگردوں میں تھے۔ کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔

نہ ان کے تیر ہی سینہ سے میرے خونچکاں نکلے
عجب بھولے ہیں یاسے گھر سے میرے مہماں نکلے

خرام ناز میں یہ مسکراتے تم کہاں نکلے
کہاں ڈھاتے قیامت یہ گراتے بجلیاں نکلے

تمھارا جلوہ گاہ ناز ہے یا کوئی مقتل ہے
کوئی دم توڑتا نکلا بہت سے نیم جاں نکلے

پھنس کر جکڑی چکنی شکل پر ہم کیسے پچھتائے
سمجھتے تھے جنھیں شیریں دہن وہ بدزباں نکلے

وہ دل لے کر یہ کہتے ہیں اگر دیکھو ابھی لے لو
نگاہوں میں ہزاروں ہیں ہو مٹھی میں جہاں نکلے

سمجھ کر مہرباں تم کو دیا تھا دل مگر تم تو
بڑے ہی بے مروت بے وفا نامہرباں نکلے

میرے مرنے پر محافظ میرا دشمن ہو گیا
گنبد چرخ کہن تعویذ مدفن ہو گیا

ہے اندھیری رات ہجراں کی دہی نصیب
چار دن کی چاندنی کیوں ان کا جوبن ہو گیا

آ گئے جو تم کھلی قسمت مرے جاگے نصیب
یہ سیہ خانہ مرا اب دشتِ ایمن ہو گیا

اب ٹھکانا ہی نہیں جو بجلیاں کوندیں کبھی
ڈھیر جل کر پہلے ہی اپنا نشیمن ہو گیا

ایڈیٹر مخبرِ عالم

الحاج قاضی سید محمد عابد علی جوہر رضوی

جام مے پی کر جو دیکھا آئینہ کہنے لگے — پہلے سے اب کچھ دوبالا میرا جوبن ہو گیا
کیا بھروسا اب کروں تیرا دلِ ناکام میں — خود ہی تو رہبر بنا اور خود ہی رہزن ہو گیا
دو گھڑی تو رہنے دیتا یہ کبھی یک جا ہمیں — یا الٰہی یہ فلک کیوں میرا دشمن ہو گیا

شیخ جو ٹھوکر سے اس کی میرا مرقد جو آخر
داغِ دل چمکا، چراغِ قبر روشن ہو گیا

سنہ ۱۹۰۰ء ______________

قاضی عبدالعلی عابدؔ صاحب کے اکلوتے صاحبزادے قاضی عابد علی رضوی جوہرؔ ہیں۔ آپ کی پیدائش مراد آباد میں یکشنبہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ آپ نے مدرسہ مطلوب العلوم میں عربی کی کتابیں پڑھیں، اور فارسی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد بشپ پارکر میموریل ہائی اسکول میں مولوی عبدالوہاب صاحب، محمد یعقوب علی صاحب، مولوی ابوالحسن صاحب اور مسٹر جارڈن پرنسپل اور ہیوٹ مسلم اسکول میں ظہیر حسین ایم اے اور عبدالحامد صاحب سے تعلیم پائی۔ سید عبدالعلی عابدؔ صاحب کی حیات میں آپ نے مخبر عالم مراد آباد کی ادارت اور انتظام کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ اب تک آپ کی کوششوں سے یہ اخبار محلہ شیدی سرائے سے وقت پر نکل رہا ہے۔ خاندان میں باپ دادا شاعر تھے اور اس کا چرچا گھر میں رہتا تھا۔ آپ کو بھی اس کا شوق ہوا۔ مرزا رضا بیگ شورؔ جو داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے، کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ جناب جوہرؔ صاحب کا انتقال ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو مراد آباد میں ہوا۔

جناب جوہرؔ کے کلام میں اثر اور پختگی ہے اور روانی و سادگی بھی ہے۔

رمضان کے سحر خیزوں کی صدائے سحری

نہ سام و نریمان رہا زینہار — نہ رستم رہا اور نہ اسفندیار
نہ سہراب بر زو نے پایا قرار — نہ کوئی بہادر رہا کامگار

پڑے سو رہے ہو پڑے بے خبر
اٹھو روزہ والو ہے وقتِ سحر

یہ دنیا ہوئی ہے ادھر سے ادھر — کسی کو کسی کی نہیں ہے خبر
مگر حیف تم پر نہیں کچھ اثر — نہ یادِ خدا ذکرِ خیر البشر

پڑے سو رہے ہو پڑے بے خبر

اٹھو روزہ والو ہے وقتِ سحر

سکندر رہا اور نہ دارا رہا
نہ خاقان و فغفور و کسرا رہا!

زمیں پر نہ کوئی شہنشاہ رہا
لبوں پر فقط نامِ مولا رہا

پڑے سو رہے ہو پڑے بے خبر
اٹھو روزہ والو ہے وقتِ سحر

ارسطو ہے باقی نہ لقمان باقی
نہ حکمائے بے مثل یونان باقی

نہ عابد ہیں، شعرائے ایران باقی
نہ اب کوئی شیر نیستاں باقی

پڑے سو رہے ہو پڑے بے خبر
اٹھو روزہ والو ہے وقتِ سحر

ماہ رمضان المبارک

امتِ اسلام کو ہے رحمتِ حق کا پیام
جلوۂ ماہِ مبارک آمدِ ماہِ صیام

اللہ اللہ سحری و افطار کی یہ برکتیں
جلوہ فرما ہیں جہاں میں رحمتیں ہی رحمتیں

ہے مسلمانوں میں روحِ حق پسندی کی نمود
صاحبانِ زہد ہیں، وقفِ دعا محوِ سجود

ذکرِ باری ہے لبوں پر نورِ ایماں دل میں ہے
دورِ صہبائے حقیقت آج ہر محفل میں ہے

صبح کو سحری کے ہنگامے یہ افضالِ خدا
توبہ و تسبیح و استغفار و تہلیل و دعا

شام کو افطار کے جلسے، نمازوں کی بہار
مسجدوں میں اہلِ تقویٰ، در قطار اندر قطار

الغرض یہ روز و شب ایک ایزدی انعام ہیں
یعنی جوہر یہ حیاتِ ملتِ اسلام ہے

دولتِ ایمان و زہد و حکمت و تحقیق دے
روزہ داروں کو ادائے شکر کی توفیق دے

السّلام ماہِ رمضان

السلام اے موجبِ تکمیل نعمت السلام
السلام اے صاحبِ افضال و برکت السلام

تو مبارک ہے مہینہ ملّتِ اسلام کا
اے مبارک ماہ، اے شہرِ حقیقت السلام

السلام اے رازدارِ جذبۂ صبر و رضا
تو مسلمانوں کا ہے پیغامِ رحمت السلام

تو نے دل میں شمعِ عرفاں کو منوّر کر دیا
مومنوں کو تو ہے اک نورِ ہدایت السلام

تو نے دی ہم کو بشارت رحمتِ معبود کی
اے کہ تو ہے مقصدِ زہد و عبادت السلام

تیری راتیں ہیں منوّر جلوۂ توحید سے
تو ہے ہم کو ساقیٔ صہبائے رحمت السلام

عید کا دے کر مسلمانوں کو روحانی پیام!
سال بھر کو ہم سے تو ہوتا ہے رخصت السلام

ملّتِ اسلام پہ احساں ہیں تیرے بے شمار
الوداع اے صاحبِ الطاف و احساں الوداع

یادگارِ توبہ و تسبیح تیرے روز و شب
اے مبارک روز و شب اے ماہِ رمضاں الوداع

تو نے اے ماہِ الٰہی، ہم کو زندہ کر دیا
کیوں نہ ہوں ممنون پھر تیرے دل و جاں الوداع

تو وہ ہے جس میں کلامِ ایزدی نازل ہوا
اے کہ تو ہے منزلِ آیاتِ قرآں الوداع

سحری و افطار کی عظمت ہمیں یاد آئے گی
تو ہے بیشک رازدارِ علم و عرفاں الوداع

جوہرؔ اپنے لب پہ ہے ماہِ مبارک کی ثنا
بعد نعتِ مصطفیٰؐ و حمدِ یزداں الوداع

رفتارِ ہستی

عجب کچھ الٰہی ہے رفتارِ ہستی
کہ سارا جہاں اب ہے بیزارِ ہستی!

نہ رونق چمن میں نہ وہ شانِ گلشن
پریشاں ہے آفت سے گلزارِ ہستی

جسے دیکھئے مضطرب ہو رہا ہے
جو ہیں خشک آنکھیں تو دل رو رہا ہے

اِدھر ساری اجناس کی ہے گرانی
اُدھر جنگ سے ہر طرف سر گرانی

اِدھر قحط ہے اور اُدھر کش مکش ہے
نہ امن و اماں کی ہے راحت فشانی

غرض نوعِ انساں پہ رنج و بلا ہے
الٰہی! عجب آج فتنہ بپا ہے

جدھر دیکھیے خوں فشانی کا عالم
مصیبت کا اور سر گرانی کا عالم

کہاں چین ملتا ہے اہلِ جہاں کو
کہاں راحتِ زندگانی کا عالم

نہ دل کو سکوں ہے نہ راحت ہے جاں کو
کہیں کیا بھلا گردشِ آسماں کو؟

یہ دنیا ہے جوہرؔ کوئی قید خانہ
کہ زندانِ رنج و الم ہے زمانہ

کوئی محرمِ دردِ دل ہی نہیں ہے
سنائیں کسے دردِ دل کا فسانہ

جسے دیکھیے مبتلائے الم ہے
مصیبت زیادہ ہے اور عیش کم ہے

نغمۂ نعت

نور فشاں ہے کس کا حسن جلوہ گہِ صفات میں
وجہ ظہورِ کائنات کون ہے کائنات میں

خلوتِ قدس سے بھلا کس کی طلب ہے رات میں
کون یہ بے حجاب ہے بزمِ تجلیات میں

اس کا نظیر ہے محال عالمِ ممکنات میں
طٰہٰ کی شان جلوہ گر جس کے جمالِ ذات میں

نورِ ازل ہے اس کا نور محفلِ کائنات میں
جس کا ہے عکس آج بھی پردۂ شش جہات میں

یا یہ کمالِ بندگی، یا وہ جمالِ ایزدی
نازِ دنیاز ہے بہم ختمِ رسل کی ذات میں

باعثِ خلقتِ جہاں، وجہِ زمین و آسماں
حسنِ ازل کے رازداں شانِ ابد حیات میں

قہرِ خدا کی ہے نمود، آپ کی شورشِ عتاب
رحمتِ حق کا ہے ظہور آپ کے التفات میں

اس کی ہی امت حزیں گردشِ بخت سے ملول
کون و مکاں کی عظمتیں جس کے تصرفات میں

جوہرؔ خستہ حال بھی ہند میں پائمال ہجر
کاش طلب ہو جلد اب بزمِ تجلیات میں

صبحِ عاشورہ

کیا قیامت تھی زمانے میں وہ صبحِ عاشور — جب کیا مہرِ پر انوار نے مشرق سے ظہور
دی علی اکبرِ گل رو نے بصد شوق اذاں — اور مصلّے پہ ہوئے جلوہ فگن شاہِ زماں
کی ادا عالمِ احساسِ عقیدت میں نماز — خم ہوئے سجدۂ خالق میں شہنشاہِ حجاز
عقبِ شاہ میں تھے آپ کے انصار تمام — دل میں احساسِ رضا لب پہ شہادت کا پیام
کس ادب سے عقبِ شاہ وہ صف آرا تھے — آپ تھے مصحفِ ناطق تو وہ سیپارہ تھے

افقِ شرق پہ وہ رنگِ شفق کا عالم — عرش سے آتی تھیں ماتم کی صدائیں پیہم
بسکہ تھی قتلِ امامِ دوجہاں کی وہ سحر — خوں ملے تھا رُخِ پُرنور پہ مہرِ انور
غم سے تھی چاک گریباں جو نسیمِ سحری — لالۂ دشت کے سینہ پہ تھا داغِ جگری
سر پٹکتی تھی بصد درد و الم نہرِ فرات — یعنی پیاسے تھے کئی وقت سے شاہِ خوش ذاتؑ
شور تھا خیمۂ عصمت میں جو پانی پانی — سطحِ دریا پہ تھا اک عالمِ اشک افشانی

جمعہ عاشورہ کا دن اور تھی اکسٹھ ہجری — آخری صبح کی جب شہ نے نماز اٹھ کے پڑھی
رفقا آپ کے ہمراہ تھے اللہ اللہ — کتنے خوددار و حق آگاہ تھے اللہ اللہ
بعدِ تکمیلِ عبادت سوئے خیمہ آئے — اہلِ بیتِ نبویؐ کے دل و جاں تھرّائے
بیبیاں آ کے قریبِ شہِ والا بیٹھیں — حضرتِ زینب و کلثوم و سکینہ بیٹھیں
شاہ نے صبر کی تلقین انھیں فرمائی — مرحبا کی دلِ بے تاب سے آواز آئی

آہ وہ دشتِ الم ناک وہ دشمن کا ہجوم — اپنے انصار میں خاموش امامِ مظلوم
تشنگی دھوپ وہ معصوم حسینی تارے — پھول کملاتے تھے اس دھوپ میں شہ کے سارے
گرم ریگ اور وہ صرصر وہ قیامت کا سماں — ظلمِ اعدا سے تھا تاریک وہ سارا میداں
تیر آتے تھے جو فوجِ ستمِ اعدا سے — اپنے سینے پہ انھیں روکتے تھے سب پیاسے

شاد تھے اہلِ وفا تیرِ ستم کھا کھا کر   جس طرح شمع پہ پروانے گریں آ آ کر

الغرض صبح سے تا عصر رہی جنگ بپا   کٹ گئے شاہ کے انصار بصد شوقِ وفا
عصر کا وقت جب آیا تو اکیلے تھے حسینؑ   کیوں نہ ہو دامنِ اسلام میں کھیلے تھے حسینؑ
گو کہ تھا جسم جراحت سے نہایت زخمی   پھر بھی پیشانیٔ اقدس پہ شکن کوئی نہ تھی
دل میں تھا بخششِ امت کا ہر اک وقت خیال   لبِ معصوم پہ تھی حمدِ خدائے متعال
نام حق لیتے تھے اور ذکرِ خدا کرتے تھے   آلِ اطہار کو تلقینِ رضا کرتے تھے

آہ وہ صبحِ شہادت وہ غم افزا منظر   کیوں نہ ہو چشم سے پھر اشک رواں اے جوہر
یاد جب آتی ہے معصوم کی دل ہلتا ہے   غنچۂ خاطرِ افسردہ کہاں کھلتا ہے
آہ وہ شاہِ خوش انجام وہ اعدا کا ہجوم   اہلِ بیتِ نبویؐ اور امامِ مظلوم
آہ وہ پیاس وہ صحرا وہ شہادت کا سماں   بادِ صرصر کی وہ شورش کہ نہ تھی جس سے اماں

خونِ مظلوم ہے یہ صبح کی لالی جوہر
صبحِ عاشورہ کی ہے شان نرالی جوہر

سلام

سلامی کربلا والوں کی کیا شانِ شہادت ہے   کہ جس پہ آج تک گریاں ہر اک قوم اور ملت ہے
حسینؑ اس شان سے آتے ہیں خیمہ میں دمِ آخر   لبوں پر شکر کاندھے پر علی اکبر کی میت ہے
جسے اے شمر تو تیغِ ستم سے ذبح کرتا ہے   یہ سر تاجِ امامت ہے جگر بندِ رسالت ہے
وہ پیہم تشنگی وہ بے کسی وہ دھوپ وہ صدمے   علی کے لال کو لیکن نہ صدمے نے شکایت ہے
حسینؑ ابنِ علیؑ نے سر کٹایا راہِ مولا میں   یہی معیارِ ایماں ہے یہی معراجِ وحدت ہے
شہیدِ کربلا اُمت میں امت کو نہیں بھولے   گلے پر تیغِ قاتل اور لب پر ذکرِ امت ہے
سرِ اقدس چڑھایا نوکِ نیزہ پر ستمگر نے   سوا نیزہ پہ آیا مہرِ انور کیا قیامت ہے

نگاہِ دل سے دیکھو اس صبر و ایثار و تحمل کو
مسلماں! یہ شہادت مایۂ غور و بصیرت ہے

بڑو کربلا' تم اپنے جوہر کو شہر والا!
پس از ارمانِ حج دل میں مرے مدت سے حسرت ہے

دعائے سحر

الٰہی کوئی ایسا ساماں کر دے
مسلماں کو پھر سے مسلماں کر دے

بہت مشکلیں ہم نے جھیلی ہیں اب تک
تو ان مشکلوں کو اب آساں کر دے

عطا کر دے مسلم کو سوزِ بلالیؓ
ہمیں زہد و تقویٰ میں سلماں کر دے

دلوں کو ہمارے حقیقت سے بھر دے
حقیقت میں سینوں کو قرآں کر دے

زمانے میں بکھرے ہوئے ہیں جو مسلم
انھیں یک تن و یک دل و جاں کر دے

یہ مانا کہ اک ذرۂ خاک ہیں ہم
تو ذرے کو یارب گلستاں کر دے

یہ مانا کہ اک قطرۂ مضطرب ہیں
تو اک بوند پانی کو طوفاں کر دے

تجھے اپنے محبوب امی کا صدقہ
ہمیں محرمِ علم و عرفاں کر دے

تجھے واسطہ دینِ احمدؐ کا یارب
کہ جوہر کو آگاہِ ایماں کر دے

غزلیں

نہیں جاتی کسی کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
مثالِ آئینہ آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی

جوانی اب کہاں' لیکن وہی ذکرِ جوانی ہے
بہر صورت محبت کی پریشانی نہیں جاتی

یہ عالم ہو گیا ہے اللہ اللہ جوشِ وحشت میں
کہ اپنی شکل بھی اب مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

دلاسے دے رہے ہیں خود مجھے وہ جوشِ گریہ میں
مگر اب تک مرے اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی

توجہ ہو کبھی اے بادشاہِ حسن اس دل پر
تری درگاہ میں کیوں بات بھی مانی نہیں جاتی

سنوارا لاکھ لیکن برہمی کی شان باقی ہے　　تری زلفِ پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی
سناؤں کس طرح افسانۂ درد و الم جوہر
لبِ خاموش کی اعجاز سامانی نہیں جاتی

سرِ محفل غمِ فرقت سے اپنی آنکھ تر کیوں ہو　　ہمارے دل پہ جو گذری تمھیں اس کی خبر کیوں ہو
چلے آؤ مری آنکھوں میں تم پردہ نشیں ہو کر　　ہے رسوائی بہت آسان الفت میں مگر کیوں ہو
مکینِ خانۂ دل ہو مگر نظروں سے پنہاں ہو　　رگِ جاں میں نہاں ہو کر بھی مجھ سے بے خبر کیوں ہو
نہیں ہوتا اثر اس سنگ دل پہ کیا قیامت ہے　　مری ہر آہ یارب ایک آہِ بے اثر کیوں ہو
یہ دردِ دل حقیقت میں وہی دل کا عطیہ ہے　　مجھے یارب جہاں میں شکوۂ دردِ جگر کیوں ہو
سنائیں گے تمھیں شب بھر کہانی دردِ پنہاں کی　　ہماری داستانِ درد آخر مختصر کیوں ہو
کوئی آواز دیتا ہے یہی اب روز و شب جوہر
نمودِ صبحِ پیری ہے تم اب تک بے خبر کیوں ہو

بہاریں جھومتی ہیں ہر قدم پر حسنِ جاناں سے　　یہ کون آتا ہے یارب موسمِ گل میں گلستاں سے
قدم بے ساختہ اٹھتے ہیں میرے جانبِ صحرا　　مجھے کس نے صدا دی اے جنوں کوہ بیاباں سے
بہار آئی چمن میں لالہ و گل مسکراتے ہیں　　رہا کر دے مجھے صیّاد اب تو کنجِ زنداں سے
ڈبو دے ناخدا کشتی مری بحرِ محبت میں　　میں وہ بیزارِ ساحل ہوں کہ خوش ہوتا ہوں طوفاں سے
مری آنکھیں کھلیں دنیا میں یوں دیکھا جو دنیا کو　　کہ جیسے چونک اٹھے کوئی اک خوابِ پریشاں سے
کبھی تو رحمتِ حق لطف فرمائے گی اس دل پر　　نہ گھبرا اے دلِ مضطر ہجومِ یاس و حرماں سے
بظاہر وہ نگاہِ آرزو سے دور ہیں لیکن　　محبت کا یہ دعویٰ ہے کہ اقرب ہیں رگِ جاں سے
یہ معراجِ محبت ہے پس از مدت کہ اب وہ بھی　　اثر لیتے ہیں رہ رہ کر مرے حالِ پریشاں سے
مرے جذبات افسردہ ہیں جوہر کیا سخن گوئی
کبھی کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا، شوقِ فراواں سے

جوانی

صحنِ چمن سے فصلِ سہانی گذر گئی
افسوس ہے کہ شامِ جوانی گذر گئی

وہ دن کہ جب تھے دل میں محبت کے ولولے
لالہ رخوں سے عیش و مسرت کے مشغلے

وہ عہد جب جوان تھی میری نگاہِ شوق
وہ عہد جب کہ حسن تھا پشت و پناہِ شوق

وہ عہد جب کہ میری طبیعت جوان تھی
عہدِ شباب تھا کہ محبت جوان تھی

امید کے چمن میں نرالی بہار تھی
مے سے بھے وہ زندگی بھی بہت زرنگار تھی

راتوں کو حسن و عشق کی محفل کی رونقیں
کیا چیز تھی خدا کی قسم دل کی رونقیں

وہ مہ جبیں وہ لالہ رخ و گلعذار دوست
کیا گلشنِ شباب میں تھے پُر بہار دوست

ہے ہے مرا شباب تھا اک عہدِ بے ثبات
اب سوگوارِ عہدِ جوانی ہے بس حیات

جوہر وہ دل کی نغمہ فشانی کہاں گئی
یا رب مری وہ فصلِ جوانی کہاں گئی

بسنت

بسنت آ رہی ہے نرالی ادا سے
مہکتی ہے پھولوں کی خوشبو ہوا سے

چمن میں نیا ساز و ساماں ہوا ہے
عجب رنگِ صحنِ گلستاں ہوا ہے

شمیمِ گلِ تر مزا دے رہی ہے
پیامِ محبت ہوا دے رہی ہے

وہ بلبل کا ہنگامۂ نغمہ خوانی
وہ پھولوں کی دلکش و رنگیں جوانی

نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں چمن میں
چمن کیا کہ آئی بہار آج بن میں

حسینانِ عالم کی دھج ہے بسنتی
کہیں رائے بیل اور کہیں لاجونتی

کوئی زعفرانی، کوئی ارغوانی
کوئی بر میں پہنے ہے پوشاک دھانی

غرض یہ زمانہ ہے حسن و ادا کا
نمونہ ہے گلشن میں لطفِ خدا کا

مگر آہ جوہر یہ جشنِ بہاراں
یہ عیش و طرب کے نئے ساز و ساماں

مرے دل کو رہ رہ کے برما رہے ہیں
وہ گذرے ہوئے وقت یاد آرہے ہیں

کہ جب نوجوانی کا تھا عہدِ رنگیں
جمالِ حسیناں سے ہوتی تھی تسکیں

بہاروں پہ جب آرزو کا چمن تھا
شگفتہ غرض رنگ و بو کا چمن تھا

عجب روز و شب تھے عجب روز و شب تھے
کہ سب لطف حاصل ہمیں بے طلب تھے

وہ رنگین لمحے، وہ رنگین راتیں
وہ پر لطف صحبت وہ دل چسپ باتیں

وہ آئی ہوئی جوش پر نوجوانی
عجب دلکشی تھی، عجب زندگانی

مگر اب تو جوہر خزاں ہے چمن میں
وہ لطفِ بہاراں کہاں ہے چمن میں

ترانہ برسات

دکھایا ہے فطرت نے اپنا جمال
زہے موسمِ دلکشِ برشگال

وہ دلکش گھٹائیں، وہ موسم کا رنگ
لبوں پر تبسم، دلوں میں امنگ

اٹھا ابر تیرہ، ہوا چل پڑی
جدھر دیکھئے ایک ہلچل پڑی

وہ ٹھنڈی ہوائیں وہ دلکش پھوار
کہ سب دھل گیا دل کا گرد و غبار

حسینانِ عالم نے بدلا لباس
بجھائی ہے نظروں نے الفت کی پیاس

عجب دلکشی ہے عجب دلکشی
جنوں خیز ہے فصلِ برسات کی

مجھے یاد آتا ہے عہدِ شباب
کہ جب تھی مری آرزو کامیاب

مگر اب وہ محفل، وہ منظر کہاں
وہ منظر بھی ہو تو وہ جوہر کہاں

خوشی کی کسی بات سے کیا غرض
مجھے عہدِ برسات سے کیا غرض

ترانۂ برشگال

دل سے رہ رہ کر نکلتی ہے دعائے برشگال
کس قدر ہنگامہ پرور ہے ہوائے برشگال

ابر و باراں کی دل آویزی کا عالم کیا کہیں ۔۔۔ دیدۂ گوہر فشاں ہے یا فضائے برشگال
آج ہر دل میں ہے سیلِ شوق و طوفانِ نشاط ۔۔۔ ہر زباں پر ہے صدائے دلربائے برشگال
وہ تقاطر، وہ ترشح، وہ تلاطم، وہ تپش ۔۔۔ جاذبِ دل ہے بہر صورت ادائے برشگال
مستی و کیف و طرب سرشاری و ذوق و نشاط ۔۔۔ اہلِ عالم کو ہے انعام ہوائے برشگال
سبزۂ گلزار کی نزہت ہے پیغامِ شباب ۔۔۔ حسن و جلوہ کا مرقع ہے فضائے برشگال
آئینہ ہے تیری رحمت کا یہ فصلِ درفشاں ۔۔۔ کردگارِ لالہ و گل اے خدائے برشگال

چھیڑتا ہے جب کوئی جوہر فسانہ عیش کا،
میرے ہونٹوں سے نکل جاتا ہے ہائے برشگال

قحطِ بنگال

آہ اے بنگال اے قحط و مصائب کے نشانہ ۔۔۔ آج تو ہے قحط کے ہاتھوں سے کتنا دلفگار
بھوک و افلاس کا ہے آج دورہ ہر طرف ۔۔۔ کر رہے ہیں بے نوا محتاج دورہ ہر طرف
وہ زمینیں جو کبھی سرسبز اور شاداب تھیں ۔۔۔ وہ زمینیں آہ جو زرخیز اور سیراب تھیں
آج وہ ویران و غیر آباد آتی ہیں نظر ۔۔۔ صوبۂ بنگال میں فاقہ کشی ہے کس قدر
چشمِ عبرت دیکھ، یہ عبرت کے ہنگامے بھی دیکھ ۔۔۔ عیش و عشرت دیکھ کر آفت کے ہنگامے بھی دیکھ
فاقہ کش بچے تڑپتے ہیں، غذا ملتی نہیں ۔۔۔ اور مریضوں کو کسی صورت دوا ملتی نہیں
رزق ہے معدوم، ارزاں موت اور آلام ہیں ۔۔۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو پیروِ اسلام ہیں
اے مسلماں! اٹھ خدا کے واسطے امداد کو ۔۔۔ سن ذرا بنگال کی درد آفریں فریاد کو
آ رہی ہیں موت کی خبریں مضافات اور شہر سے ۔۔۔ ڈر خدا کے واسطے اس آسمانی قہر سے
فاقہ کش بنگال کی امداد ہے فرضِ گراں ۔۔۔ اپنے قومی فرض سے غافل نہ ہوں پیر و جواں

جوہر اب اللہ سے فریاد کرنی چاہیے
فاقہ کش بنگال کی امداد کرنی چاہیے

وہ عربی خط جو چین میں استعمال کیا گیا۔ اس کی اہم بات یہ ہے کہ لکھنے کے لیے قلم کی بجائے برش
استعمال کیا گیا ہے جو کہ پرانا چینی طریقہ ہے۔ یہ فن ہے کہ چینی خوش نویس مصحف شریف بھی برش سے لکھتے ہیں

بیگم وحید رجمیل رضوی

حیدر علی رضوی

حیدر علی یکم اگست ۱۹۱۷ء کو پون بجے شب پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مولوی ظفر حسین امروہوی اور آل حسن مرادآبادی سے حاصل کی۔ خطاطی میں منشی دوارکا پرشاد، حشمت علی افضلی اور جناب قمر مرادآبادی سے استفادہ کیا۔ چونکہ یہ سب حضرات اپنے ہنر میں یکتا اور مخبر عالم کی کتابت سے وابستہ رہے تھے۔ ہیوٹ مسلم ہائی اسکول اور گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد سے تکمیل تعلیم کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ انہوں نے ابتداً خاندانی روایت کو قائم رکھنے کے لئے شاعری بھی کی اور جمیل تخلص منتخب کیا لیکن "نام قاضی سید حیدر علی رضوی جمیل" کی یہ طوالت انہیں شاید پسند نہیں آئی اور مختصراً اپنا نام حیدر جمیل رضوی رکھ لیا اور اب اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۴۳ء کو قاضی عبد العلی صاحب عابد کی رحلت کے بعد ان کے والد قاضی عابد علی صاحب جوہر کو اخباری تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ان کی ضرورت محسوس ہوئی اور ایم اے اور قانون کی ڈگری مکمل نہ کر سکے اور علی گڑھ سے واپسی کے بعد مخبر عالم کے سب ایڈیٹر کے طور پہ کام شروع کر دیا اور پھر سیاست میں بھی پڑ گئے جس کے نتیجہ میں ضلع مرادآباد مسلم لیگ کے وائس پریسیڈنٹ اور وہیں سے منتخب ہو کر صوبائی مسلم لیگ کونسل یوپی کے رکن اور صوبہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر چنے گئے۔ نواب اسمٰعیل خاں صدر صوبہ مسلم لیگ اور صاحبزادہ محمود علی خاں صدر روہیل کھنڈ مسلم لیگ کو جمیل صاحب کی معاملہ فہمی اور تدبر پر اتنا اعتماد تھا کہ جین گنج مسلم لیگ کانپور اور امروہہ مسلم لیگ کی گروہ بندیوں کے سدباب کے لئے انہیں مقرر کیا۔ چنانچہ کانپور میں زاہد حسین صاحب اور ان کے مدمقابل گروہ اور امروہہ میں سید معز حسین نقوی اور فاروقی صاحب کی کشمکش کو دور کرا کے صدران مذکورہ کے اعتماد پہ پورے اترے۔ ادھر خود مرادآباد مسلم لیگ

میں ایک خلفشار برپا تھا لہٰذا صوبائی مسلم لیگ نے انھیں شہری مسلم لیگ کو ختم کر کے اس کا کنوینر مقرر کیا تاکہ یہاں کے حالات بھی سدھر سکیں لیکن ابتدائی جدوجہد کے درمیان ہی ملک کی تقسیم کا مرحلہ آ گیا اور جمیل صاحب کو ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کے منعقدہ تاریخی اجلاس مسلم لیگ میں شرکت کرنے کے لیے کراچی جانا پڑا۔ اس اجلاس میں تو آل انڈیا مسلم لیگ اس طرح تقسیم ہو گئی کہ مدراس کے محمد اسمٰعیل صاحب تو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ہو گئے اور تجویز ہوا کہ پاکستان مسلم لیگ کا ایک نیا کانسٹی ٹیوشن مرتب ہو تاکہ یہاں پاکستان مسلم لیگ قائم ہو سکے اور اس کارگذاری کی تکمیل کے لیے سردار عبدالرب نشتر کو کنوینر مقرر کر دیا گیا جب پاکستان مسلم لیگ کے لئے مجوزہ قانون مرتب ہو گیا تو اس کا پہلا اجلاس فریئر ہال کراچی میں قائداعظم کی زیر صدارت فروری ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوا جس میں نام ہی کی تبدیلی کے لئے جمیل صاحب نے ایک ریزولیوشن پیش کیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اب مسلم لیگ نے اپنا مدعا حاصل کر لیا ہے اس لئے کانگریس حکومت کو اس طرح بے دست وپا کر دیا جائے کہ کسی آئندہ شکایت کا ہر دروازہ بند ہو جائے اور ہند و پاکستان میں ایک متفقہ سیاسی نظریہ کے تحت حکومتی کاروبار چلتے رہیں اور ان دونوں ممالک میں اقلیتوں کو مکمل تحفظ حاصل ہو جائے ان کا ریزولیوشن یہ تھا کہ اس سیاسی جماعت کا نام "پاکستان مسلم لیگ" کی بجائے "پاکستان نیشنل لیگ" رکھا جائے اور چونکہ پاکستان میں مسلمان اسی طرح اکثریت میں ہیں جس طرح ہندو قوم ہندوستان میں، لہٰذا تقسیم ہند سے قبل قومیت کے نظریہ کے ماتحت کانگریس جس قانون اور نظریہ کے تحت اپنے سیاسی ادارہ کو چلاتی تھی وہی تمام کے تمام یا ایسے اصول اور ضوابط کو اپنا لیا جائے جس سے نکتہ چینی کا موقع ختم ہو جائے اور اس طرح ہندوستان کے مسلمان کسی منتقمانہ جذبہ کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔

اس ریزولیوشن پر بڑی لے دے ہوئی اور آخرکار اس کو ایک قلیل اکثریت کی بنا پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اگر جمیل صاحب کا یہ ریزولیوشن منظور ہو جاتا تو عین ممکن تھا کہ دونوں ممالک کے تعلقات آفرینش تا ایں دم اتنے کشیدہ نہ رہتے جیسے کہ آج تک ہیں اور کم از کم ان دونوں ملکوں کی اقلیت کو بڑی حد تک اس صبر آزما اور منتقمانہ ردّ

عمل سے نجات مل جاتی جس کا وہ آج تک گو پاکستان میں کم لیکن ہندوستان میں شکار رہی ہیں۔
جمیل صاحب اس اجلاس کے بعد ہندوستان واپس ہونے کی بجائے پاکستان ہی کے ہو رہے
اور وہ سیاست سے دست کش ہو کر مارچ ۱۹۴۸ء سے مئی ۱۹۵۳ء تک پاکستان ٹائمز
لاہور، امروز لاہور و کراچی، پاکستان آبزرور، ڈھاکہ اور محمد علی بوگرہ کے بنگالی روزنامہ
انصاف ڈھاکہ کے شعبہ اشتہارات کے کراچی نمائندہ کے طور پر کام کرتے رہے اور بالآخر انہوں
نے اس کام کو چھوڑ کر پرنٹ آرٹس لمیٹڈ کے نام سے اپنے پرنٹنگ پریس کی بنیاد رکھی جو ہر نوع
کی طباعت کے سلسلہ میں ایک نام آور ادارہ شمار ہوتا ہے۔

اپنی زندگی میں مجھے بے شمار اور مختلف طبقوں کی خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن
بیگم جمیل رضوی جیسی نیک طینت، نیک خصلت اور نیک طبیعت خواتین کم ہی میری نظر سے
گزریں۔ بیگم جمیل رضوی کا نام ثروت جہاں ہے اور وہ سہارنپور کے معروف انصاری خاندان کے
فرد خواجہ محمد حسنین انصاری الیکٹریکل انجینئر کی صاحبزادی ہیں۔ تعلیم و بلندیٔ اخلاق اور تربیت
نفس اس خاندان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ انصاریوں کا یہ کنبہ پانی پت اور سہارنپور میں آباد
تھا اور اب تقسیم ملک کے بعد بکھر گیا ہے۔ اسی خاندان سے مولانا الطاف حسین حالی جیسے عظیم
لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے خواب غفلت کے متوالے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ بیگم جمیل رضوی
نے گوکل داس انٹر کالج مراد آباد سے انٹر پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
سے اس وقت بی۔ اے پاس کیا۔ جب شاید پچاس ہزار مسلم لڑکیوں میں ایک آدھ لڑکی ہی ہائی
اسکول پاس کیا کرتی ہوگی۔ اپنے زمانۂ گورنری میں بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے ایک بار
گوکل داس انٹر کالج مراد آباد کا دورہ کیا تو ان کو اسکول کی کارکردگی دکھانے کے سلسلہ میں وہاں
کی طالبات نے دیگر شعبوں میں اپنی کارگزاریاں پیش کرنے کے علاوہ بیت بازی اور بھجن بھی سنائے
بھجن گانے والی لڑکیوں میں سے انہوں نے اشارہ کر کے ایک لڑکی کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ
اب صرف تم گاؤ۔ چنانچہ اس نے ایسا کیا جس سے بلبلِ ہند اتنی محظوظ و مسرور ہوئیں کہ اپنے
اے ڈی سی کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا اور اس دوران اس لڑکی کی تعریف و توصیف کے
بعد دوسری ہندو لڑکیوں کو اس لڑکی کے ترنم اور ہندی زبان کے الفاظ کی صحتِ تلفظ کی طرف

متوجہ کرتے ہوئے نصیحت کی کہ وہ اس کی تقلید کریں ۔ اور یہ لڑکی ثروت جہاں تھیں جن کو انہوں نے ایک سلور کپ عطا کر کے حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا رشتہ استوار ہوا اور پھر یہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلی آئیں۔

رضوی صاحب اپنی ابتداً اخبارات سے وابستگی اور پھر اپنے ذاتی پریس کی بنیاد کے بعد اس کی ترقی اور کامیابی کے لئے ایک مسلسل جدو جہد میں اتنے مشغول رہے کہ اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیمی نگہداشت پر وہ توجہ نہ دے سکے جو انہیں دینا چاہیئے تھی اس لئے خانہ داری کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بیگم رضوی نے یہ کام بھی ایسی توجہ اور انہماک سے انجام دیا کہ آج تک تینوں بیٹے فاران حیدر، رضوان حیدر اور کامران حیدر اور بیٹیاں فوزیہ، یاسمین اور عنبرین مثالی اولاد کے زمرے میں آتے ہیں یہ بچے بڑے مؤدب، فرمانبردار اور دین سے وابستگی رکھتے ہیں اور یہ سب بیگم رضوی کی توجہ کا ثمرہ ہے۔

اب یہی بھیجن گاکر انعام پانے والی ثروت جہاں دنیاوی عزت و احترام کے ساتھ ساتھ فرائض و ارکانِ دین کی انجام دہی میں ایسی مستغرق ہیں کہ نماز عشاء کے بعد بلاناغہ قرآن کریم کی تلاوت اور اوراد و وظائف میں تا نمازِ فجر مشغول رہ کر کہیں کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتی ہیں۔

امداد صابری

حوالہ جات

سفرنامہ	مؤلفہ برنیر	بیاض استاد چچا رشید مراد آبادی	
خم خانۂ جاوید	مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی	تواریخ الحامد	
خم خانۂ جاوید	مؤلفہ قاضی جمشید علی جم	قصائد مدحیہ نظامیہ	
تاج التواریخ	مؤلفہ مولوی نصرت علی دہلوی	تاریخ صحافتِ اردو	مؤلفہ امداد صابری
سخن الشعراء	مؤلفہ عبدالغفور نساخ	روحِ صحافت	״
انوار العاشقین	مؤلفہ عاشق علی	اردو کے اخبار نویس	״
تلامذۂ غالب	مؤلفہ مالک رام	۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء	״
میرے زمانہ کی دلّی	مؤلفہ ملّا واحدی دہلوی	شہیدانِ وطن ضلع مراد آباد	״
اخبار نویسوں کے حالات	مؤلفہ منشی محمد دین فوق کشمیری	شہیدانِ آزادی	مرتبہ ترقی اردو بورڈ، دہلی
جام جم	مؤلفہ صوفی امبا پرشاد مراد آبادی	گلدستۂ سخن	مرتبہ قاضی عبدالعلی عابد مراد آبادی
تذکرۂ شعرائے جے پور	مؤلفہ احترام الدین	رسالہ "مزدا" امرتسر	دسمبر ۱۹۰۵ء
موزدرویشی عنی دُرِ نجف	مؤلفہ قاضی خورشید علی	اخبار "مخبرِ عالم" مراد آباد	۸ر جنوری ۱۹۰۷ء
کلیدِ جعفر	مؤلفہ شیخ محمد مظفر حسین	اخبار "آزاد"، لاہور	۱۳ر اپریل ۱۹۰۷ء
مختصر سوانح عمری قاضی عبدالعلی عابد		رسالہ "زبان"، دہلی	اپریل ۱۹۰۸ء
اختر شہنشاہی		اخبار "ذوالقرنین" بدایوں	۸ر فروری ۱۹۰۹ء
کرزن گزٹ، دہلی	۱۳ر نومبر ۱۹۰۹ء		

A 215.
THE MUKH BIR-I-ALAM

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونْ ۔ ترکی میں تیرھویں صدی ہجری میں لکھا ہوا کوفی خطاطی کا کتبہ تزئین کا پہلو نمایاں ہے ۔